جھیل اور کنول

اے حمید

جھیل اور کنول

اے حمید

مقبول اکیڈمی

۱۰- دیال سنگھ مینشن، شاہراہ قائداعظم لاہور

جملہ حقوق محفوظ

۱۹۸۹ء

اہتمام ——— ملک مقبول احمد

مطبع ——— معراج پریس، لاہور

مقبول اکیڈمی لاہور

کوڈ نمبر

مجلّد ISBN 969 442 311 2

غیر مجلّد ISBN 969 442 312 0

انتساب

خواجہ احسن پال کے نام

جو مجھے جھیل میں کھِلے ہوئے کنول کی یاد دلاتا ہے

۱

رنگون جانے والا جہاز۔ کلکتے کی خضر پور جیٹی پر تیار کھڑا تھا۔
پہلے اور دوسرے درجے کے مسافر جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ تیسرے درجے کے مسافر لکڑی کے جنگلوں میں قطاریں باندھے کھڑے تھے۔ ان قطاروں میں ہر قوم کے آدمی تھے۔ بنگالی، سندھی، گجراتی، مارواڑی، مدراسی، پنجابی، سورتی، میمن، چٹاگامی، بہاری مرہٹی ـــــ ہندوستان کی ساری بولیاں وہاں جمع تھیں۔ یوپی کے کالی چمڑی اور پیازی آنکھوں والے چماروں اور گھسیاروں کا ٹولہ بندرگاہ کے چھتے ہوئے صحن میں داخل ہوا۔ عورتیں جامنی اور کتھئی رنگ کی میلی کچیلی ساریوں میں ملبوس تھیں ہر عورت کے ہاتھ میں ایک آدھ گٹھڑی تھی اور کندھے سے بچہ لگا تھا۔ مردوں نے سروں پر صندوق اٹھا رکھے تھے۔ اور وہ بدحواسی کے عالم میں اپنی عورتوں کو پکار رہے تھے۔ ایک بنگالی سپاہی جلدی سے ان کی طرف بڑھا اور ڈنڈے والا ہاتھ پھیلا کر بولا

"اے ادھر کیا چلا آتا ہے! ادا باجو ـــــ ادا باجو"

تیسرے درجے کے مسافروں نے اپنا اپنا سامان کھول رکھا تھا۔ کسٹم آفیسر ہر مسافر کے پاس رک کر ایک ایک شے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا۔ کانسی کے کٹوروں میں ڈنڈا ڈال کر انہیں ٹنکاتا، بڑے بڑے بستر کھلوا کر چادریں، دریاں، سرہانے، کھیس، ہر شے کی چھان پھٹک کرتا، اور پھر صندوقوں، کنستروں اور بستروں پر کھریا مٹی سے اپنے

دستخط کر کے دوسرے مسافر کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ کسٹم آفیسر کوئی مرہٹہ تھا۔ اس کا رنگ سانولا، جسم گٹھا ہوا اور گردن موٹی تھی۔ ہونٹوں پر مونچھوں نے چھجا ڈال رکھا تھا۔ اس کے سر پر ریلوے گارڈ ایسی سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی۔ اور وہ کرخت آواز میں نتھنے پھلا کر بات کرتا تھا۔ ایک مسافر کے آگے صرف چمڑے کا سوٹ کیس ہی پڑا تھا۔ سوٹ کیس پر سفیدے سے لکھا تھا۔

' انور علی ـــــ پنجاب،

کسٹم آفیسر نے شربتی رنگ کی آنکھیں اٹھا کر مسافر کو دیکھا۔ اکہرا بدن، درمیانہ قد ہلکی زرد بغیر آستینوں کے قمیض، میلی سی خاکی پتلون، پاؤں میں چپل کندھے پر ٹھنڈا کوٹ، سر سے ننگا۔ سیاہ لہریالے بال، چہرے کا رنگ زردی مائل۔

انور علی ـــــ پنجاب

"تو مارا اور سامان کِدر ہے بابو"؟

"آمارا اور سامان نہیں ہے"۔

"ہوں ں ں ..... جمعدار بکسا کھولو"۔

اور جمعدار نے سوٹ کیس کھول کر چیزیں باہر رکھنا شروع کر دیں۔

ایک فوجی کمبل، پشاوری چپل، دو سفید کرتے، ایک پاجامہ، ایک پتلون، حجامت کا سامان، لائف بوائے صابن کی ٹکیاں، لیموں کے اچار کا ڈبہ۔ ایک انگریزی کتاب سمندری کہانیاں، پاسنگ شو سگریٹوں کی دو ڈبیاں، قلم دوات، خط لکھنے کا پیڈ، سلولائیڈ کا سرخ لگ اور سب سے نیچے فلم بندھن، کا پلاٹ اور گانے چل چل رے نوجوان۔۔

کسٹم آفیسر سوٹ کیس پر دستخط کرنے لگا۔

"بستر کے بنا جائے گا ـــ ہوں ں ں ـــ بہادر لوگ ہے"۔

انور کندھے پر کوٹ درست کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔ جب کسٹم آفیسر اور جمعدار آگے نکل گئے تو اس نے بکھری ہوئی انٹ شنٹ چیزوں کو بکس میں ڈالا اور اسے بند کر کے اپنے ساتھ والے سے سگریٹ کے لیے دیا سلائی مانگنے لگا۔

"تا چس نا ہیں بابو" مارواڑی سیٹھ نے بدنما دانت نکالتے ہوئے کہا۔

انور نے سگریٹ کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور بغلوں میں ہاتھ دے کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کسٹم آفیسر ایک پھولی ہوئی توند والے بھاری بھرکم سکھ کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا۔ سردار صاحب کی خاکی پگڑی نے ان کے کان اور پیشانی چھپا رکھی تھی۔ آدھا چہرہ داڑھی مونچھ کے گنجان بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور خاکی کوٹ، سفید شلوار اور سرخ قمیض میں ملبوس وہ پالا مار کر آئے ہوئے مرغ کی طرح سینہ پھلائے کھڑے تھے۔ کسٹم آفیسر کو ایک باتصویر کتاب کی ورق گردانی کرتے دیکھ کر سردار صاحب مسکراتے ہوئے، داڑھی میں پھولی ہوئی انگلیاں پھیرنے لگے۔

کسٹم آفیسر بولا۔

"یہ تمہاری کتاب ہے سردار صاحب؟"

"ہاں جی ـــ یہ میری جدوجہد ہے۔ یعنی ہٹلر کی سوانح عمری"۔

سردار صاحب اپنے ساتھیوں کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بچوں کی طرح ہنسنے لگے۔

ہوں ں ں ـــ سردار صاحب تمہارے کو مالم ہے۔ جنگ شروع ہو گیا ہے اور تم دشمن کی تقریریں پڑھتا ہے۔ یہ کتاب ہم "کنڈم" کرتا ہے"۔

سردار صاحب اب بھی بچوں طرح مسکرا رہے تھے۔

کوئی بات نہیں کسٹم صاحب! ہم گورو جی کی بانی پڑھ لیں گے۔ ایک ہی بات ہے"۔

اور وہ جھک کر سامان سمیٹنے لگے۔

جب تمام مسافروں کے صندوقوں، بستروں، گٹھڑیوں، کنستروں اور برتنوں وغیرہ کی تلاشی لی جا چکی تو ٹوٹی کٹری معائنہ شروع ہوا۔ ایک مریل سا کمزور ڈاکٹر اپنے عملے سمیت آن حاضر ہوا۔ وہ ہر مسافر کی آنکھوں میں جھک کر دیکھتا۔ قمیض اتروا کر پسلیاں بجاتا۔ پیٹ میں ہاتھ کی آدھی انگلیاں گھسیڑ دیتا۔ اور طوطے کی طرح رٹے ہوئے جملے دہرانے لگتا۔

"منہ کھولو.... اور... اور"

"باجو اوپر کرو..... اور...."

"کھانسو..... زور سے.... اور زور سے"

"سینہ پھلاؤ..... اور.... اور"

"پہلے جہاز میں بیٹھا ہے؟"

"چکر وکر تو نہیں آتا ہے؟"

"ہوں ..... ٹھیک ہے"

ٹیکے والی سوئی ذرا سی چبھونے کے بعد وہ پسلیوں پر کھریا مٹی سے اپنے دستخط کرتا اور دوسرے مسافر کی آنکھوں پر جھک جاتا۔

تین گھنٹوں کی دردسری کے بعد جیٹی والا بڑا دروازہ کھول دیا گیا اور تیسرے درجے کے مسافر سامان کے بقچے اور گٹھڑیاں اٹھائے وہاں سے گزرنے لگے سب سے پہلے جہاز کا نچلا حصہ مسافروں سے بھرا جانے لگا۔ پہلے اور دوسرے درجے کے مسافر عرشے والے کیبنوں کے باہر آرام کرسیوں پر لیٹے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے۔ کئی ایک رنگ برنگ ساریوں والی عورتیں اور خوش پوش مرد "ڈیک" کے جنگلے پر جھکے تیسرے درجے کے مسافروں کو ڈری ہوئی بھیڑ بکریوں کی مانند جہاز کے زیریں حصے میں گھستے دیکھ رہے تھے۔ درمیانی منزل کے کیبنوں کے دروازے کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے اور پھولی ہوئی سفید ٹوپیوں والے سٹیوارڈ برتن اٹھائے ادھر اُدھر حرکت کر رہے تھے۔ چند ایک یورپین لڑکیاں جنگلے کے پاس کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی جنگلے سے پشت لگائے ہوئے تھی اور اس کے سرخ بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ یوپی کی چارنیاں کبھی بچے سنبھال رہی تھیں تو کبھی گٹھڑیاں۔ ان کے آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر یونہی شور مچا رہے تھے۔ ہانپتے ہوئے بنگالی، مدراسی اور چٹ گامی قلی پسینے میں شرابور تھے اور ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ سامان سے لدی ہوئی ٹرالیاں جہاز کے ساتھ آن لگتیں اور دیکھتے دیکھتے سارا سامان حیرت انگیز پھرتی سے اندر پھینک دیا

جاتا۔ جب نچلا حصہ مسافروں سے بھر گیا اور وہاں کھڑے رہنے کو بھی جگہ نہ رہی تو جہاز کے اوپر والے حصے پر سیڑھی لگا دی گئی اور مسافروں کا جلوس اوپر چڑھنے لگا۔ مسافروں کی دھکم پیل میں انور نے سیڑھیاں طے کرتے ہوئے جہاز کا نام پڑھا۔ سرخ روغن پر موٹے اور بھدے انگریزی حروف میں "SHANGHAI" لکھا تھا۔ جہاز کے نچلے حصے کے سوراخوں میں سے جا بجا پانی کی چھوٹی موٹی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ ڈیک یعنی عرشے پر پہنچ کر وہ جہاز کے پرلی طرف نکل گیا۔ لنگر ڈالنے والی مشین کے ذرا پرے۔ رسوں اور لوہے کے بکھرے ہوئے موٹے تاروں سے ہٹ کر اپنا سوٹ کیس لکڑی کے فرش پر رکھا اور جنگلے کے ساتھ ٹیک لگا کر اس پر بیٹھ گیا۔ کوٹ کی جیب سے مڑا ہوا سگریٹ نکال کر اسے ایک گھسیارے کی بیڑی سے سلگایا اور اطمینان سے پینے لگا۔

مئی، جون کے دن تھے۔ کلکتے میں برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ صبح سے بارش نہ ہوئی تھی۔ لیکن آسمان بھورے بھورے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ جہاز کی چمنی کے ساتھ لگی چھوٹی سی نلکی مدھم شور کے ساتھ دودھیا۔ بھاپ خارج کر رہی تھی لمبے رخ جہاز کا نصف بہتر پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کی تحویل میں تھا نچلی منزل میں کہیں کوئی مشین چل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے لکڑی کے فرش اور جنگلے میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہو رہی تھی۔ سامنے سبز رنگ کے کیبن کے باہر دو تین آفیسر سفید وردیوں میں ملبوس۔ بید کی کرسیوں پر بیٹھے سگار وغیرہ پی رہے تھے۔ جہاز کے چینی خلاصی خالی نیکریں پہنے لجلجے جسم ڈھلکاتے ایک دوسرے سے مذاق کرتے عرشے پر ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ اور کبھی ترپالیں ٹھیک کر رہے تھے تو کبھی رسّے ایک جگہ سے دوسری جگہ کھینچ رہے تھے۔ ایک چینی آفیسر سب سے اوپر والے کیبن کے باہر دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے یوں کھڑا تھا۔ گویا اپنا توازن برقرار رکھنے کی فکر میں ہے آن کی آن میں تقریباً عرشے کا سارا نصف حصہ بھر گیا۔ لوگوں نے بستر بچھا لیے۔ سامان سرہانے کی طرف قرینے سے لگا دیا۔ بعض مرد جنگلے کے قریب ہو کر منہ ہاتھ دھونے لگے اور بعضوں نے صندوق سے تاش نکال کر پھینٹنا شروع کر دیا۔ انور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے مزے سے سگریٹ پیتا رہا۔

عرشے پر "میری جدوجہد" والے بھاری بھرکم سردار صاحب نمودار ہوئے انہوں نے نچلی منزل کے ہوادانوں کے پاس ایک خالی جگہ اپنے لیے منتخب کرلی۔ ان کے ساتھ بے پناہ سامان تھا۔ انہوں نے اپنی بندوق ایک طرف رکھ کر قلی کی مدد سے پہلے بستر بچھایا اور پھر گھوم کر سارا سامان لگوادیا۔ قلیوں کو پیسے دیتے وقت وہ پھر بچوں کی طرح ہنسنے لگے۔

"کہو یار آٹھ آنے فی کس کیسے رہیں گے؟"

قلی بھی ہنسنے لگے۔ سردار صاحب نے لمبا چوڑا بٹوہ کھول کر اس میں پورا ہاتھ گھسیڑ دیا۔ پھر ہاتھ کھینچ کر قلیوں کی ہتھیلیوں پر ایک ایک روپیہ رکھ دیا۔ قلی بڑبڑاتے ہوئے پیسے تھام واپس چلے گئے۔

"آخر گورنمنٹ ان کے ریٹ کیوں نہیں مقرر کرتی۔ جرمنی میں ہر شے کا ایک ریٹ ہوتا ہے۔ کیوں جی، آپ نے "میری جدوجہد" پڑھی ہے؟"

"نائیں سردار صاحب"

سردار صاحب کے ساتھ والے بستر پر لیٹے ہوئے مارواڑی سیٹھ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سردار صاحب بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنی پگڑی دونوں ہاتھوں کی مدد سے اتار کر صندوقوں کے درمیان کہیں ٹکادی۔ کنگھے سے کالے اور سفید بالوں کو مرتب کیا۔ پھر کوٹ اتار کر تہہ کر کے سرہانے کے نیچے رکھا۔ داڑھی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ عینک رومال سے صاف کر کے پھر چڑھائی۔ اور جیب سے ملاپ اخبار نکال کر مطالعہ کرنے لگے۔ مارواڑی سیٹھ نے میلے دانت نکال کر پوچھا۔

"سالا جنگ ابھی کدھر تک آگیا ہے سردار جی؟"

سردار صاحب اخبار پر نظریں جمائے بولے۔

"سالا جنگ چلا آرہا ہے۔ گورمکھو! اس کو کون روکے؟ ایں؟"

مارواڑی سیٹھ کا بھدا ہاتھ اپنی توند پر رک گیا۔ اس نے سرد آہ بھری۔

"مگر میرا مال کیوں روک دیا ہے؟"

سردار صاحب نے سیٹھ کی بات پر دھیان نہ دیا۔ اور اخبار پڑھتے ہوئے اپنے آپ بڑبڑانے لگے۔

"سچے بادشاہ کرنیلو کی ماں کو مت دے۔ کیوں گھر کا راج الٹ رہی ہے — ہے وا ہے گورو!"

اچانک جہاز نے زور سے سیٹی دی اور لوگوں میں خفیف سی ہلچل کی لہر دوڑ گئی۔ سب سے اوپر والے کیبن میں الارم سا بجنے لگا۔ چینی ملاح ادھر سے ادھر دوڑ کر بکھرے ہوئے رسے سمیٹنے لگے۔ تین آدمی لنگر پھینکنے والی مشین کے پاس آن کھڑے ہوئے اور جھک کر ان کے کل پرزے دیکھنے لگے۔

جہاز دوسری مرتبہ چیخا تو لنگر پھینکنے والی مشین ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ چلنے لگی۔ جیٹی کی طرف چینی ملاح جنگلے پر جھک گئے اور مشین ایسی پھرتی کے ساتھ رسے اوپر کھینچنے لگے۔ انور کو ڈیک کے فرش کے نیچے ایک اور مشین چلنے کی ہلکی ہلکی مگر مسلسل آواز محسوس ہونے لگی اسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جہاز کا انجن اسٹارٹ ہوچکا تھا۔ لنگر پھینکنے والی مشین کے بڑے سے چرخ پر آہنی سنگل اپنے آپ لپٹا جارہا تھا جب دریا کی تہہ سے پورا لنگر اوپر اٹھ آیا تو مشین بند کردی گئی، اور خلاصیوں نے تمام رسے ایک جگہ اکٹھے کر دیئے۔ اب شنگھائی دریائے ہگلی میں چل نکلا تھا۔

خضر پور جیٹی کی لمبی بالکونی دھیرے دھیرے کسی واہمے کی مانند پیچھے سرک رہی تھی اور عورتیں مرد رومال ہلا ہلا کر اپنے پیاروں کو الوداع کہہ رہے تھے۔ نیچے سٹیم روم میں عجیب شور اٹھ رہا تھا۔ کبھی آلارم سا بجتا اور کوئی مشین گھرگھرگھرگھرکرنا شروع کردیتی۔ پھر الارم بجتا اور پھر گھرگھرگھر شروع ہوجاتی جہاز کی بلندیوں پر چینی جھنڈے کے ساتھ برطانیہ کا یونین جیک لہرادیا گیا۔ انجن کی ہلکی ہلکی آواز اب تیز ہوگئی تھی۔ انور سگریٹ پھینک کر اٹھا اور ڈیک کا چکر لگانے لگا سارا ڈیک مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ

حیران ہو رہا تھا کہ جنگ کے زمانے میں بھی لوگ گھر چین سے نہیں بیٹھے۔ کئی لوگ عرشے کی آہنی باڑھ سے لگے کھڑے جہاز کے بندرگاہ چھوڑنے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ شنگھائی، جیٹی پر ساٹھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے دریائے ہگلی کے پاٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور الوداع کہنے والوں کے چہرے دھندلانے شروع ہو گیے تھے۔ سردار صاحب جنگلے کے ساتھ لگے، اُن آبی جانوروں کی طرف اپنے ساتھ والوں کو متوجہ کرا رہے تھے جو دریا کی سطح پر غوطہ مار کر مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔

"انہیں شکار کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے مگر پتہ نہیں یہاں سالے بندوق چلانے دیتے ہیں یا نہیں؟"

لیکن سردار صاحب! جانور پکڑ میں کیوں کر آوے؟"

"یہ ضروری نہیں کہ شکار تھیلے میں ہی آجائے، شکار کا مطلب ہے۔ گولی کا ٹھیک نشانے پر جا لگنا۔ باقی سب منہ کی چاٹ ہے گورکھو! ـــــ جرمنی میں شکار اسی طرح کھیلا جاتا ہے ـــــ کیوں مسٹر تم نے" میری جدوجہد میں پڑھی ہے جرمنی کے بادشاہ کی سوانح عمری ہے، میرے پاس تھی پردہ سالا کسٹم والا ہضم کر گیا ـــــ"

کلکتہ کو پیچھے چھوڑ کر جہاز خضر پور گارڈنز کے قریب سے گزر رہا تھا۔

یہاں دریا کا پاٹ تنگ تھا اور فضا میں مچھلیوں کی بو تھی۔ ایک طرف خضر پور باغات کا سلسلہ تھا، جہاں سرو کے درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے اور دوسری جانب گھنے جنگلات تھے۔ ہگلی کے دلدلی کناروں پر مچھیروں نے بانس کی بلیاں لگا رکھی تھیں اور خود مچھوؤں میں کھڑے جال کھینچ رہے تھے۔ اور جہاز کو گزرتے بھی دیکھ رہے تھے ـــــ تیسرے پہر داہنی طرف کنارے کے جنگلات کا سلسلہ دور ہٹنے لگا۔ بائیں طرف بالٹا کمپنی کے کارخانوں کا طویل جال پھیلا ہوا تھا۔ لمبی لمبی چمنیوں میں سے دھواں نکل رہا تھا اور دور ایک شیڈ کے باہر کھڑے ٹرک میں کچھ لادا جا رہا تھا۔ شنگھائی یہاں سے بھی گزر گیا۔

انور کو بھوک لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے جہاز میں بے حد کم کھانے کا فیصلہ

کر رکھا تھا۔ پھر بھی وہ صبح سے چائے کی ایک پیالی پر تھا۔ اسے معلوم تھا جہاز میں چکر آیا کرتے ہیں اور زیادہ کھانے والے کی حالت زیادہ خراب ہوا کرتی ہے لیکن جہاز صبح سے ہمواری سے جا رہا تھا۔ اور اس کا جی بالکل برا نہ ہوا تھا۔ چنانچہ وہ دوسرے درجے کے غسل خانوں کے قریب سے ہو کر نچلی منزل والے تیسرے درجے میں اتر گیا۔ ابھی وہ پہلی سیڑھی پر ہی کھڑا تھا۔ کہ نیچے سے آتے ہوئے گرم گرم بھپارے نے اس کا استقبال کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جی خراب ہونے لگا ہے نچلی منزل سے جو گندی ہوا آ رہی تھی۔ اس میں جلے ہوئے پیازوں اور پھٹے ہوئے دودھ کی بو تھی۔ انور جی کڑا کر کے سیڑھیاں طے کر گیا۔ فضا ایک دم گرم ہو گئی۔ اور انور کے جسم پر چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اب وہ نچلی منزل کی ٹی شاپ کے آگے کھڑا تھا۔ دکان لکڑی کے اونچے سے چبوترے پر بنی تھی۔ چھت سے کیلوں کے زرد زرد گچھے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف پکوڑے تلے جا رہے تھے دوسری جانب بنگالی ملازم لڑکے حمام کی ٹونٹی میں سے مٹیالی چائے نکال رہے تھے اور کانسی کے کٹوروں میں ڈال کر مسافروں کو پیش کر رہے تھے۔ اس منزل کی چھت نیچی تھی اور تین چار جگہوں پر چوڑے چوڑے ہوادان منہ کھولے چھت سے ذرا نیچے لٹک رہے تھے۔ لکڑی کے گول گول ستونوں کے درمیان مسافر اپنے اپنے سامان کے آس پاس بستر لگائے ہوئے تھے۔ دو تین مدارسی گلے میں سفید دھاگا لٹکائے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اور کیلے کے چوڑے پتوں پر ڈالا ہوا دال بھات کھا رہے تھے۔ ذرا پرے میانوالی کے پنجابی سپاہیوں کا ٹولہ بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی اپنے ترشے ہوئے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہا تھا۔ دوسرا ڈھولک کس رہا تھا۔ تیسرا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا اور چوتھا چلم میں آگ سُلگا رہا تھا۔ پانچواں لکڑی کے چوکھٹے والا آئینہ سامنے رکھے مونچھوں کے زائد بال اکھیڑ رہا تھا۔ کونے کی طرف سے کسی بچے کے رونے اور کسی عورت کے چُپ کرانے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ انور نے چائے کا گلاس لیا اور اسے رومال سے تھام کر کھڑے کھڑے پینے لگا۔ چائے

میں سے ناریل کے دودھ کی بو آرہی تھی۔ ساتھ کھانے کے لیے سوائے پھولے ہوئے بدوضع کیک کے ایک ٹکڑے کے وہ اور کسی شے کا انتخاب نہ کرسکا۔ چائے پی کر اسی نے دیا سلائی اور پاسنگ شو کی آدھی ڈبی لی اور پسینے میں تربتر اوپر ڈیک پر آگیا دریا کی ٹھنڈی ہوا کے لگتے ہی اسے اپنے اندر نئی زندگی کا احساس ہوا۔ اور وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتا اپنی جگہ کی طرف چل پڑا۔ اس کا سوٹ کیس کسی نے اٹھایا نہ تھا۔ جوں جوں دن ڈوبتا گیا۔ جہاز پر خنکی ہونے لگی۔ ہوا زیادہ مرطوب ہو رہی تھی۔ شنگھائی دریائے ہگلی کے گہرے پانیوں پر رواں تھا۔ دریا کا پاٹ بیحد وسیع ہوگیا اور دونوں طرف کے کناروں کی اب سرسبز لکریں ہی نظر آرہی تھیں۔ جہاز کی سیدھ میں دریا کا پانی افق سے ٹکرا رہا تھا۔ انور نے کمبس میں سے کمبل نکالا اور اسے شانوں پر پھیلا کر چپکے سے بیٹھا رہا اور سگریٹ پیتا رہا۔ اسے بار بار اپنی بوڑھی ماں کا خیال آرہا تھا جس نے کہا تھا۔

"بیٹا۔ رنگون پہنچتے ہی خط لکھنا۔"

دراصل نوکری کا محض بہانہ ہی تھا۔ وہ رنگون کی سیر کے لیے جارہا تھا۔ ایک زمانے سے اس کی خواہش تھی کہ وہ رنگون کا چکر لگائے۔ ان کے اپنے شہر کا ایک آدمی قاضی محمد علی، رنگون میں گیارہ سال سے اپنا اردو اخبار نکال رہا تھا۔ انور نے بہزار دقت قاضی صاحب سے واقفیت نکالی اور انہیں خط لکھا کہ وہ رنگون میں نوکری کرنا چاہتا ہے۔ قاضی صاحب نے ایک ماہ بعد جواب دیا کہ ابھی کوئی نوکری نہیں ہے۔ جس وقت بھی کوئی جگہ نکلی وہ اسے ضرور بلائیں گے۔ تین سال بعد جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو _____ ایک روز اچانک قاضی صاحب کا خط آگیا۔

برخوردار

"مجاہد" کے ساتھ میں نے 'ہمیر پھیر' نامی ایک اور اخبار جاری کیا ہے جیسا کہ تم تین سال پیشتر مجھے لکھ چکے ہو۔ اگر رنگون آنا چاہو تو میں

تمہیں سو روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ سکتا ہوں۔ رنگون تک پہنچنے کا اٹھانا ہوگا ___،

قاضی محمد علی

انور کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا موقع اور کوئی نہ تھا۔ اس نے ماں کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر اپنے باپ سے کچھ روپیہ اینٹھا اور ایک روز ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہوگیا۔ سٹیشن پر جب گاڑی چھوٹنے لگی۔ تو اس کی ماں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"بیٹا! رنگون پہنچتے ہی خیریت کا خط لکھنا۔"

"اچھا ماں _____ تم بے فکر رہو۔"

انور نے سوچا اسے رنگون پہنچتے ہی اپنی پیاری ماں کو خط لکھنا چاہیئے۔

اب رات ہوگئی تھی۔ جہاز پر مکمل بلیک آؤٹ تھا۔ کیبنوں کے اندر بے حد مدھم اور کمزور سی روشنیاں ہو رہی تھیں۔ جہاز کے اوپر، باہر، آگے، پیچھے، اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ آسمان بدستور سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ تیز گیلی ہوا میں اس کے بال اڑ رہے تھے۔ خنکی بڑھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی یوپی کے گھسیارے تھالیوں میں گیلا اور کچا بیسنی آٹا کھانے کے بعد اب بیڑیاں پی رہے تھے اور رامائن کی کتھا پڑھ رہے تھے۔ سلگتی ہوئی بیڑیوں کے سرے ڈیک پر یہاں وہاں جگنوؤں کی طرح جل بجھ رہے تھے۔ اور کتھا پڑھنے والوں کی آواز تیز ہوا میں کبھی یہاں اور کبھی وہاں گونج رہی تھی۔ انور نے ٹانگیں پھیلا کر اپنا سر سوٹ کیس پر رکھا سگریٹ دریا میں پھینکا، کمبل اوپر کیا اور آرام سے لیٹ گیا۔ دریا کی تیز ہوا نے اسے بہت جلد سلا دیا۔

الصبح جب وہ بھرپور نیند لینے کے بعد تازہ دم بیدار ہوا تو آسمان پر گہرے سرمئی رنگ کے بادل جھکے ہوئے تھے۔ اور اس کی گردن اور پٹھے اکڑ سے گئے تھے۔ دونوں ہاتھوں سے گردن اور پٹھے دباتے ہوئے انور کو محسوس ہوا کہ ہمارا جہاز ڈول رہا ہے۔ کمبل ایک طرف کرکے وہ جنگلے کا سہارا لے کر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ اب وہاں نہ ہگلی نہ خضر پور۔ باغات اور نہ ناریل

کے گنجان ذخیرے ——— جہاز تارکول ایسے سیاہ رنگ کے بیکراں سمندر میں ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔ لہریں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی شکل میں دور سے اٹھ اٹھ کر جہاز کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ قریب آکر وہ جہاز کے پیندے سے ٹکراتیں اور جہاز کو اوپر اچھال کر پرلی طرف نکل جاتیں۔ پرلی طرف سے آنے والی لہریں جہاز کو اوپر اٹھا کر اس سمت نکل جاتیں۔ ہوا پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہو گئی تھی اور اس میں رطوبت کے ساتھ ساتھ کھاری پانی سرایت کر گیا تھا۔ جوہر سانس پر محسوس ہو رہا تھا۔ انور جنگلے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا تھا۔ اس سے پیشتر اس نے سمندر کو سستے قسم کے ناولوں اور انگریزی فلموں میں ہی دیکھا تھا اور خیال ہی خیال میں کئی سمندری مہمیں سر کی تھیں اور کئی نئے جزیرے دریافت کئے تھے اور کئی بحری ڈاکوؤں سے لڑائیاں مول لی تھیں۔ لیکن اس وقت وہ اصلی اور زندہ سمندر کے روبرو کھڑا تھا اور کف اڑاتی پُرشور موجیں جہاز کے پیندے سے ٹکرا رہی تھیں۔ اسے اپنا آپ سمندر کے مقابلے میں بے حد چھوٹا معلوم ہو رہا تھا اس نے سوچا۔ اگر زمین پھر کبھی دکھائی نہ دی تو پھر کیا ہوگا! اسے فوراً اپنی ماں ——— محبت کرنے والی ماں کا خیال آیا۔ جس نے کہا تھا۔ رنگون پہنچتے ہی خط لکھنا ——— ہاں وہ رنگون پہنچتے ہی خط لکھے گا۔ رنگون ضرور آئے گا۔ زمین ضرور آئے گی۔ زمین سے بالکل علیحدہ ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کی محبت ایک چشمے کی طرح انور کے دل میں پھوٹ پڑی تھی۔ وہ زمین سے کس قدر محبت کرتا ہے اور دنیا میں زمین صرف ایک حصہ ہے اور باقی تین حصے پانی ——— ہاں دنیا میں محبت کرنے والی ہستیاں عموماً کم ہیں۔ ہمارے دلوں میں محبت صرف ایک حصہ ہے اور باقی تین حصے ہر وہ شے جسے محبت نہیں کہا جا سکتا۔

انور جنگلے پر جھک گیا۔

وہ بہت حیران ہوا۔ کیونکہ یا تو جہاز پانی میں اور نیچے چلا گیا تھا اور یا پانی زیادہ چڑھ آیا تھا۔ ہگلی میں پانی جہاز کی سب سے نچلی اور پہلی منزل کی گول کھڑکیوں کو چھو

رہا تھا اور یہاں سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں دوسری منزل کی کھڑکیوں کا منہ دھلا رہی تھیں۔ سمندر کا پانی اس قدر شفاف تھا۔ کہ ہر موج کی ڈھلوان کانچ کی طرح چمک رہی ہوتی اور جب وہ جہاز سے ٹکراتی تو کھاری سوڈے کی مانند چمکیلی سطح کے نیچے دور تک سیمابی بلبلوں کی ہوائیاں سی چھوٹنے لگتیں۔ جہاز کی نوکدار پیشانی سے ٹکر لینے والی موجوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ جہاز سے ٹکرا کر وہ زخمی وحشیوں کی طرح پیچ و تاب کھانے اور کھولنے لگتیں اور نیلی نیلی جھاگ کے گالے اڑاتی بجلی ایسی تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف نکل جاتیں جھاگ کے یہ چھوٹے بڑے گالے لہروں کی سطح پہ عجیب عجیب قسم کی شکلیں بنا رہے تھے اور بگاڑ رہے تھے۔ کسی وقت انور دیکھتا کہ ننھی منی لاتعداد جل پریاں برف پوش نیلی نیلی وادیوں میں رقص کر رہی ہیں اور کسی وقت اسے دکھائی دیتا ریگستانوں میں اونٹوں کی لمبی لمبی قطاریں منزل کی طرف رواں ہیں۔

دن کا اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ انور نے جنگلے سے ہٹ کر کمبل تہہ کر کے سوٹ کیس میں بند کیا اور خود منہ ہاتھ دھونے غسل خانے کی طرف چل پڑا جہاز کچھ اس طرح ڈول رہا تھا کہ اس کا ایک حصہ لہروں کے زور سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا چلا جاتا اور جب مسافر دوسری طرف لڑھک جانے کے ڈر سے جنگلوں کے تار تھام لیتے تو جہاز کا وہ حصہ نیچے ہونا شروع ہو جاتا اور پھر دوسرا حصہ اوپر اٹھنے لگتا۔ مسافروں میں سے بعض آدمیوں کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ انور غسل خانے کے دروازے میں کھڑا تھا کہ ایک یوپی گھسیارا جھکے جھکے ڈیک کے جنگلے کی طرف بھاگا۔ اور لوہے کے تاروں میں سے سر باہر نکال کر قے کر دی۔ انور ہنس پڑا۔ اور کھاؤ بیسنی آٹا دوست ———

غسل خانے کے باہر نکل کر وہ دامن سے منہ پونچھ رہا تھا کہ اس نے سردار صاحب کو دیکھا۔ انہوں نے صرف بنیان اور کچھرا پہن رکھا تھا۔ بینگی ٹانگوں اور چھاتی پر بالوں کا گھنا جنگل اگ رہا تھا۔ داڑھی پر جگہ جگہ پن لگنے سے ان کا منہ زیادہ گول معلوم ہو رہا تھا۔ ہاتھ میں پیتل کی گڑوی تھامے وہ داتن کرتے چلے

آرہے تھے اور ساتھ ساتھ شبد بھی پڑھ رہے تھے۔ انور کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر سردار صاحب نے داتن منہ سے نکال کر تھوکا اور ہنس کر بولے۔

"ہو ہو ـــــ سنائیے جی! چکر وکر تو نہیں آرہے؟"

انور نے کرتے کا گیلا دامن سکھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"بالکل نہیں جناب۔"

سردار صاحب بولے

ابھی تو گورمکھو! کالا پانی شروع ہی ہوا ہے۔ ذرا آج کا دن ٹھہر جائیے۔ کل طبیعت کا حال معلوم کروں گا۔"

انور دل میں قدرے ڈر سا گیا۔ کیونکہ وہ چکروں سے بڑا گھبراتا تھا اور قے سے اسے بے حد نفرت تھی۔ اسے یہ کسی طرح بھی گوارا نہ تھا کہ آدمی کے بدن میں ساری مشینری الٹا کام کرنے لگے۔ اور غذا نیچے جانے کی بجائے اوپر آنا شروع ہو جائے اس نے دل مضبوط کر کے کہا۔

"دیکھا جائے گا سردار صاحب ـــ جہاز بیچ سمندر میں پہنچ تو لے۔"

سردار صاحب داتن منہ میں ڈال کر انور پر ذرا جھک گئے۔

"اور اگر بھائیا جی چکر وکر محسوس ہوئے تو میرے پاس کیکر کے چھال کی شراب ہے۔ بے شک پاؤ بھر پی لینا۔"

انور سہم گیا۔ اپنے وطن میں اس کے ایک دوست نے واقعہ سنایا تھا کہ ایک شہری برات دیہات گئی۔ دیہات والوں نے پرانی، کیکر کے چھال کی شراب کو روڑی کے ڈھیر میں سے باہر نکالا کہتے ہیں یہ شراب وہاں دس سال سے بند تھی۔ مٹکے کا منہ کھولا۔ اور اس کے تین قطرے پانی کے بڑے مٹ میں ڈال دیئے اور پانی براتیوں کو پلانا شروع کر دیا۔ راوی کا بیان ہے کہ برات تیسرے روز شہر پہنچی تو براتیوں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی۔ کیونکہ انہیں ابھی تک ہوش نہ آیا تھا۔

انور نے جلدی سے کہا۔

"میں شراب نہیں پیتا۔ لیکن اگر ضرورت پڑی تو لے لوں گا۔"

سردار صاحب سیدھے کھڑے ہو گئے اور داتن کرنے لگے۔

"یہ سالا دروازہ ہی نہیں کھلتا۔"

پھر انور کی طرف دیکھ کر بولے۔

"پہلے پہل مجھے موٹر لاری میں چکر آجایا کرتے تھے۔ لیکن جب سے ایک کتاب میری جدوجہد پڑھی ہے۔ سب چکر وکر رفو چکر ہو گئے ہیں۔ بڑی ظالم شے ہے گورمکھو! ـــــ ہٹلر صاحب کی سوانح عمری ہے۔"

انور نے دل ہی دل میں ہنستے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے پاس ہے کیا؟"

سردار صاحب بولے۔ "خضر پور جیٹی تک میرے ساتھ تھی۔ مگر وہ سالا کسٹم آفیسر اس پر آنکھ رکھے ہوئے تھا۔"

پھر بات پلٹ کر فرمانے لگے۔ "آج اخبار ہی نہیں پڑھا۔ پتہ نہیں ہٹلر کی فوجیں کتنا آگے بڑھ گئی ہیں۔ بڑا گبھرو آدمی ہے جی وہ۔ یہ انگریز تو گیدڑ ہیں گیدڑ۔"

غسل خانے کا دروازہ کھل گیا۔ اور سردار صاحب بابا فرید کی بانی۔ گلیاں چکڑ دور گھر ـــ گنگناتے ہوئے اندر گھس گئے۔ انور مسکراتے ہوئے اپنی سیٹ کی طرف آگیا۔ اپنی سیٹ پر پہنچ کر جب اس نے سگریٹ سلگایا تو اسے معلوم ہوا کہ ایک سانولی سلونی پوربن لڑکی اسکے ساتھ والے پوربیوں کے ٹولے میں گٹھڑی بنی لیٹی ہے اور بسنتی گھونگھٹ میں سے کبھی کبھی اپنی کالی کالی آنکھوں سے اسے بھی تک لیتی ہے۔ انور کو یوں محسوس ہوا گویا وہ بندرابن کی کوئی گوالن ہے۔ جو برہا دیو کے مندر میں اپنے پیتم سے ملنے جا رہی ہے اور اس کے ماتھے پر لال گلال بندیا ہے اور جوڑے میں چنبیلی کا گچھا ہے اور ہاتھوں میں کانسی کا تھال ہے جس میں دیئے کی لو کانپ رہی ہے اور موتیے کی کلیاں بکھری ہوئی ہیں۔

ایکا ایکی بندرابن کی گوالن اٹھی۔ اسکے ہاتھوں سے کانسی کا تھال گر پڑا کلیاں بکھر گئیں۔ دیا بجھ گیا۔ وہ جھکے جھکے ڈیک کی طرف گئی اور جنگلہ تھام کر قے کرنے لگی۔

انور سوٹ کیس تھام وہاں سے اٹھا اور ڈیک کی پرلی طرف چلا گیا۔

۲

دوسرے روز جہاز سمندر میں پہنچا۔ تو زیادہ شدت سے ڈولنے لگا۔

سمندر کا رنگ پہلے سے زیادہ کالا پڑ گیا اور بپھرتی ہوئی موجیں عرشے کی خبر لا رہی تھیں۔ مسافروں نے اپنا اپنا سامان اچھی طرح جکڑ رکھا تھا۔ تاکہ کوئی بھی شے سمندر میں لڑھکنے نہ پائے۔ جہاز بوتل کے کاک کی طرح سمندر میں اوپر نیچے ہو رہا تھا اور محسوس ہوتا تھا۔ ابھی خوفناک موجوں کی تہہ میں ڈوب جائے گا۔ زیادہ تر لوگوں کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہ اپنے اپنے بستروں پر انتہائی نقاہت کے عالم میں یوں پڑے تھے کہ عرشے پر کسی ہسپتال کے وارڈ کا گمان ہو رہا تھا انور کی حالت بھی دگرگوں تھی اور وہ سردار صاحب کے قریب ہی کمبل تانے بے سدھ سا پڑا تھا۔ جہاز کے ساتھ اس کا دل بھی ڈول رہا تھا۔ جہاز مکمل طور پر طوفانی موجوں کے رحم و کرم پر تھا۔ انور قے وغیرہ سے اس لیئے محفوظ تھا کہ رات بھر سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کبھی کبھی سردار صاحب اس کے حلق میں لیموں کا عرق یا ابلے ہوئے پانی کے چند قطرے ٹپکا دیتے۔ سردار صاحب پہلے روز کی طرح چاق و چوبند تھے شاید اس لیئے کہ وہ ہر آدھ گھنٹے کے بعد کیکر کی چھال کی شراب چکھ لیتے تھے۔ ہاں کالے پانی کی نمکین

اور تند ہواؤں کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ ان کی عینک کے شیشے ہر پانچ منٹ کے بعد دھندلے پڑ جاتے تھے۔ جنہیں وہ بنیان کے دامن سے صاف کر لیتے۔ ایک دفعہ انہوں نے عینک ناک پر اچھی طرح بٹھا کر کہا

"بس یہاں سے کالے پانی کا جزیرہ شمال مغرب کی طرف دس گیارہ میل ہے۔"

انور نے بولنا چاہا مگر وہ خاموش رہا اور زبان ہلانے کو اس کا جی نہ چاہا۔

"سمندر کافی چڑھا ہوا ہے۔ میں نے کئی بار رنگون تک سمندر کا سفر کیا ہے مگر اب کی دفعہ اس کے تیور کچھ اور ہیں۔ دراصل جون جولائی میں سمندری سفر سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ پر لوگ اپنی طبیعت سے بے خبر کیوں ہیں۔ اب ان پوربیوں کو دیکھو۔ کل کیسے مزے میں تھے۔ بار بار کھا رہے تھے اور لہک لہک کر رامائن کی کتھا پڑھ رہے تھے۔ اور اب نیم مردہ چوہوں کی مانند ڈیک پر پڑے ہیں۔ کالو تو بدن میں لہو کا نام نہ ہوگا۔ اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ میری طرف دیکھو — اگر شراب میرے ساتھ ہو تو میں اسی جہاز پر جرمنی تک کا سفر طے کر سکتا ہوں۔ حالانکہ ہٹلر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس موسم میں جرمنی کا سمندر ....."

انور کے لیئے سردار کی باتیں بالکل بے معنی تھیں۔ تاہم اسے ان باتوں پر رشک آ رہا تھا۔ وہ بھی اسی طرح بے مقصد باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور بولنے کی قوت بے حد نحیف ہو رہی تھی۔ جہاز دائیں طرف کو جھکتے جھکتے سمندر کی ہیجانی موجوں کو عرشے پر لا پھینکتا تو انور کو محسوس ہوتا۔ وہ کسی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ جہاز بائیں طرف جھکنے لگتا تو نقطۂ عروج پر پہنچ کر اس کے کمبل میں لپٹے ہوئے پاؤں گھنگھور گھٹاؤں میں تحلیل ہوتے نظر آتے اور اس کا دل گویا لڑھک کر اس کے حلق میں آ جاتا۔

سارا دن جہاز کی یہی حالت رہی اور جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ مسافروں نے نقاہت اور بیزاری کے عالم میں اپنے اپنے بستر سمیٹنے شروع کر دیئے۔ چینی طاح عرشے پر اِدھر اُدھر چکر کاٹنے لگے۔ مینہ تیز ہو گیا

اور دیکھتے دیکھتے وہاں دھار بارش کا سماں بندھ گیا۔ جہاں انور لیٹا تھا وہاں اوپر موم جامے کا سائبان سا لگا تھا۔ پھر بھی اس نے ٹانگیں سمیٹ لیں اور سردار صاحب کے صندوق سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سردار صاحب نے جلدی جلدی بکھری ہوئی چیزوں کو اکٹھا کیا اور چادر اوڑھ کر بیٹھ رہے۔ چینی ملاح پھر کبوں کی طرح گھوم پھر کر لنگر انداز مشین پر ترپالیں ڈال رہے تھے۔ موٹے موٹے رسوں کو ایک جگہ ڈھیر کر رہے تھے جالی دار روشندانوں کا منہ موم جاموں سے ڈھک رہے تھے اور ان کی نیکریں اور منہ میں دبے ہوئے پتلے سگریٹ گیلے ہو گئے تھے۔ وہ بار بار ادھر ادھر دوڑتے ہوئے پنجڑتے ہوئے بالوں کو جھٹک رہے تھے اور اپنی بولی میں ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو پکار رہے تھے ـــــ کف اڑاتی موجوں کا شور، بادلوں کی گرج اور بارش کے شور سے مل کر زیادہ خوفناک ہو گیا تھا۔ ارد گرد پڑے ہوئے مسافروں میں سے کچھ گرتے پڑتے نچلی منزل میں اتر گئے تھے اور باقی سائبان تلے جمع ہو گئے تھے شام کے اندھیرے اور بارش کی دھند میں انور کو اپنے آس پاس انسانوں کی چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ وہ لوگ جن پر سمندری ہوا اور بادوباراں کے طوفان کا کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا۔ تمباکو وغیرہ پی رہے تھے اور بلند آواز میں اپنے نیم مردہ ساتھیوں سے باتیں کر رہے تھے۔

سردار صاحب نے صندوقوں کی طرف منہ کر کے پیتل کے کٹورے میں تھوڑی سی شراب انڈیلی، اسے پانی کی طرح حلق میں اتارا اور آرام سے بیٹھ کر مونچھوں کے سرے چاٹنے لگے۔

"کیوں رے بھیا جی ـــــ بیڑی پینا راماٹن میں کہاں لکھا ہے؟

بھیا جی نے دور سے آنکھیں مچمچا کر بلند آواز میں کہا۔

"نائیں لکھت ہو مہاراج ـــــــ پر یہ شے ایک بار لگے ہے تو پھر نہ چھوٹت ہے۔"

انور نے صندوق سے ٹیک لگائے کمبل اور اوپر کر لیا۔ اس نے سوچا اس

طوفانی موسم میں اس سرخ بالوں والی کی حالت کیسی ہو گی۔ جسے اس نے جہاز کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جو درجہ اوّل کے کیبن کے باہر، جنگلے سے پشت لگائے اپنی سہیلیوں سے باتیں کر رہی تھی اور ہوا میں جس کے سُرخ بال شعلوں کی مانند لہرا رہے تھے۔ شاید وہ گرم بستر میں ریشمی کمبل اوڑھے سو رہی ہو۔ اور ہو سکتا ہے اسے بھی چکر آ رہے ہوں۔ اور وہ جہاز کے ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی ہو۔ انور اس یورپین لڑکی کی کسی ایک اور قطعی حالت کا کوئی واضح تصور قائم نہ کر سکا۔ اور اس کا خیال بندر ابن کی سانولی سلونی گوالن کی طرف چلا گیا۔ جو یقیناً سب سے نچلی منزل کے سیلے فرش پر اوندھے منہ پڑی تھی اور جس کا دل جہاز کی رولنگ کے ساتھ ساتھ اوپر تلے ہو رہا تھا۔

سمندری طوفان رات بھر جہاز کو جھنجھوڑتا رہا اور انور صندوقوں سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اور سردار صاحب کیکر کی شراب پیتے رہے۔

دن کی سفیدی نمودار ہوئی۔ تو بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن سمندر کا جوش مدھم نہ پڑا تھا۔ فصیلی موجیں جھاگ اڑاتے ہوئے اسی طرح جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ اور ان کے پھینٹوں کی پھوار انور کو اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھی۔ سردار صاحب تھیلے میں سے دانتن نکال کر گڑوی اٹھا غسل خانے کی طرف چل دیئے۔ انور نے سگریٹ سلگایا سگریٹ کا دھواں بے حد پھیکا اور بدمزہ تھا اس نے بجھا کر اسے پھر ڈبی میں ڈال دیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے چینی ملاح سٹیم روم کے روشن دانوں کا منہ کھول رہے تھے اور شور مچاتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف رسے پھینک رہے تھے۔ مسافر بار بار ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے۔

"آج شام زمین دکھائی دے گی اور کل علی الصبح جہاز رنگون پہنچ جائے گا۔" سردار صاحب نے غسل خانے سے واپس آ کر انور کو بتایا۔

"میں بھی سوچتا تھا۔ کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اس وقت تک تو برما کے جنگل شروع ہو جانے چاہئیں تھے۔ سٹیوارڈ نے بتایا ہے کہ طوفان کے باعث جہاز کو کئی میلوں کا

زائد چکر کاٹنا پڑا ہے۔ اب ہم صبح رنگون پہنچیں گے۔"

پھر سر کا جوڑا کھول کر بالوں میں کنگھا پھیرتے ہوئے بولے۔

"دریا تو شام ہی کو آ جائے گا۔"

انور نے پوچھا

"کون سا دریا ــــ؟"

"ایراوتی ــــ برما کا مشہور دریا۔"

انور کو ایراوتی کا لفظ بے حد بھلا معلوم ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا کسی نے اس کے کانوں پر ہونٹ رکھ دیئے ہوں۔ ایراوتی! ــــ دریائے ایراوتی ــــ برما کا مشہور دریا۔ برما کے نقشے پر اس نے اس دریا کو پیگو یاما اور شان پہاڑوں سے نکل کر سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے رنگون کے سمندر میں گرتے کئی بار دیکھا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایراوتی کے گدلے پانیوں پر کشتی چلانے والوں کو ہزاروں گیت یاد ہیں اور ان گیتوں سے ان کی ہزار سالہ مفلس اور جفاکش زندگی کی یادیں وابستہ ہیں۔ خیال ہی خیال میں اس نے کئی مرتبہ ان گیتوں کی سوز میں ڈوبی ہوئی لمبی تانوں کو مانجھیوں کے سینوں سے نکلتے سنا تھا۔ اور اس کا من یوں بے رنگ اداسی میں ڈوب گیا تھا۔ گویا اس کا وطن ایراوتی کے کناروں پر کوئی گھاس پھونس کی چھونپڑیوں والا چھوٹا سا گاؤں ہو۔ اور وہ ایراوتی کی لہروں سے بچھڑ کر پنجاب میں جدائی کے دن گزار رہا ہو۔ گویا ایراوتی، راوی ہو اور وہ رنگون کی بجائے لاہور کی سمت سفر کر رہا ہو۔

انور نے اس روز بھی کچھ نہ کھایا۔ صرف دوپہر کو سردار صاحب نے زبردستی اسے ایک موسمبی کا رس نکال کر پلا دیا۔ سردار صاحب کو انور سے کچھ ہمدردی سی ہو گئی تھی۔ جب وہ یہ سوچتے کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا پنجاب سے خالی ایک کمبل اور سوٹ کیس اٹھائے رنگون کے طویل سفر پر چل نکلا ہے اور وہ دو روز سے بغیر کچھ کھائے پیئے ڈیک کے ننگے فرش پر چپ چاپ لیٹا ہے تو گنجان بالوں والے بھدے جسم میں چھپا ہوا ان کا دل انسانی محبت کے جذبات سے لبریز ہو جاتا۔

اور وہ انور کو کبھی لیموں کا عرق پلاتے کبھی موسمبی کھانے کو کہتے اور کبھی اسے چھاتی پر کمبل اچھی طرح اوڑھنے کی ہدایت کرتے۔

"یہ سمندری ہوا بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ میں اس کے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ لیکن برخوردار! میں ابھی تک حیران ہوں کہ تم نے صرف کمبل کے ساتھ اتنا سفر کیسے طے کیا۔"

انور سردار صاحب کی معصوم نگاہوں کو دیکھ کر چپکا ہو رہتا

"اور زیادہ حیرت تو یہ ہے کہ تم محض سو روپے کی نوکری کے لیئے یہ سمندر پار کا پردیس مول لے رہے ہو۔ یار یہ تو بتاؤ کیا پنجاب میں نوکری نہیں تھی۔ بھئی اب تو جنگ کا زمانہ ہے۔ ہزاروں نئے کاروبار کھل گئے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ــــ لیکن ــــ دراصل مجھے رنگون دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔"

سردار صاحب قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور ان کا سارا جسم ہچکولے کھانے لگا۔

"واہ گورکھو واہ! ــــ بھئی شوق ہو تو ایسا۔ مجھ سے پوچھو۔ رنگون کیسا ہے؟ میں تین سال سے وہاں ہوٹل کا دھندا کر رہا ہوں۔ تمہارے جیسا نٹ کھٹ لونڈا تھا کہ گھر چھوڑ کر پردیس کی راہ لی اور رنگون پہنچ کر ایک سینما گھر میں بورڈ اٹھانے پر ملازم ہو گیا۔ متواتر تین سال تک شہر کے گلی کوچوں کے چکر کاٹے اور جی اس کام سے اچاٹ ہو گیا۔ اس کے بعد مغل سٹریٹ میں ایک نانبائی کی شاگردی قبول کی۔ اور آٹھ سال تک لوگوں کو مٹی ملا آٹا اور موٹے چاول کھلاتا رہا روٹی کپڑا مالک دے چھوڑتا تھا اور تنخواہ کے بیس روپے میں اپنی بوڑھی ماں کو منی آرڈر کر دیتا تھا اب جو قسمت پانسہ پھینکتی ہے تو ایک گیانی جی مجھے اپنے ساتھ موپک لے جاتے ہیں جہاں وہ ہیرے جواہرات کی کانوں میں ٹھیکے پر کام کرتے تھے۔ تین سال بعد وہاں سے واپس آیا تو کسی نہ کسی طرح کچھ ہیرے میں چند ایک جواہرات بھی چھپا کر ساتھ ہی لیتا آیا۔ ان سے کچھ ساکھ ہو گئی اور میں نے سولی ٹیوڈا کے بڑے چوک میں ایک

چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ سچے پادشاہ نے وہ رنگ دکھائے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل چل نکلا۔ پنجابی بیوی تو پہلے ہی تھی۔ اب ایک برمی عورت بھی کر لی۔ گاؤں میں کافی زمین خرید چکا ہوں مگر رنگون میں سوائے ایک مکان کے اور کوئی جائداد نہیں ہے۔ اپنا مزے میں ہوں۔ پھر بھی اگر مجھ سے پوچھو تو میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا۔ رنگون پہنچتے ہی واپسی ٹکٹ کٹوالو۔"

"کیا خبر وہاں سچے پادشاہ میرا بھی انتظار کر رہے ہوں اور کوئی گیانی صاحب مجھے بھی موپک لے جائیں جہاں ہیرے جواہرات کی کانیں ہیں۔"

سردار صاحب ہنس پڑے اور بڑا سا ڈکار مار کر کہنے لگے۔

"سچے پادشاہ نے مجھ سے تین سال تک سینما کے بورڈ اٹھوائے اور کچھ نہ بنا آخر قسمت کا دروازہ کھلا بھی تو انہی جواہرات کی کنجی سے جنہیں میں موپک سے چرا کر لایا تھا ـــــ تاہم اس میں بھی سچے پادشاہ کی مدد شامل حال تھی۔ وگرنہ اسی وقت دھر لیا جاتا۔ برخوردار اس رام کہانی کا مطلب یہ ہے کہ تم سے یہ سخت جانی نہ ہو سکے گی۔"

"سردار صاحب! میں تو کمرِ ہمت کس کر چلا ہوں۔"

"برخوردار یہ کمرِ ہمت رنگون پہنچتے ہی کھل جائے گی۔"

"لیکن رنگون کب آئے گا۔"

سردار صاحب نے عینک کے دھندلے شیشوں کو بنیان سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"بس ابھی کچھ دیر میں ہمارا جہاز ایراوتی میں داخل ہو جائے گا اور تیل کے چشمے شروع ہو جائیں گے۔"

ایراوتی! ـــــ تیل کے چشمے! ـــــ ساگوان کے جنگلات! ـــــ ہیرے جواہرات کی کانیں! کب آئے گی ایراوتی! کب شروع ہوں گے تیل کے چشمے، کب؟ کب؟؟

انور کا دل چاہا کہ وہ بھاگ کر ڈیک کا جنگلہ کود جائے اور پرجوش طوفانی سمندر میں باہیں کھول کر چھلانگ لگا دے اور ایراوتی کے گدلے پانیوں کی طرف تیرنا شروع کر دے۔ اور تیرتا چلا جائے، تیرتا چلا جائے، یہاں تک کہ اس کا جسم چور ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں اور اس کے کھلے منہ میں سمندر کا کھاری پانی داخل ہونے لگے اور پھر جب کالے پانی کی ہیبت ناک، سرکش موجیں اسے مردہ کتے کی طرح ادھر ادھر اچھالنے لگیں تو ایراوتی کی لہریں لپک کر اسے اپنی پرسکون آغوش میں کھینچ لیں اور موت ایسی بے ہوشی کے عالم میں اسے ان ماہی گیروں کے گیت سنائی دیں۔ جنہیں وہ اپنی کشتیوں کو دریا کے پاٹ کی طرف دھکیلتے ہوئے چاندنی راتوں میں گایا کرتے ہیں اور اسے محسوس ہو کہ وہ کسی گیت کی، آغوش میں ہے۔ اور ایراوتی کی لمبی اور رواں دواں لہریں ان گیتوں کے سُر ہیں جو اسے زندگی، طاقت، عظمت اور محبت ـــــ ہمہ گیر محبت کا پیام دے رہے ہیں۔ لیکن سمندر میں چھلانگ لگانے کی بجائے اس نے کمبل اور اوپر کر لیا اور ڈولتے ہوئے دل کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب شنگھائی، ایراوتی میں داخل ہو۔

شام ہو رہی تھی یا نہیں ہو رہی تھی، کچھ خبر نہیں۔ گہرے سے گہرے بادلوں کے عقب میں دن کا اُجالا ماند پڑ رہا تھا کہ جہاز کے ماتھے کی طرف کوئی شخص چلایا۔

"جے دھرتی ماتا ـــــ ارے کلو ارے کلوا ـــــ"

سردار صاحب کیکر کی شراب چکھنے کے بعد خراٹے لے رہے تھے۔ انور نے ذرا آگے جھک کر جہاز کی سیدھ کی جانب دیکھا۔ اسے کچھ دکھائی نہ دیا حدِ نگاہ تک بادلوں کا سرمئی لحاف پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کے گیلے کناروں کو سمندر کی ابھرتی ہوئی موجیں چھو رہی تھیں۔ پھر بھی اس نے اس پوربیئے کی پرمسرت آواز پر اعتبار کرتے ہوئے دل ہی دل میں خشکی کا استقبال کیا۔

"جے دھرتی ماتا۔ پیاری زمین کو سلام ـــــ ہزار بار سلام۔"

یوپی کے اس چمار یا گھسیارے نے ٹھیک کہا تھا۔ زمین انسانوں کی ماں ہے اور تین دن کی تکلیف دہ سمندری مسافت طے کرنے کے بعد جب مرجھائے ہوئے درماندہ چہروں کو ماں ـــــ پیاری ماں کا سرسبز آنچل دور سے نظر پڑے تو اس کے قدموں سے لپٹ جانے کی آرزو دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے اور انسان کے ہونٹوں سے بے اختیار مسرت کی چیخ نکل جاتی ہے۔ زمین کے ساتھ انسانوں کا تعلق صدیوں پرانا ہے۔ یہ اس وقت بھی موجود تھی جب انسان نے ابھی جنم نہیں لیا تھا اور اس وقت بھی کائنات کے خلاؤں میں موجود ہوگی۔ جب اس کی ویران اور تباہ شدہ سطح پر ایک بھی انسان باقی نہ ہوگا۔ اس کے بیٹے اسے غلاظت اور گندگی پیش کرتے ہیں اور وہ انہیں پھول اور پھل پیش کرتی ہے اس کا خُلق کس قدر عظیم ہے۔ اس کا صبر کس قدر سنگین ہے۔ کتنی بردبار، متحمل اور محبت کرنے والی ہے۔ یہ انور اور سردار صاحب کی ماں، اس چمار اور سرخ بالوں والی پوربین لڑکی کی ماں ـــــ

"بیٹا رنگون پہنچتے ہی خیریت کی خبر کرنا۔"

اور انور نے سوچا کہ وہ رنگون پہنچتے ہی ماں کو خیریت کا خط لکھ دے گا ایک رات اور بیت گئی۔

دن چڑھا تو جہاز پر کافی چہل پہل تھی۔ زمین دیکھنے نچلی منزل کے مسافر بھی اوپر آگئے تھے۔ ہر آدمی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ مگر زمین کا عکس موم بتیوں کی مانند ان کی ویران آنکھوں میں اجاگر ہو رہا تھا اور ڈیک کے جنگلے پر جھکے ہاتھ بڑھا بڑھا کر ایک دوسرے کو کچھ دکھلا رہے تھے۔ سفید سفید آبی پرندوں نے بھی جہاز کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے تھے۔ انور اپنی جگہ سے اٹھا تو اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا کوئی گرم گرم سیال شے تیزی سے اس کی ٹانگوں میں گردش کرنے لگی ہے۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دیئے آہستہ آہستہ جنگلے کے ایک طرف جا کھڑا ہوا۔

جہاز ایروتی کے گدلے گدلے پانیوں پر بڑے سکون سے آگے بڑھ رہا

تھا۔ نہ معلوم رات کے کون سے لمحے 'شنگھائی' نے کالے سمندر کو الوداع کہا تھا۔ اور دریائے ایرادتی نے اسے اپنی پرمحبت گود میں لے لیا تھا۔ دریا کا پاٹ اتنا چوڑا نہ تھا۔ کنارے کنارے ساگوان کے گھنے جنگلات کا سلسلہ تھا سردار صاحب نے انور کو بتایا کہ تیل کے چشمے راتوں رات گزر گئے ہیں اور اب تو جہاز رنگون کی وادی میں داخل ہو چکا ہے ـــــ دریا کی ہوا مرطوب اور میٹھی تھی اور جسم کو پیار سے تھپتھپا رہی تھی۔ کنارے والے ساگوان اور ناریل کے ذخیروں کی طرف سے پرندوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ انور کے عقب میں چینی جہازی بندروں کی طرح ادھر سے ادھر پھدک رہے تھے اور بڑے بڑے موٹے رسوں کے گچھے کھول رہے تھے اور لکڑی کا فرش دھو رہے تھے۔ جہاز کی چوٹی پر چینی اور امریکی جھنڈے جو سمندر میں داخل ہوتے ہی اتار دیئے گئے تھے۔ اب پھر لہرا رہے تھے لیکن انور کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی وہ ایرادتی کے نظارے میں مگن تھا۔ جہاز ماہی گیروں کی چند ایک بستیوں کے قریب سے گزرا۔ انور صرف بستی والوں کے ننگے بدن اور ریتلے کناروں پر گڑی ہوئی لمبی اونچی بلیّاں ہی دیکھ سکا۔ وہ تو ان کے گیت سننا چاہتا تھا۔ رنگون پہنچنے کے بعد وہ کبھی نہ کبھی ضرور ان کناروں پر آئیگا اور ایسی ہی کسی پھونس کی جھونپڑی کے آنگن میں بیٹھ کر جال مرمت کرتے ہوئے کسی بوڑھے ماجھی سے اس کا محبوب ترین گیت سنے گا ـــــ ہاں ضرور سنے گا۔

انور کو دور سے کسی جہاز کی چیخ سنائی دی۔ دور ایک جہاز پانی میں کھڑا تھا تھوڑی دیر بعد ان کا جہاز بھی رک گیا اور رک رک کر چیخنے لگا۔ مسافر اپنا اپنا سامان باندھنے میں مصروف ہو گئے۔ انور نے بھی کمبل تہہ کیا اور اسے سوٹ کیس میں بند کر دیا۔ سردار صاحب بھی ضروری اشیاء کو سمیٹ رہے تھے۔ انور سردار صاحب کا ہاتھ بٹانے لگا۔

جہاز والوں نے آپس میں بھونپو کی چیخوں اور رنگ برنگی جھنڈیوں کے نشانوں

کا تبادلہ کیا اور ایک زوردار دسل کے بعد شنگھائی، پیر چل پڑا۔ اب غیر آباد گھنے جنگلات کے سلسلے ختم ہو گئے تھے اور ان کی جگہ برمی دیہات نے لے لی تھی۔ دیہاتی مکان یک منزلہ اور ٹیڑھے بینگے تھے اور تکونی چھتوں پر ناریل کی کھپریلیں پڑی تھیں۔ بچے دریا کے کنارے کھڑے جہاز کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ آبادیوں میں کہیں کہیں پیگوڈون یعنی بدھی مندروں کے مخروطی، سنہری کلس دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کا پاٹ ایک دم چوڑا ہو گیا اور انور کو سامنے چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی بھیڑ، لنگرانداز جہازوں کے اونچے لمبے مستول اور ان کے عقب میں افق کی مٹیالی لکیر پر کارخانوں کی کئی ایک چمنیاں دکھائی دیں۔ جن میں سے نکلتا ہوا گاڑھا سیاہ دھواں بادلوں میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔

سردار صاحب نے بندوق کی نالی میں پھونک مارتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"لو جی گور مکھو! آ گیا رنگون"

ہاں رنگون آ گیا تھا اور شنگھائی، کشتیوں اور جہازوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا بندرگاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انور نے دیکھا کہ بندرگاہ پر لنگوٹ کس قلی رسے ہاتھ میں پکڑے تیار کھڑے تھے۔ نیلی نیکروں، خاکی قمیضوں اور لمبے چوڑے نیلے لوپ والے سپاہی اور سفید درویوں میں ملبوس کسٹم والے بھی بندرگاہ کے وسط میں مؤدب کھڑے تھے۔ مزدوروں نے جیٹی کے کناروں پر گھاس پھونس کی گدیاں لٹکا دیں۔ تاکہ ان کی رگڑ سے جہاز کا پیندا محفوظ رہ سکے۔

جہاز ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ جیٹی سے آن لگا۔ لوگ اپنے دوستوں، عزیزوں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ انہیں جیٹی پر آنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ وہ آہنی سلاخوں والے بند دروازوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ ان میں رنگین ساریوں میں ملبوس عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کسی کے ہاتھ میں گلدستہ تھا تو کوئی پھولوں کے ہاروں کا ڈھیر اٹھائے ہوئے تھا۔ درجہ اول اور دوم کی منزل پر سفید سیڑھی لگا دی گئی کسٹم کے آفیسر سپاہیوں کے عملے سمیت اوپر چڑھ گئے۔ سیڑھی پھر نیچے کھینچ دی گئی تقریباً

ڈیڑھ گھنٹے بعد کسٹم والے تیسرے درجے یعنی جہاز کے عرشے پر نمودار ہوئے اور انہوں نے سامان کی بری طرح تلاشی لینا شروع کر دی۔ جب بار بار تمام مسافروں کے سامان کی تلاشی لی جا چکی تو ڈیک کے ساتھ لمبی سی سیڑھی لگا دی گئی۔ اور نیلی قمیضوں اور نیلی دھوتیوں والے برمی، چٹ گامی اور مدراسی قلی گھوڑوں کی طرح اوپر چڑھ آئے اور انہوں نے کہے سنے بنا دھڑا دھڑ مسافروں کا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ ایک قلی انور کے سوٹ کیس کا نشانہ باندھ کر اس کی طرف لپکا۔ لیکن اس نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھا لیا۔ قلی نے وہیں سے رخ دوسری طرف پھر لیا۔ اور سردار صاحب کا سامان اٹھانے لگا۔

"بھئی برخوردار ملتے رہنا" سردار صاحب نے بندوق کا پٹہ کندھے پر کستے ہوئے کہا۔

انور کے چہرے پر پھیکا سا تبسم پیدا ہوا۔

"اور ہاں تمہیں یاد ہے ناں! سپارک سٹریٹ کی ٹرام تمہیں جیٹی سے باہر نکلتے ہی مل جائے گی۔ لیکن بہتر یہی ہو گا کہ تم لنچ یعنی رکھشا لے لو"

اور سردار صاحب قلیوں کو ادھر ادھر دھکیلتے ہوئے سیڑھیوں سے اترنے لگے

انور کا خیال تھا۔ شائد قاضی صاحب نے اسے لینے کے لیے کوئی نہ کوئی آدمی بھیجا ہو گا۔ کیونکہ اس نے کلکتہ سے اپنی روانگی کی اطلاع قاضی صاحب کو کر دی تھی لیکن جب وہ جہاز سے اتر کر بندرگاہ کے اونچی چھتوں والے ہال کمرے میں آیا تو کوئی آدمی بازو پھیلائے اس کی طرف نہ بڑھا۔ لوگ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے گلے میں تر و تازہ پھولوں کے ہار ڈال رہے تھے اور کمریں ہاتھ ڈالے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ انور سوٹ کیس اٹھائے، ٹھنڈا کوٹ کندھے پر رکھے رنگون کی بندرگاہ سے باہر آیا۔

باہر ایک طرف کھلی اور چوڑی سڑک شمالاً جنوباً دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک کے کنارے دونوں جانب پتھریلی پیدلوں پر جھکے ہوئے شاداب درختوں کے سائے

تھے۔ اور ان کے عقب میں زرد، سفید، گلابی اور ہلکے سبز رنگ کی عظیم الشان عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ سڑک پر ٹرام کی چھوٹی پٹڑیوں کا جال بچھا تھا اور سبز رنگ کی ٹرامیں کے ڈبے گڑگڑگڑ کا شور مچاتے ادھر ادھر آجا رہے تھے لوگ پتلونوں، نیکروں، پاجاموں اور دھوتیوں میں ملبوس، چھتریاں اٹھائے اپنی اپنی دھن میں چلے جا رہے تھے۔ انور ایک پان سگریٹ والی دکان کے پاس کھڑا تھا۔ سبھی سجائی چمک دار دکان کی گدی پر ایک برمی عورت اپنے سیاہ جوڑے میں کسی پھول کی سفید کلیاں لگائے بیٹھی تھی اور چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس کی رنگت زرد تھی۔ گالوں کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ ان پر سفید ململ کا کرتہ تھا۔ جس کی جالی میں سے اس کے گول گول بازو صاف نظر آرہے تھے۔ دوکان کی پیشانی پر زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ اس کے منہ میں بھی پان تھا۔ جسے وہ جبڑوں کی خفیف حرکت کے ساتھ چبا رہی تھی۔ انور جیٹی کے صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑا تھا۔ کیونکہ وہاں موٹروں، بگھیوں، ریڑوں اور رکشا والوں کی کافی بھیڑ اور شور وغل تھا۔ وہ ابھی تک اپنے آپ کو جہاز ہی پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اور یوں بوجھل سا تھا۔ گویا کسی نے لوہے کا کنٹوپ پہنا دیا ہو۔ منہ کا ذائقہ ویسے ہی کھاری اور بدمزہ تھا۔ غذا کی بے حد کمی کے باعث تمام جسم پر میٹھی میٹھی نقاہت طاری تھی۔

فٹ پاتھ پر پان والی دوکان کے پاس کھڑے کھڑے اسے بڑی گہری تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ کوئی راہگیر اسے گھور کر بھی نہ دیکھ رہا تھا۔ شاید اس طرح اجنبیت کا احساس زائل ہو جاتا۔ رنگون کی عمارتیں۔ ٹرامیں، رکشے، بگھیاں، قلی درخت اور وہ پان چبانے اور بیچنے والی لڑکی، ہر شے، ہر چیز انور کے وجود سے انکار کر رہی تھی۔ گویا وہ سمندر کی تہہ میں چھپا ہوا کوئی جزیرہ ہو یا فٹ پاتھ پر گری پڑی دیا سلائی کی خالی ڈبی ہو ــــ انور نے کوٹ کی جیب سے کاغذ کا چُرمرا سا ٹکڑا نکالا اور اسے غور سے پڑھنے لگا۔

دفتر روزنامہ "مجاہد" و "ہیرپھیر"

۱۱ سپارک سٹریٹ

رنگون (جنوب مغربی)

کاغذ جیب میں ڈال کر، سوٹ کیس اٹھا وہ سڑک کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک رکشا والے نے بالکل قریب آکر رکشا کے بازو زمین پر ٹیک دیئے۔

"کدھر جائے گا بابو؟"

"سپارک سٹریٹ"

"ایک دم جائے گا بابو"

اور وہ رکشا اٹھا گھوڑے کی طرح سڑک پر دوڑنے لگا۔ اس کا ننگا بدن کالا تھا اور لمبے بال عورتوں کی طرح جوڑے کی شکل میں پیچھے باندھ رکھے تھے سیاہ کھال پر جھریاں پڑ رہی تھیں اور بازوؤں اور پٹھوں کی رگیں پھولی ہوئی تھیں پہلے پہل انور کو رکشا میں بیٹھتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اور وہ سڑک پر راہگیروں سے آنکھیں چرانے لگا۔ لیکن جب دو ایک بازار گزر گئے۔ اور اس نے محسوس کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف دھیان نہیں دے رہا تو وہ رکشے کی گدے دار سیٹ پر چوڑا ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ تانگے کی نسبت وہ سواری زیادہ آرام دہ تھی۔ علاوہ ازیں رکشا والے کو کوچوان کی طرح گھوڑے کے لیے پیسے نہیں بچانے پڑتے۔

رکشا مختلف چوڑے، کشادہ اور بارونق بازاروں میں سے گزر رہا تھا ایک جگہ انور نے لپٹن چائے کا بہت بڑا بورڈ دیکھا۔ ساتھ ہی انگریزی فلموں کے بڑے بڑے پوسٹر لگے تھے۔

"SO ENDS OUR NIGHTS"

"MY LOVE COME BACK"

"NINOTCKA"

کلکتہ میں بھی قریباً اسی قسم کے بڑے بڑے اشتہار ہر بازار میں لگے تھے وہاں بھی عظیم الشان عمارتیں تھیں اور کشادہ سڑکیں تھیں۔ اور موٹریں۔ بگھیاں، رکشے

پتلونیں، نیکریں اور پاجامے تھے۔ تو پھر کلکتہ اور رنگون میں فرق ہی کیا ہوا؟

ہر چوک کے وسط میں، سفید چبوترے پر ٹریفک سپاہی نیلی پتلون، سیاہ جرابیں۔ سیاہ بوسٹ، سفید قمیض اور سیاہ ٹوپ پہنے، کمر کی پیٹی میں چھتری لٹکائے دکھائی دیتا۔ تقریباً ہر سڑک کے دونوں طرف پیدلوں پر شاداب اور جھکے ہوئے درختوں کے سائے تھے۔ دو تلہ اور ایک تلہ بسیں، کاریں اور سائیکل رکھشے کے قریب سے ہو کر گزر رہی تھیں اور رکھشے والا مدراسی گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا اور اب اس کی میلی گردن اور کمر پسینے میں بھیگ چلی تھی۔

جب رکھشا سپارک سٹریٹ میں داخل ہوا تو مدراسی گھوڑے نے پوچھا۔

"کونسی بلڈنگ میں جائے گا صاب؟"

"بارہ نمبر میں ـــ جہاں اخبار کا دفتر ہے"

انور کو خیال تھا اس بیچارے مدراسی کو اردو اخبار کے دفتر کا کیا علم ہوگا مگر جب اسی مدراسی نے فٹ پاتھ پر رکھشے کے بازو ٹیکے تو سامنے والی بلڈنگ کی پہلی منزل پر "روزنامہ مجاہد دہیر پھیر" کا پرانا بورڈ لٹک رہا تھا۔

انور نے جلدی سے رکھشا والے کو پیسے دیئے اور سوٹ کیس اٹھا کر اس عمارت کی طرف بڑھا۔ دونوں اخباروں کا ایک ہی دفتر تھا جس کے دو دروازے سڑک پر کھلتے تھے۔ اونچی چھت والے کشادہ کمرے میں چار پانچ بڑی بڑی میزیں بچھی تھیں اور چند ایک آدمی گردنیں جھکائے کام کر رہے تھے۔ چھت پر بجلی کے تین پنکھے چل رہے تھے۔ انور دفتر میں داخل ہوا تو پہلی میز کے ایک بوڑھے منشی نے سنہری فریم والی عینک کے پیچھے سے آنکھیں چڑھا کر اسے دیکھا۔

"آپ ـــ آپ کسے ملنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے ـــ مجھے قاضی صاحب سے ملنا ہے۔ میرا نام انور علی ہے اور میں پنجاب سے آ رہا ہوں"

ارد گرد میزوں پر جھکی ہوئی گردنیں ایک دم اوپر اٹھیں اور منشی صاحب

نے عینک اتار کر میز پر رکھ دی۔

"تو آپ تشریف رکھیئے ـــ یہ سوٹ کیس ادھر رکھ دیجئے۔ قاضی صاحب تو آپ ہی کو لینے جیٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

انور سوٹ کیس پرے رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے منشی صاحب کا اندازِ گفتگو بہت پسند آیا۔ دوسری میز سے ایک زرد چہرے والا کمزور سا آدمی قلم، ترکی ٹوپی میں اڑا کر بولا۔

"اور آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"میرا بس یہی سامان ہے"

"ارے؟ ـــ بھئی حد ہو گئی"

ایک اور کلاہ پوش بزرگ بولے۔

"سنائیے جی۔ اب کے ہمارے پنجاب میں فصل تو خوب ہوئی ہو گی اور وہاں جنگ کے باعث اجناس کا بھاؤ کتنا چڑھ گیا ہے؟"

"کافی چڑھ گیا ہے"

کونے والے بنچ پر تین چار کاتب حضرات بھی کام چھوڑ کر انور کی طرف حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ گھنگھریالے بالوں والا ایک کاتب بولا

"آپ کانپور جنکشن سے تو گزرے ہوں گے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو یہ بتائیے کہ پلیٹ فارم نمبر پانچ کی چھت تعمیر ہوئی ہے یا نہیں؟"

دوسرا کاتب حیرانگی سے آنکھیں گھما کر بولا۔

"بھئی کمال کر دیا جوان ـــ اکیلے ہی آئے ہو؟"

اتنی دیر میں منشی صاحب نے چائے منگوالی تھی۔ انور کم چینی والی نیم گرم اور پتلی چائے کا دوسرا یا تیسرا گھونٹ ہی پی رہا تھا کہ باہر پرانے طرز کی ایک چھوٹی سی سیاہ کار آ کر رکی۔ کسی نے پاؤں مار کر دروازہ کھولا اور خشخشی ڈاڑھی اور خشخشی مونچھوں والے ایک کلاہ پوش بزرگ باہر نکلے اور چپڑاسی ٹیکے دفتر کی طرف بڑھے۔ انور نے

پیالی میز پر رکھ دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کلاہ پوش بزرگ نے اندر آتے ہی انور کو غور سے دیکھا۔ اور پھر اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"وعلیکم السلام ـــ میں نے سوچا۔ شاید جہاز کی ٹکٹ نہیں لے سکے۔ کہو سفر میں خاص تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں ـــ ذرا چکر آئے تھے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ چکر تو ضرور آئیں گے۔ کچھ کھایا پیا ہے؟"

منشی صاحب عینک چڑھاتے ہوئے بولے۔

"ابھی تو آن کر ہی بیٹھے ہیں۔ صرف چائے پی ہے۔"

کلاہ پوش بزرگ جن کا نام قاضی محمد علی تھا۔ میز پر چھڑی ٹکا کر کلاہ اتارتے ہوئے بولے۔

"آؤ برخوردار ـــ میرے ساتھ آؤ۔"

قاضی صاحب انور کو ساتھ والے ہوٹل میں لے گئے۔ جہاں اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنے اعضا میں قوت سی محسوس کی۔ قاضی صاحب نے دفتر کے ساتھ والا ایک چھوٹا سا کمرہ کھول دیا۔ جہاں چارپائی پر بستر لگا تھا۔ انور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

۳

جس وقت انور کی آنکھ کھلی تو اسے کسی مشین کے چلنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔ اس نے نیم بیداری کے عالم میں خیال کیا کہ وہ جہاز کے ڈیک پر لیٹا ہے۔ اور جہاز ابھی ایرادتی میں داخل نہیں ہوا اور سمندر کی لہریں اٹھ اٹھ کر جہاز سے ٹکرا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ چھ سات گھنٹے کی بھرپور نیند کے بعد وہ اپنے جسم اور خیالات میں بیحد تازگی، توانائی اور بشاشت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بازو پھیلا کر ایک طویل انگڑائی لی اور دروازہ کھول کر باہر دفتر میں نکل آیا۔ قاضی صاحب بڑی میز پر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے انور کو دیکھا اور کام کرتے ہوئے بولے۔

"خوب سوئے برخوردار! چکر تو نہیں آ رہے؟"

"جی نہیں ـــ اب تو طبیعت بڑی اچھی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے وہ نیند ہی کیا جو آدمی کو چکر میں ڈال دے۔"

انور، قاضی صاحب کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ قاضی صاحب نے ملازم کو آواز دی۔

"عبدل میاں چائے تو منگوانا"

اب انور نے قاضی صاحب کو غور سے دیکھا۔ ان کی عمر چالیس سال سے اوپر نہ تھی۔ داڑھی مونچھ اور سر کے خشخشی کنگھی کیے ہوئے بال کالے سیاہ اور چمکیلے تھے ان کا سر چھوٹا اور لمبوترا تھا۔ اور گھنی بھنوؤں کے چھجوں تلے کالی آنکھوں میں ذہانت اور تجربہ کاری کی چمک تھی۔ گالوں کی ہڈیاں قدرے اونچی تھیں اور اس وجہ سے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سپید بدن پر سیاہ بالوں کی کثرت تھی۔ ان کے گول ہونٹ خوبصورتی سے ترشے ہوئے تھے اور جب ہنستے تو وہ چمکیلے اور ہموار دانتوں کے ارد گرد خوبصورت ہالے کا کام دیتے ان کی انگلیاں مخروطی اور سپید نہیں اور صفائی سے کٹے ہوئے ناخنوں میں سرخ خون گردش کر رہا تھا وہ بڑی احتیاط اور نزاکت سے قلم تھامے ہوئے تھے۔ گویا وہ کوئی رنگدار پروں والی تتلی ہو۔ انور سوچ رہا تھا کہ جوانی میں یہ انگلیاں کس قدر خوبصورت ہوں گی؟ ان کا رنگ سپیدی مائل تھا اور رخساروں پر ہنستے وقت سرخ خون اکٹھا ہو جاتا تھا۔ قاضی صاحب کھدر کی سفید شلوار اور قمیض میں ملبوس تھے اور لکھتے ہوئے گاہے گاہے چاندی کی نے والا حقہ بھی پی رہے تھے۔ شام ہو چکی تھی اور سڑک پر برقی قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔ اور آمد و رفت کا شور نسبتاً زیادہ ہو گیا تھا۔

دوسرے روز قاضی صاحب نے انور کو کام پر لگا دیا۔

انور کے فرائض میں انگریزی خبروں کا اردو میں ترجمہ کرنا۔ ہفتے میں ایک بار باری باری اخباروں کے لیے مزاحیہ فیچر لکھنا اور مزاحیہ کالم لکھنے والے اور کارٹی جوڑنے والے کا ہاتھ بٹانا شامل تھا۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ اس طرح وہ اخبار کا تمام کام سیکھ جائے گا۔ اور اس کی باقی زندگی سنور جائے گی۔ انور کی ڈیوٹی چھ بجے شام سے شروع ہو کر تین بجے رات ختم ہو جاتی تھی۔ دفتر کے ساتھ والی دوکان میں قاضی صاحب نے اپنا پریس لگوا رکھا تھا۔ جس پر کام کرنے والے پنجابی تھے۔ ان آدمیوں کو قاضی صاحب نے خاص پنجاب سے منگوایا تھا۔ دفتر میں بھی اخبار کا عملہ زیادہ تر

ان کے رشتہ داروں پر مشتمل تھا۔ صرف چند ایک ملازم غیر پنجابی تھے۔ رنگون میں ہندوستانیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ چنانچہ دیگر انگریزی۔ برمی۔ بنگالی۔ گجراتی اور تامل اخبارات کے ساتھ ساتھ "مجاہد" اور "ہیرپھیر" کی بھی کافی مانگ تھی۔ قاضی صاحب نے برما گورنمنٹ کے وزرا اور افسران سے کافی اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید لی تھی۔ ان کے دونوں اخبارات کی پالیسی لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا، انگریزوں کے خلاف دبی دبی نفرت کا اظہار کرنا اور زیادہ تر دوسرے اخبارات سے لڑائیاں مول لینا تھی قاضی صاحب بے اولاد تھے۔ چنانچہ انہیں اپنے دفتر کے لوگوں سے بڑی محبت تھی تنخواہ وقت پر ادا کرتے تھے اور تیوہاروں کے موقع پر تحفے بھی تقسیم کرتے تھے۔ وہ بہت کم کسی کام کی حامی بھرتے لیکن جب ایک بار ان کے منہ سے ہاں نکل جاتی تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس کام کی تکمیل سے نہ روک سکتی تھی۔ اپنے حقے کے لیے سوکھا تمباکو خاص اپنے گاؤں سے منگواتے تھے اور چلم یا تو خود بھرتے اور یا بوڑھے عبدل میاں سے بھرواتے تھے جو پچیس سال سے ان کے یہاں ملازم تھا اور حقے کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہو چکا تھا۔ شروع شروع میں وہ مانڈلے میں کسی سرکاری ٹھیکیدار کے ہاں مزدوروں کی جمعداری پر ملازم تھے۔ پھر انہوں نے رنگون آ کر ایک بہت بڑے پھلوں کے بیوپاری کے ہاں منشی گیری کا کام شروع کر دیا۔ یہ بیوپاری پشاور کا رہنے والا تھا اور محنتی آدمی کا والہ و شیدا تھا۔ کیونکہ وہ خود ایک طویل جدوجہد کے بعد اس مقام پر پہنچا تھا۔ وہ قاضی صاحب کی ایمانداری اور شبانہ روز محنت سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے انہیں تھوڑے ہی عرصے کے بعد اپنی کمپنی کا ہیڈ منشی بنا دیا۔ بعد میں ان کا مینیجر پھلوں کی تجارت کے سلسلے میں آسٹریلیا گیا تو قاضی صاحب کے ذمے عارضی طور پر فرم کی مینیجری سونپ دی گئی۔ پہلا مینیجر ہوائی حادثے میں مارا گیا۔ اور قاضی صاحب اس فرم کے مینیجر بنا دیئے گئے۔ آٹھ سال کی ملازمت کے بعد انہوں نے ایک روز کمپنی کے مالک کے کان میں ہوائی چھوڑی کہ اگر رنگون میں ایک اردو کا اخبار جاری کیا جائے تو فرم کی پبلسٹی بھی بہت ہو سکتی

ہے۔ اور اخبار کے ترقی کرنے کے امکانات بھی ہیں۔ بیوپاری پبلسٹی کے نام سے چونک اٹھا اور قاضی صاحب نے اس کے پیسے سے 'مجاہد' نامی اخبار کا پہلا پرچہ نکال مارا۔ رنگون میں جہاں ہزاروں کی تعداد میں سورتی میمن اور پنجابی و ہندوستانی لوگ مقیم تھے 'مجاہد' اردو کا پہلا اخبار تھا۔ جو ہاتھوں ہاتھ بکنے لگا۔ قاضی صاحب نے ایک چالاکی کی تھی کہ ڈیکلریشن اپنے نام لیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب اخبار چل نکلا تو انہوں نے اخبار کی ملکیت کا اعلان کر دیا۔ پھلوں کا بیوپاری بڑا تلملایا اس نے جھٹ سے مقدمہ دائر کر دیا لیکن جلد ہی ہار گیا اور قاضی صاحب نے اپنے حقے کو چاندی کی موٹھ لگالی اور اخبار کے مالک بن بیٹھے۔ جب دوسری جنگ عظیم چھڑی تو انہوں نے 'ہیر پھیر' نامی ایک اور روزنامہ جاری کیا اور ساتھ ہی چھوٹا سا اپنا پریس بھی لگوالیا۔ اس وقت قاضی صاحب کے پاس اچھے پیسے ٹکتے تھے۔ وہ ہمیشہ کھدر میں ملبوس رہتے مزاحیہ کالم نویس میکائیل نے ایک روز انور کو بتایا کہ قاضی صاحب کی بیوی بھی کھدر پہنتی ہے اور سبزی ترکاری لینے خود سفید برقعہ اوڑھ کر بازار جاتی ہے۔

میکائیل احمد کانگڑے کا رہنے والا تھا۔ جہاں نوعمری میں ہی اس کا سارا خاندان ۱۹۰۴ء کے بڑے بھونچال کی نذر ہو گیا تھا۔ ان دنوں وہ دہلی میں اپنے چچا کے ہاں تھا۔ اس کے بعد چچا نے اس کی پرورش شروع کی اور جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اسے یہ کہہ کر گھر سے نکال باہر کیا کہ

"میاں! اب، ماشاءاللہ جوان ہو اپنی روزی آپ پیدا کرو۔"

وہاں سے نکل کر میکائیل سیدھا کلکتے پہنچا۔ رنگینہ ہوٹل میں لوگوں کو چائے پلانے پر نوکر ہو گیا۔ ہوٹل کا مالک اسے روٹی کپڑے کے علاوہ تین روپے ماہوار دیتا کام دھندے کے علاوہ میکائیل نے ہوٹل کے دہلوی باورچی سے اردو کی تعلیم لینا بھی شروع کر دی اس کے عوض باورچی اس سے علی الصبح انگیٹھیاں سلگانے کا کام لیتا تھا۔ یہاں اس پر چوری کا الزام لگا اور اسے دو ماہ جیل کاٹنا پڑی۔ جیل سے چھوٹ کر وہ ایک ایسے آدمی کے ہتھے چڑھ گیا۔ جس نے اس سے لوگوں کی جیبیں

کاٹنے کا کام لینا شروع کر دیا۔ میکائیل کو بہت جلد اس پیشے سے نفرت ہو گئی اور وہ اپنے آپ کلکتہ کے ایک مشہور یتیم خانے میں داخل ہو گیا۔

یہ یتیم خانہ ایک بہت بڑے قومی ادارے کی طرف سے چل رہا تھا۔ جس کا گنجا سیکرٹری بچوں کو بڑی بے دردی سے مارا کرتا تھا پہلے ہی روز اس نے اپنا رعب جمانے کے لئے میکائیل کو بنیاں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّایا۔

"کیوں بے حرامی! اس سے پہلے کہاں تھا؟"

اور تڑاخ سے ایک لپڑ رسید کر دیا۔ میکائیل کی آنکھوں میں بجلی سی لہرا گئی۔ ہاتھ پاؤں کا ویسے بھی ذرا مضبوط لڑکا تھا۔ اس کے گرہ کٹ استاد نے بھاگنے چھپنے کے اسے کئی داؤ سکھا دیئے تھے۔ میکائیل غصے میں پاگل سا ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ قریب ہی میز پر پڑی ہوئی شیشے کی دوات اٹھائی اور پوری قوت سے گنجے سیکرٹری کی ناک پر کھینچ ماری گنجے سیکرٹری کا منہ نیلا پڑ گیا اور وہ ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گیا۔ پھر وہ دیوانے کتے کی طرح میکائیل کی طرف لپکا۔ لیکن میکائیل سیڑھیاں پھلانگتا سڑک کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا۔

یتیم خانے سے بھاگنے کے بعد ایک مسجد کے امام صاحب نے اسے روٹیاں اکٹھی کرنے پر اپنے پاس رکھ لیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے اردو فارسی کا سبق بھی دینے لگے۔ میکائیل کو بڑی خوشی ہوئی کہ چند ہی سالوں میں وہ اردو فارسی لکھ پڑھ سکے گا۔ مگر بدقسمتی نے اس یتیم بچے کا یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا، تیسرے ہی مہینے یتیم خانے کے گنجے سیکرٹری صاحب نے وہاں آن شکل دکھائی۔ میکائیل روٹیاں لے کر مسجد میں داخل ہو رہا تھا۔ کہ گنجے سیکرٹری کی اس پر نظر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا وہ ڈنڈا اٹھا کر اس کی طرف بھاگا۔ لیکن میکائیل روٹیوں کی چنگیر وہیں پھینک ایک بار پھر کلکتے کے پُرہجوم بازاروں میں گم ہو چکا تھا۔ اب کے اس نے کلکتہ ہی چھوڑ دیا۔

کپڑے کے ایک بہت بڑے تاجر اسے اپنے ساتھ رنگون لے گئے اور وہاں اسے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول سے واپس آ کر وہ گھر کا سارا کام دھندا

نرتا۔ دن میں دوبار کوٹھی برآمدے کا فرش دھوتا اور شام کو تھوڑا سا وقت نکال کر مراد آباد کے ایک بوڑھے تمباکو فروش سے اردو فارسی کا درس لیتا۔

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ موٹروں کی ایک کمپنی میں ملازم ہوگیا کچھ عرصہ بعد اس کی ملاقات قاضی صاحب سے ہوگئی۔ اسے اردو لکھنے پڑھنے کا بچپن سے شوق تھا۔ قاضی صاحب نے مستقبل کے متعلق الفاظ کا کچھ ایسا سنہرا جال بُنا کہ میکائیل صاحب اس میں پھنس گئے۔ شروع شروع میں ان کا کام بھی رات رات بھر خبروں کا ترجمہ کرنا اور کاپی جوڑنا تھا۔ لیکن کچھ مدت بعد جب مسلسل شب بیداری سے ان کی کھوپڑی سے بال گرنے لگے تو قاضی صاحب نے انہیں مزاحیہ کالم نویس کے عہدے پر فائز کر دیا۔

میکائیل بیس سال سے دونوں اخبارات کے لئے مزاح نویسی کر رہا تھا اور اس نے لوگوں کو اس قدر قہقہے بہم پہنچائے تھے۔ کہ اس کی اپنی زندگی پرانی قبر کا کھنڈر بن کر رہ گئی تھی۔ قاضی صاحب بیس سال سے اسے سو روپیہ ماہوار عطا کر رہے تھے۔ اور میکائیل کا کہنا تھا۔ کہ وہ محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ قاضی صاحب اس کے شوق کو پوری طرح استعمال کر رہے تھے۔ میکائیل کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن وہ ستر سالہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ ہر وقت کانپتا رہتا تھا اور عینک اتارنے پر وہ بالکل اندھا ہو جاتا تھا۔ میکائیل بیحد بدصورت انسان تھا اس کا رنگ خاکی تھا۔ اور اگلے دو دانت اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ اور گھٹے ہوئے ماتھے پر داہنی جانب چوڑا سا مسہ تھا۔ اس کی شادی نہ ہوئی تھی۔ اور وہ تمام نشوں کا رسیا تھا۔ مگر تاڑی اس کا محبوب نشہ تھا۔ بلاناغہ کام سے فارغ ہو کر وہ تاڑی خانے جاتا اور پتلی اور گندی تاڑی کی بوتل چڑھا کر قلیوں، رکشا کھینچنے والوں اور سڑک کوٹنے والوں کے ساتھ مل کر ناچنا شروع کر دیتا۔ اور پھر بے سدھ ہو کر وہیں کہیں پڑ رہتا۔

انور، میکائیل کے عبرت انگیز انجام سے کانپ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا

کہ وہ اخبار میں زیادہ دیر کام نہیں کرے گا۔ کسی وقت میکائیل ایک آدھ لطیفہ سنانے کے بعد (اسے بے شمار لطیفے یاد تھے) قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا تو انور کو ان مسخروں کے کھوکھلے قہقہے یاد آجاتے۔ جو گھٹیا قسم کے سرکسوں کے باہر مچان پر کھڑے لوگوں کو ہنسانے کے لئے اچھل کود مچا رہے ہوتے ہیں۔

دفتر کا سب سے پرانا ملازم عبدل میاں تھا۔ قاضی صاحب کہا کرتے تھے۔

"جب عبدل میاں پہلے روز یہاں آیا تھا۔ تو اس کے گلے میں ریشمی رومال تھا۔

اور اب عبدل میاں کے گلے میں چمڑے کا پٹا تھا۔ جس کی ایک ایک زنجیر دفتر کے ہر آدمی کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ اسے دفتر سے پریس، پریس سے سیکرٹریٹ اور وہاں سے ریلوے اسٹیشن اور ریلوے سٹیشن سے بندرگاہ کی طرف بھگاتے رہتے تھے عبدل کے بال بالکل سفید تھے اور نچلے جبڑے کے سامنے والے تین دانت غائب تھے۔ اور وہ ہر وقت تھوکتا رہتا تھا۔ قاضی صاحب اسے بیس روپلی تنخواہ دیتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا۔ کہ پورے برما میں ان کے بعد اگر کوئی چلم میں تمباکو بھرنے کے فن سے واقف ہے تو وہ صرف عبدل میاں ہے۔ قاضی صاحب کے منہ سے یہ الفاظ سن کر عبدل پھولا نہ سماتا تھا۔ اور وہ اپنے اندر بیس سال اور قاضی صاحب کی نوکری کرنے کی ہمت محسوس کرنے لگتا تھا۔

'مجاہد' اور 'ہیر پھیر' کے اداریئے قاضی صاحب خود لکھا کرتے تھے۔ انور کے علاوہ وہاں دوسرے ہندوستانی لڑکے بھی کام کرتے تھے۔ ان میں تین چار ایسے تھے۔ جو بغیر معاوضہ کے وہاں جرنلزم کا عملی تجربہ حاصل کر رہے تھے۔ نائر نامی دبلا پتلا، مختصر سا زرد رو لڑکا رنگون کے ایک ناکام مرہٹہ وکیل کا بیٹا تھا۔ اسے اردو سے بڑی محبت تھی۔ اور انور بالکل نہ سمجھ سکا۔ کہ یہ محبت اسے کیوں کر ہو گئی تھی۔ بچپن ہی میں اس نے اردو بول چال میں کافی شدھ بدھ کر لی تھی۔ وہ رنگون یونیورسٹی کا بی۔ اے تھا۔ فسانہ آزاد کے کئی ٹکڑے اسے زبانی یاد تھے۔ وہ بھی قاضی صاحب کے ہاں مفت کام سیکھ رہا تھا۔ اور اس کا ارادہ پنجاب جا کر وہاں جرنلزم میں اپنا

مستقبل بنانے کا تھا۔ رنگون میں ہر آدمی اپنے مستقبل کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ گویا مستقبل کوئی گرہ کٹ ہو۔ اور ان کی جیب کاٹ گیا ہو۔ چنانچہ انور بھی غیر متوقع طور پر اپنے مستقبل کے متعلق سوچ بچار کرنے لگا۔ اگرچہ وہ گھر سے ایراوتی کی سیر کرنے نکلا تھا۔ لیکن یہاں پہنچ کر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ دریائے ایراوتی رنگون سے بہت دُور ہے اور اُس کے پانی میں گندہ تیل ملا ہوا ہے اور سارے شہر کی گندگی اس میں گرتی ہے اور بندرگاہ پر اس کی سطح پر سمپان، چھوٹی کشتیاں، کھینے والے، برمی اور چٹ گامی ملّاح رات کو باسی چاول کھا کر جیٹی کے کھردرے تختوں پر پڑ رہتے ہیں۔

دریا جب پہاڑوں سے نکلتے ہیں تو ان کا پانی شفاف ہوتا ہے۔ ان کی تڑپ سیمابی ہوتی ہے اور ان کی چھوٹی چھوٹی لہریں خلخال بجاتی ہیں۔ اور میدانوں میں ان کے پرسکون بہاؤ پر کشتی بانوں کے مسرور نغمے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن شہروں میں داخل ہوتے ہی ان کی تڑپ مرجاتی ہے۔ ان کی لہروں میں گندہ تیل اور غلاظت مل جاتی ہے اور مسرور نغمے تخلیق کرنے والے مانجھیوں کی آوازیں مشینوں اور جہازوں کی چیخوں میں ڈوب جاتی ہیں، شہر، دریاؤں کے ساتھ سوتیلی ماں ایسا سلوک کرتے ہیں۔ دریا شہروں کے مہمان ہوتے ہیں۔ شہروں نے اس انوکھی مہمان داری کا طریقہ کہاں سے سیکھا ہے؟

ایراوتی! اری او ایراوتی!! شہر نے یہ تجھ سے کیا سلوک کیا؟

برما کی ماں ایراوتی! تیری لہروں سے کھیلنے والے تیرے بیٹے کب تک باسی چاول کھائیں گے؟"

انور کو بھی رات کو کام سے فارغ ہو کر باسی چاول کھانے پڑتے تھے۔ لیکن وہ اپنی حالت سے مطمئن نہیں تھا۔ اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ وہ قاضی صاحب کی سرپرستی میں رہ کر میکائیل کی طرح اپنا مستقبل نہیں سنوار سکتا۔ لیکن فی الحال اسے قاضی صاحب کی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ بڑی تسلی سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا اور قاضی صاحب اس سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے اس کی رہائش گاہ کا انتظام بھی خود ہی کیا تھا۔ اگرچہ جنگ کے باعث مکانوں کی بڑی

دقت تھی۔ لیکن انہوں نے دفتر کے قریب ہی شیو گاؤں سٹریٹ کی ایک عمارت میں ایک کمرہ حاصل کر لیا۔ یہ کمرہ چوتھی منزل پر تھا۔ بلڈنگ باہر سے دیکھنے پر کافی کشادہ اور شاندار تھی۔ لیکن اندر چھوٹے چھوٹے کمروں اور غسل خانوں سے پھنسی ہوئی تھی۔ انور کا کمرہ بھی دوسرے کمروں کی طرح تنگ اور جھکی ہوئی چھت والا تھا۔ اس کا فرش بھی لکڑی کا تھا اور چھت بھی ——— ان دونوں میں تمیز آسان بھی تھی اور دشوار بھی۔ کمرے کی دیواریں سیل خوردہ تھیں اور پہلے کرایہ داروں کے بچے ان پر چوہے بلیوں کی تصویریں بنا گئے تھے۔ غسل خانہ بے حد تنگ تھا۔ اس کی بتی خراب تھی اور ٹونٹی سے سدا پانی بہتا رہتا تھا۔ وہاں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا۔ اور گیلے فرش پر کیڑے مکوڑے رینگا کرتے۔ غسل خانے سے ملحق باورچی خانہ تھا جو اس سے بھی چھوٹا تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ اندھیری اور پیچدار سیڑھیوں کی طرف کھلتا تھا۔ اور دوسرا دروازہ بازار کی طرف جس کے آگے آہنی جنگلے والی چھوٹی سی بالکونی تھی۔ انور کو تنہا کمرہ کبھی میسر نہ آیا تھا۔ گھر میں وہ ہمیشہ بہنوں اور بھائیوں کے درمیان سویا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ ایک کمرہ ایسا بھی ہو۔ جس کی تنہائیوں پر اس کے تصرف کی مہر ہو۔ جہاں وہ پڑھ سکے، لیٹ سکے، گا سکے، رو سکے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو قلابازیاں بھی لگا سکے۔ بس ایک خاموش و تنہا کمرہ جس کا دروازہ بند کر کے وہ اپنی آنکھیں بند کرے اور دروازے کے ساتھ لگ کر چپ چاپ بیٹھ جائے اور کچھ وقت کے لیے کنچن چنگا کی پہاڑیوں، شمالی ٹنڈرا کے برفانی میدانوں اور جنوبی افریقہ کے دلدلی جنگلوں میں نکل جائے ——— ایک کمرہ! خواہ وہ لالہ موسیٰ میں ہو خواہ ٹمبکٹو میں ——— ! لیکن اس کی یہ آرزو کبھی بار آور نہ ہوئی تھی۔

شیو گاؤں سٹریٹ کی اس بلڈنگ میں آ کر اس نے اپنے آپ کو ایک مختصر سے کمرے میں دیکھا تو اسے روحانی خوشی ہوئی۔ جیسے مدت کے بعد اسے اپنا گھر نصیب ہوا ہو۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کمرے کے فرش پر پرانی دری بچھا دی۔ اور دیواروں پر انگریزی ایکٹرسوں اور قدرتی مناظر کی تصویریں لٹکا دیں۔

نیلام گھر سے ایک چھوٹا سا لکھنے کا میز اور تین کرسیاں خرید لیں۔ چارپائی پہلے ہی سے موجود تھی بستر پر ڈالنے کے لئے ہلکے نیلے رنگ کا کپڑا خرید آگیا۔ جس میں ایک پردہ کاٹ کر سامنے بازار والے دروازے میں لٹکا دیا گیا۔ قاضی صاحب سے مالک مکان کو کہلوا کر غسل خانے کی بتی اور نلکہ ٹھیک کرایا گیا۔ جب کمرہ ہر لحاظ سے مکمل ہو گیا تو انور نے محسوس کیا کہ وہ کمرے میں کسی وقت بھی تنہا نہیں ہوتا۔ کمرے کی ہر شے اب اس کی دوست تھی اور اس کی آمد کا بے تابی سے انتظار کیا کرتی تھی۔ انور کے بالکل سامنے والے فلیٹ میں وزیر آباد (پنجاب) کا ایک انشورنس ایجنٹ رہتا تھا۔ چھوٹے قد، گٹھے ہوئے صحت مند گورے جسم اور چمکیلے بالوں والے اس پینتیس چھتیس سالہ آدمی کی ایک ٹانگ چھوٹی تھی اور وہ قدرے لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس کا کمرہ کافی سجا ہوا تھا۔ اور خوبصورت چیزوں کا انبار لگا تھا۔ زمین پر چھوٹا سا سرخ، زرد، سفید اور نیلی ٹکڑیوں والا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ غالیچے کے وسط میں بلورین سطح والی چھوٹے قد کی گول میز پڑی تھی۔ اردگرد براؤن رنگ کی چمکدار آرام کرسیاں رکھی تھیں۔ کونے میں لکھنے والی میز پر قلم دوات کے علاوہ سنہری جلدوں والی کتابیں بھی تھیں۔ دیوار کے ساتھ ایک الماری لگی تھی جو موٹی موٹی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ دیواریں تصاویر سے خالی تھیں۔ صرف ایک کیلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس پر ہوائی جہاز نیلے آسمان کے پس منظر میں غوطہ مارتے دکھایا گیا تھا۔ لیکن کمرے میں شاید سب سے زیادہ خوبصورت اور قیمتی شے پیتل کے جنگلے والا چمک دار پلنگ تھا۔ جسے چھت سے لٹکتی ہوئی ہلکے عنابی رنگ کی مسہری نے چاروں طرف سے ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ بے حد نرم تھا اور اس پر بیٹھنے سے آدمی گدیلوں میں ڈوب جاتا تھا۔ اس نوجوان آدمی کا نام سلیم تھا۔ سلیم ایک مدت سے رنگون میں انشورنس کا کام کر رہا تھا اور اس دوران میں وہ رنگون کے تمام بڑے بڑے آدمیوں سے مل چکا تھا۔ سلیم کے ہزاروں دوست تھے۔ لیکن اس نے کسی ایک کے ساتھ بھی اپنی دوستی کا اعلان نہ کیا تھا۔ اس نے آج تک کسی سے پائی ٹنک ادھار نہ لی تھی۔

اس لیے تمام لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ بے حد منہ پھٹ تھا اور کوئی بات دل میں چھپا کر نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ لوگ اس سے کسی قدر ڈرتے بھی تھے۔ اس نے اپنی روزمرہ کی زندگی کے چند اصول اور ضابطے ایک کاپی پر نوٹ کر رکھے تھے۔ جن پر وہ فولاد ایسی سختی سے عمل پیرا تھا۔ ہر رات، سونے سے پیشتر وہ کاغذ پنسل لے کر میز پر بیٹھ جاتا اور لکھ کر اپنے آپ سے اس قسم کے سوالات کرنے شروع کر دیتا۔

۱۔ میں نے آج کن کن لوگوں سے بات چیت کی؟

۲۔ کیوں بات چیت کی؟

۳۔ کیا وہ آدمی اس قابل تھے؟

۴۔ آج کتنے پیسے خرچ کیے؟

۵۔ کیوں کیے؟

۶۔ آج کا کوئی غیر معمولی واقعہ؟

۷۔ کیفیت وغیرہ۔

لیکن وہ کنجوس بالکل نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بالکل تنہا اور اکیلا تھا۔ اس لیے کہ اس نے زندگی گزارنے کا یہی ڈھنگ منتخب کیا تھا۔ پھر بھی ہفتے میں دو ایک بار اس کے ہاں دوستوں کا جمگھٹا لگتا۔ بیئر اور شراب کی بوتلوں کے کاگ اڑتے۔ اور رات بھر وہ ہنگامہ رہتا کہ انور کے لیے نیند پوری کرنا مشکل ہو جاتا۔ تقریباً ہر رات وہ گول میز کی بلوریں سطح پر گلاب کی سرخ پتیاں اور موتیے کی نازک کلیاں بکھیر کر بیٹھ جاتا۔ شہد ایسے بھورے چمکیلے رنگ کی بیئر سے شیشے کا جگ بھر کر قریب رکھ لیتا اور اپنے کسی نہ کسی ساتھی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے بیئر پینے لگتا۔ اس کے قہقہے بے حد طویل، صحت مند زندگی سے بھرپور اور بے ساختہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بیئر میں شراب بھی ملا لیتا تھا۔ پیتے وقت اس کا چہرہ پرسکون اور بالکل طبعی حالت میں ہوتا۔ گویا سادہ پانی پی رہا ہو۔ پینے کے بعد اسے کبھی بدمست حالت میں نہ دیکھا گیا تھا۔ بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ دوستوں کو رخصت کر کے دروازہ بند

کرتا۔ کاغذ پنسل نکال میز پر بیٹھ کر اپنا محاسبہ شروع کر دیتا۔ اور اس کے بعد بستر کے نرم نرم گدیلوں میں ڈوب کر گہری نیند میں کھو جاتا۔ پیچھے وزیر آباد میں اس کی تمام بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ بھائی برسرِ روزگار تھے پھر بھی وہ ہر مہینے ساٹھ روپے اپنی والدہ کو منی آرڈر کر دیا کرتا تھا۔ اس کی ماں نے اسے کئی بار شادی پر مجبور کیا تھا مگر اس نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا تھا۔ کہ وہ ابھی یہ جنجال مول لینا نہیں چاہتا۔ انور کے ساتھ اس آدمی کے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن اس نے کبھی انور کو بیئر کی دعوت نہ دی تھی۔

تیسری منزل کے ایک کمرے میں ایک پتلی لمبی اور کالی، مدراسی عورت رہتی تھی۔ اس کا خاوند کسٹم آفس میں کلرک تھا۔ اس عورت کے بچے درجن کے قریب تھے انور جب بھی وہاں سے گزرتا ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا۔ کوئی نہ کوئی بچہ رو رہا ہوتا اور عورت لمبے لمبے بال کھولے، آئینے کے سامنے کھڑی کنگھی کر رہی ہوتی۔ سامنے والے فلیٹ میں ایک برمی عورت کا کنبہ آباد تھا۔ انور نے اس موٹی اور سپاٹ چہرے والی بوڑھی عورت کو ہمیشہ اپنے کمرے کی دہلیز میں بیٹھے لمبا سگار پیتے دیکھا تھا۔ پہلی منزل کے سارے کمرے بنگالی اور چٹ گامی لوگوں نے آباد کر رکھے تھے۔ ان میں سے کوئی بیڑیاں بناتا تھا۔ تو کوئی سینما کی گیٹ کیپری کرتا تھا۔ کوئی بندرگاہ یا ریلوے سٹیشن پر قلی تھا۔ تو کوئی بنک میں چپڑاسی تھا۔ انور یہاں سے گزرتے ہوئے کبھی فلمی تانوں سے محظوظ ہوتا تو کبھی اسے لڑنے جھگڑنے اور زور زور سے کھانسنے اور تھوکنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ سامنے والی بلڈنگ کی چوتھی منزل میں ایک ایرانی عورت اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس عورت کا رنگ زرد قد کاٹھ لمبا اور ناک نقشہ بڑا تیکھا تھا۔ انور کے کمرے کی کھڑکی اس عورت کے کمرے کے بالمقابل کھلتی تھی۔ دوپہر کے وقت سو کر اٹھنے کے بعد جب گھڑی دو گھڑی کے لیے بالکنی میں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا تو وہ ایرانی عورت بھی بالکونی میں آ کر پردہ چن دیتی چنانچہ وہ اسے اپنے سجے ہوئے کمرے میں ادھر سے ادھر گھومتے، آئینے کے آگے کھڑے ہو کر یونہی بالوں کو سلجھاتے

سلجھاتے کبھی بل درست کرتے اور یا پھر بالکونی کی طرف منہ کر کے بیٹھ کر کچھ بنتے دیکھا کرتا۔ لیکن وہ ہمیشہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا کرتا۔ جب کبھی ان کی آنکھیں چار ہو جاتیں تو وہ گھبرا کر گلی میں جھانکنے لگتا۔ وہ بالکل بن بیاہی لڑکی کی طرح شرمیلا تھا۔ رات کو دفتر میں جب دو کاتبوں کو جنسی تعلقات پر بلا تکلف اظہارِ خیال فرماتے سنتا۔ تو اس کے کان کی لوئیں سرخ ہو جاتیں۔ اور پٹھوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ ہر کاتب جہاں بھی وہ رہتا تھا۔ اپنی بلڈنگ کی ایک ایک عورت کی عشقیہ داستانوں سے واقف تھا۔ یہ ایک اتفاق کی بات تھی۔ کہ ہر کاتب کی بلڈنگ میں فاحشہ عورتوں کا جال بچھا تھا۔ وہ مزے لے لے کر ان سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کرتے۔ کسی وقت انور کو ان پر بے حد غصہ آتا۔ آخر وہ ہر وقت عورتوں کی باتیں کیوں کرتے رہتے ہیں؟ اور کسی وقت اسے اپنی بزدلی پر ندامت محسوس ہوتی۔ آخر وہ عورت کو دیکھ کر لڑکیوں کی طرح چھوٹی موٹی کیوں بن جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو۔ وہ اس ایرانی عورت کے لمبے قد، پروقار چال ڈھال اور سنجیدہ مگر حسین چہرے سے بہت مرعوب تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس کی عزت کرنے لگا تھا۔ اسے اپنے کمرے میں خاموشی سے اِدھر اُدھر حرکت کرتے دیکھ کر وہ اپنی بالکونی میں یوں موڈب ہو کر بیٹھ جاتا۔ گویا شور مچاتے لڑکوں کی جماعت میں اچانک استاد صاحب آ گئے ہوں۔

ان کے ہاں انور نے کبھی کسی مرد کو نہ دیکھا تھا۔ اس خاموش کمرے میں وہ ایرانی شہزادی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ تنہائی و یکسوئی میں زندگی گزار رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس خیال پر بہت حیران ہوتا کہ وہ لوگ آخر گزارہ کس طرح کر رہے ہیں؟ ایک دن وہ منہ ہاتھ دھو کر بالکونی میں سگریٹ سلگا کر بیٹھا تھا۔ کہ اسے محسوس ہوا کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو سامنے وہی ایرانی عورت پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ انور ایک دم منتشر سا ہو گیا۔ اور بدحواسی کے عالم میں گلی میں دیکھنے لگا۔ دوسرے روز پھر یہی حادثہ پیش آیا۔ تیسرے روز انور بھی ہولے سے مسکرا دیا۔ اس عورت کی بوڑھی ماں شام کو عموماً

مکان کے نیچے گلی میں دوسری برمی عورتوں کے ساتھ بیٹھی چھالیہ کترتی رہتی تھی۔ ایک روز انور دفتر جانے کے لیے گلی میں اترا تو اس عورت نے اسے پاس بلایا۔

انور کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شاید اس کی ماں کو سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ کاش اس گلی میں مکان نہ لیتا۔ وہ رنگون محض بدنامی مول لینے نہیں آیا تھا۔ قاضی صاحب کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کہیں گے۔ ان پر تو اس کی شرافت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس بوڑھی عورت تک پہنچتے پہنچتے انور نے کئی بار منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا۔

"بیٹا! ذرا ایک تار تو پڑھ دینا۔"

انور بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر کہا

"لاؤ اماں۔"

"بیٹا وہ اوپر رکھا ہے۔ تم بھی اوپر ہی آجاؤ۔"

انور پہلے تو جھجکا۔ لیکن جب بوڑھیا دو تین سیڑھیاں چڑھ گئی۔ تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھنے لگا۔ دروازے کے باہر وہ رک گیا۔

"اندر آجاؤ بیٹا۔"

کمرہ بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ فرش پر بیلدار بڑا ترکمانی قالین بچھا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگی ہوئی کرسیوں پر پھول دار گدے پڑے تھے۔ دیوار پر رضا شاہ پہلوی اور ملکہ ایران کی تصویر لٹک رہی تھی۔ سنگار میز کریم کی شیشیوں اور پاؤڈر کے ڈبوں سے اٹا ہوا تھا۔ اور وہ ایران کی شہزادی قالین کے ایک طرف بیٹھی سفید رومال پر کچھ کاڑھ رہی تھی۔ اماں کے ساتھ انور کو دیکھ کر وہ زیر لب مسکراتے ہوئی کھڑی ہو گئی۔ انور کو محسوس ہوا کہ اس کا قد واقعی شاندار ہے۔ اور وہ بہار کے پھول کی طرح نازک اور تر و تازہ ہے۔

"بیٹی درخشاں! وہ تار پڑھوا لو۔"

اتنا کہہ کر بوڑھیا پھر نیچے اتر گئی اور انور پر گھبراہٹ سی طاری ہو گئی۔ وہ

سوچ رہا تھا الٹے پاؤں واپس چلا جائے کہ ایک پتلی اور نازک آواز نے کہا۔

"تشریف رکھیئے۔"

اور انور بچوں کی طرح ہنستے ہوئے چپ چاپ بیٹھ گیا۔

"آپ کا کمرہ بہت خوبصورت ہے۔" انور نے یونہی گردن گھما کر کہا۔

"آپ کا کمرہ بھی خوبصورت ہوگا۔" وہ ہنس رہی تھی۔ اور انور قالین پر بیٹھا سرو کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی آہستہ سے انور کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"آپ گھبرائیے نہیں، میں نے خود آپ کو بلایا ہے۔"

انور نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ نے ـــــ آپ نے بلایا تھا؟"

"جی ہاں ـــــ میں نے اور صرف میں نے۔"

اس نے بڑی خوب صورتی اور بھولپن سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں جھپکا کر کہا

انور اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"مگر ـــــ مگر کیوں؟"

"کیوں!" درخشاں نے نازک گردن جھکا لی۔

"اس لیے کہ آپ سے ملنے کو جی چاہتا تھا۔"

"اوہ ـــــ اچھا اچھا۔"

انور احمقوں کی طرح ہنسنے لگا ہنسنے کے بعد اس نے پھر گردن جھکا لی۔ اور قالین پہ سرو کے درختوں کو تکنے لگا۔

"آپ بہت بھولے ہیں۔"

"جی ـــــ بھولا؟ اوہ ـــــ جی ہاں، جی نہیں۔"

انور کو محسوس ہوا۔ اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی اور وہ اور زیادہ بدحواس ہو گیا۔ درخشاں قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کے بازو اس کے سر کے نیچے تھے اور وہ انور کو شوخ و متبسم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ، مجاہد، اخبار میں کام کرتے ہیں؟"

"جی ہاں،

"آپ کی شادی ہو چکی ہے؟"

"جی ـــ جی نہیں"

"تو پھر کرواتے کیوں نہیں؟"

انور نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر جا کر کراؤں گا"

ایرانی شہزادی بے اختیار قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ انور کو ایک دھکا سا لگا اس نے محسوس کیا کہ اس عورت کے خوبصورت چہرے اور قد کے مقابلے میں اس کا قہقہہ بھدا اور بدصورت تھا۔ اس قہقہے میں آواز کم اور انٹڑیوں کی جنبش زیادہ تھی جب انور نے اس کا مسکراتا ہوا پھول ایسا چہرہ دیکھا۔ تو وہ قہقہے کو بالکل بھول گیا۔

"آپ ہنسی کیوں؟"

"ایرانی شہزادی ہمک کر اٹھ بیٹھی اور اپنا چہرہ انور کے چہرے کے بالکل قریب لا کر بولی۔

"اس لیے کہ تم بالکل بچے ہو"

انور مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ جیسے اسے جادو کی چھڑی چھو گئی ہو۔ اس کا چہرہ خود بخود اس پھول ایسے پاکیزہ اور معطر چہرے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ کس مقصد کے لیے اپنا چہرہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا؟ اسے اس کی بالکل خبر نہ تھی ایرانی شہزادی نے ایک دم اپنا چہرہ پیچھے ہٹا لیا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

"اوہوں ـــ پہلے اپنی جامہ تلاشی دو"

"جامہ تلاشی؟"

"ہاں ـــ اور ایرانی شہزادی اس کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔

ذرا دیکھوں تو کچھ مال وال بھی ہے یا نہیں"

انور سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گیا۔ اسے ایکا ایکی یوں دھکا سا لگا۔ گویا چھت سمیت وہ چوتھی منزل سے نیچے گلی میں آ رہا ہو۔ ایرانی شہزادی اس کی جیبیں ٹٹول رہی تھی اور انور کو اس کے خوبصورت چہرے پر بے شمار مہاسوں کے سیاہ داغ نظر آنے لگے تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہ جسم جو اس سے پیشتر چمپئی تھا۔ اور کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ اب داغدار سانپ کی طرح زہر کے رنگ ایسا ہو رہا ہے۔ وہ ڈر کر اٹھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

گلی میں آ کر اس نے اس بوڑھی عورت کو برمی عورتوں کے درمیان بیٹھے چھالیا کترتے دیکھا۔ اور اب اس پر تار پڑھانے کی حقیقت کھلی۔ اس نے فٹ پاتھ پر زور سے تھوکا اور غصے کی حالت میں تیز تیز قدم اٹھاتا۔ دفتر کی طرف چل پڑا رات گئے وہ تھکا ہارا گھر آیا تو بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے۔ اس بچے کی طرح جس کی خوبصورت کپڑوں والی گڑیا گندی نالی میں گر پڑی ہو۔

اس کے بعد وہ کبھی بالکنی میں نہ بیٹھ سکا۔

۴

جنسی اعتبار سے ہر غیر معتدل بڑے شہر کی طرح رنگون میں بھی لائسنس یافتہ رنڈیوں کی اپنی الگ آبادی تھی۔ لیکن جنگ اور معاشی بدحالی کے باعث جسم فروشی کے خفیہ اڈے گلی گلی قائم تھے۔ رنڈیوں نے جنوب مشرقی رنگون کی ایک کشادہ اور لمبی گلی اناپورنا سٹریٹ کو آباد کر رکھا تھا۔ اس گلی میں پان سگریٹ، شراب اور تاڑی کی دوکانیں تھیں۔ یہاں کاروبار سرِ شام کھل جاتا اور رات بھر جاری رہتا۔ اناپورنا سٹریٹ میں سے گزرتے ہوئے لوگوں کے چہرے اوپر کو اٹھے ہوتے۔ اور وہ ہر تیسرے قدم پر ایک دوسرے سے ٹکرایا کرتے۔ تاڑی خانوں میں دیا بتی جلتے ہی شور وغل پیدا ہو جاتا۔ رکشا کھینچنے والے قورنگی، بندرگاہ پر سامان ڈھونڈنے والے قلی۔ رنڈیوں کے دلال، ریڑیوں پر بانس کی پنکھیاں اور ناریل کی ڈوئیاں بیچنے والے برمی اور مدراسی مزدور، فٹ پاتھ پر سوکھی پھلی کا اچار فروخت کرنے والی بوڑھی عورتیں اور مرد مٹی کے آب خوروں میں چاولوں کی پیچھ کے رنگ کی تاڑی لے کر دوکان کی سیڑھیوں یا سڑک کے عین وسط میں بیٹھ جاتے۔ اور تاڑی کے پہلے گھونٹ پر ہی ان پر مدہوشی کی حالت طاری ہو جاتی۔ اور وہ

ایک دوسرے سے لپٹ جاتے یا غصیلی آواز میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے۔ برمی بنگالی، مدراسی، پنجابی مرہٹہ، گجراتی رنڈیاں اپنی سجی ہوئی کھڑکیوں میں بجلی کے قمقموں کی رنگا رنگ روشنی میں بیٹھی رہتیں اور متبسم ہونٹوں سے لوگوں کو اپنی طرف بلایا کرتیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے چھوٹے چھوٹے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں گلی میں چھوڑ رکھی ہوتیں جو راہ چلتے لوگوں کو روک کر اوپر چلنے پر آمادہ کیا کرتیں۔ جب تماش بینوں کی کوئی منڈلی کسی بالا خانے کا رخ کرتی تو وہاں طبلے کی تھاپ کے ساتھ ایک دم گھنگھروؤں کے چھنا کے سنائی دینے لگتے اور گانے کے بیجان سُر بھونڈے قہقہوں اور فحش آوازوں کے شور میں ڈوبنے ابھرنے لگتے۔ پولیس کے آدمی سیاہ وردیوں میں ملبوس رات بھر گلی میں گشت لگایا کرتے۔ کسی جگہ معمولی سا بھی جھگڑا ہوتا تو وہ ڈنڈے پکڑ کر اس طرف عقاب ایسی تیزی کے ساتھ لپکتے لڑنے والوں کو گھسیٹ کر ایک طرف لے جاتے اور چار پانچ آنے جھاڑ کر انہیں چھوڑ دیتے اور چڑوں کی مانند بازو پھلا پھلا کر اپنی مٹر گشت شروع کر دیتے۔ ناردے اور ہنگری کے اردگرد ہٹلری فوجیں بے گناہ عوام کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں اور اناپورنا سٹریٹ میں ہندستانی اور برمی عوام سڑک کے بیچ میں بیٹھ کر مٹی کے کوزوں میں تاڑی پی رہے تھے اور ایک دوسرے کا منہ چوم رہے تھے اور ایک دوسرے کے منہ پر تھوک رہے تھے۔

ویسے بھی رنگون میں ابھی جنگ کا خطرہ نہیں تھا اور کلکتے کی طرح یہاں کی راتوں نے بلیک آؤٹ کا ماتمی لبادہ ابھی نہیں اوڑھا تھا۔ بلکہ رنگون کے تمام ہوٹل ساری رات کھلے رہتے اور منچلے نوجوان اور زیادہ عمر کے بوڑھوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ انور کو دیکھ کر کسی قدر تعجب ہوا کہ رنگون میں بعض بازاروں میں صرف رات کو کاروبار ہوتا تھا۔ ان بازاروں کو نائٹ بازار کہا جاتا تھا۔ چنانچہ یہاں رات کے کسی بھی لمحے اسپرین سے لے کر چارپائیوں کا بان تک مل سکتا تھا۔

مارچ سے لے کر اکتوبر تک کا عرصہ برسات کا موسم کہلاتا تھا۔ اس دوران میں

موسلا دھار بارشیں ہوتی۔ لمبی لمبی جھڑیاں لگتیں اور سورج کئی کئی دن نظر نہ آتا۔ سڑکوں کی تعمیر کچھ اس ڈھب سے ہوئی تھی کہ مینہ کا پانی ایک جگہ بالکل نہ رکتا تھا۔ شہر میں گھاس، پھول اور پیڑوں کی فراوانی تھی اور ہر خالی جگہ کو ہرے بھرے سبزے نے ڈھک دیا تھا۔ قریباً ہر سڑک کی پیدل روشوں پر گھنے درختوں کے سائے تھے۔ اور بارش کا رکا ہوا پانی سدا ٹپکتا رہتا تھا۔ باغوں میں نرم نرم گھاس کے خوشے مرطوب ہوا میں لہرایا کرتے اور کھنڈرے لڑکوں کی ٹولیاں ننگے پاؤں فٹ بال کھیلا کرتیں۔ شہر سے باہر نکلتے ہی دھان کے ہریالے کھیتوں اور بانس، سپاری و ساگوان اور ناریل کے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں جا بجا گہرے سبز پانی کی پرسکون جھیلیں تھیں جن کی سطح چوڑے چوڑے پتوں نے ڈھانپ رکھی تھی اور جن کے دلدلی کناروں پر ہلکے نیلے، زرد اور سفید رنگ کے کنول کے نازک پھول ہوا کے لطیف جھونکوں میں ڈولا کرتے تھے۔ اونچے نیچے ٹیلوں پر گنجان درختوں کے درمیان سے ہو کر جانے والی چھوٹی چھوٹی پیچدار روشوں پر سرخ رنگ کی بجری چمکا کرتی۔ ناریل کے اونچے درختوں پر رتنا کلی اور جوہی کی سبز پتوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں اور لکڑی کے خوبصورت پلوں کے نیچے برساتی نالے شور مچاتے، پتھروں سے ٹکراتے گزرتے تھے۔ آم کے درختوں تلے لوہے کے بنچ پڑے رہتے اور گھنیری شاخوں میں مینہ کی پھوار کے ساتھ کوکوں کی مدھر پکار گونجا کرتی۔ برسات سے عارضی طور پر محفوظ رہنے کے لئے کئی ایک جگہوں پر پناہ گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی گول اور ڈھلوانی چھتیں لکڑی کی تھیں اور بدھی مندروں کی یاد دلاتی تھیں۔ ان کی جالی دار دیواروں پر جنگلی بیلوں کے سبز پردے لہرایا کرتے۔ شام کے سمے جب کبھی موسم کھلتا۔ تو لوگ موٹروں، بند گھوڑا گاڑیوں اور سائیکلوں پر سوار جھیل کنارے چہل قدمی کو آنکلتے اور اونچے نیچے ٹیلوں کے پیچدار موڑوں اور ہری بھری خودرد گھاس پر ساڑھی پوش بنگالی، مدراسی اور گجراتی عورتیں تتلیوں کی طرح گھومنے لگتیں۔ ان کے درمیان کہیں کہیں برمی عورتوں کے چھپٹی جسم اور زرد، سرخ، نیلے لبنگے بھی لہرایا کرتے۔ جھیلوں کے آس پاس بانس کے گنجان درختوں تلے مسرور قہقہوں کی آوازیں

سنائی دینے لگتیں۔ مدراسی اور برمی خادمائیں بچوں کو گاڑیوں سے نکال گھاس پر کھیلنے کے لیے چھوڑ دیتیں اور خود بیٹھ کر سگار وغیرہ پینے لگتیں۔ اور اپنی مالکنوں کی اچھی اور بری عادات پر تیز اور تیکھی آواز میں تبصرہ شروع کر دیتیں۔ اس وقت اگر اچانک بارش شروع ہو جاتی۔ تو باغ میں ساڑھیاں لہنگے پاجامے اور کوٹ عارضی پناہ گاہوں کی طرف بھاگنے لگتے۔ خادمائیں بچوں کو گاڑیوں میں ڈال گھنے درختوں کے سائے میں لے جاتیں۔ اور باغ کے باہر کاروں کے مڈگارڈوں پر بیٹھ کر بیڑیاں پینے والے ڈرائیور اندر گھس کر کھڑکیوں کے شیشے چڑھا لیتے۔ تیز بارش میں جھیل کی سطح پر ہلکی ہلکی دھند سی پھیل جاتی اور کنول کے نازک پھول سرسبز پتیوں کے درمیان کانپنے لگتے۔

برسات، برسات اور لگاتار برسات کی وجہ سے برما کی ہر شے سدا مرطوب اور نمدار رہتی۔ یہ رطوبت، نمی اور سیلن وہاں کے لوگوں کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی۔ برمی لوگ عام طور پر سست اور بے حد کاہل الوجود تھے۔ وہ تھوڑا سا کام کرنے کے بعد فوراً سگار سلگا لیتے اور چائے کی پیالی لے کر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے پر اپنے کام کی دقتوں کا اظہار شروع کر دیتے۔ اگر انہیں کسی کوٹھی کے اکھڑے ہوئے دروازے کی مرمت کرنا ہوتی تو وہ سب سے پہلے وہاں اپنے لیے بارش سے بچاؤ اور چائے پینے کے لیے چھوٹی سی جھونپڑی تعمیر کرتے۔ اکثر زمیندار دھان کی پنیریاں تو خود بوتے لیکن کٹائی کے لیے مدراسی مزدوروں کی خدمات حاصل کرتے۔ دفتروں میں برمی کلرک سارا دن لطیفہ بازی کرتے رہتے۔ انہیں چٹ پٹے کھانوں سے بھی بے حد رغبت تھی۔ بریانی اور پھلاؤ ان کا من بھاتا کھاجا تھا۔ سوکھی مچھلیوں کو ناریل کے تیل اور قسم قسم کے گرم مصالحوں میں بسا کر وہ مٹی کے مٹکے میں ڈال اس کا منہ بند کر دیتے یہ مٹکا کئی روز تک زمین میں دفن رہتا اور جب باہر نکال کر اس کا منہ کھولا جاتا۔ تو اس کی بدبو دو میل کے رقبے کو گھیر لیتی۔ اس مچھلی کو برمی زبان میں "پنی" کہا جاتا۔ پنی پر ہر ہر برمی ٹوٹ کر گرتا تھا۔ مچھلیوں کے علاوہ ان کی روزمرہ خوراک

میں کیچوے کنکھجورے اور مینڈک بھی شامل تھے۔ جنہیں وہ مزے لے لے کر کھایا کرتے۔ ان کا قومی لباس ایک دھوتی، چپل، دھوتی میں اندر کیا ہوا کرتہ اور سر پر باندھنے والا رومال تھا۔ برما کا ہر آدمی وزیر اعظم سے لے کر ریلوے قلی تک اپنا قومی لباس ہی پہنتا تھا۔ ان کے رہن سہن کا طریقہ کافی سادہ تھا۔ ان کے گھروں میں بانس کے تین چار صندوقوں چند لیک کرسیوں اور لکڑی و چینی کے برتنوں کے علاوہ زیادہ سامان بالکل نہ ہوتا تھا۔ برمی عورتیں البتہ بناؤ سنگار کی شوقین تھیں۔ انہیں پھولوں اور ہیرے جواہرات کی انگوٹھیوں اور بندوں سے محبت تھی۔ ہر برمی عورت کو اپنے بالوں اور چہرے کی خوبصورتی کا بڑا خیال رہتا۔ چہرے پر وہ رات کو خاص قسم کی لکڑی کا برادہ دتنا کھا پانی میں گھول کر ملتیں۔ جو ان کی جلد کو ملائم اور چمکدار بنا دیتا۔ بالوں کو بھی وہ کسی خاص بوٹی کے پانی میں ہر دوسرے، تیسرے روز دھوتیں۔ ہر برمی عورت کے بال گہرے سیاہ ملائم اور بے حد لمبے ہوتے تھے۔ جنہیں وہ گول اور بڑے خوبصورت جوڑے کی شکل میں بنا کر رکھتیں۔ ان میں پان اور تمباکو نوشی کی عادت بھی عام تھی۔ رنگون میں ہر دوسری عورت راہ چلتے سگار پیا کرتی جو لمبا اور موٹا ہوتا تھا۔ کنواری لڑکیوں کو پان اور تمباکو سے دور رکھا جاتا۔ لیکن شادی کے بعد دوسرے روز ہی وہ بھی پان منہ میں ڈال سگار سلگا لیتیں۔

رنگون میں صوبہ سرحد کے سوداگر پٹھانوں کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔ یہ لوگ سر پر بڑے بڑے پگڑ باندھے تلے ستاروں والی واسکٹیں زیب تن کیے رنگون کی بارکوں میں بیٹھے نمازیں پڑھا کرتے۔ منہ سڑک کی طرف کیے ڈھیلا کیا کرتے اور یا اپنی بادبانی شلواریں لہراتے سڑکوں پر گشت لگایا کرتے۔ پہلی یا دوسری تاریخ کو ان کی ٹولیاں سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے باہر منڈلایا کرتیں۔ اور مقروض کلرک دفتر کی کھڑکیوں میں سے انہیں خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا کرتے

ایک روز انور اور میکائیل احمد رات کو کام ختم کرنے کے بعد تھوڑے وقفے کے لیے دفتر اور پریس کے درمیان فٹ پاتھ پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے کہ دفعتہً

میکائیل نے گردن اٹھا کر چوک کی طرف دیکھا۔

"ارے ——— وہ یہاں بھی آگیا؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

پھر وہ گھبرا کر اٹھا اور دفتر میں گھستے ہوئے انور کو بتاتا گیا۔ اگر کوئی اس کے متعلق دریافت کرے تو وہ کچھ نہ بتائے۔ انور ابھی تک کچھ نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ میکائیل کی اس اچانک گھبراہٹ پر حیران ہی ہو رہا تھا کہ ایک اونچا لمبا پٹھان اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور ایک ہاتھ سے شلوار کا پائنچہ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"خوبائی او ——— او آدمی کدر اسے؟"

"کون آدمی؟" انور نے بناوٹی لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب معاملے کی صحیح نوعیت سے باخبر ہو چکا تھا۔

"خو او آدمی ——— می کیل۔ جو اور لکھتا اسے۔"

"وہ چھٹی گیا ہے۔"

"خو تم جھوٹ بولتا ہے۔"

"ہم سچ بولتا ہے۔"

پٹھان مونچھوں کے سرے بانٹنے لگا۔

"کب آئے گا؟"

"تین روز بعد آئے گا۔"

پٹھان انتہائی مایوسی کی حالت میں وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اچا بائی ام پرسوں پھر آئے گا۔ او ام سے بچے گا نہیں ——— آں۔"

جب وہ چوک پار کر گیا تو کچھ دیر بعد میکائیل سہمے ہوئے چوہے کی طرح دبے دبے باہر نکلا۔

"یار یہ لوگ میرا خون چوس گئے ہیں۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"قرضہ کتنا ہے۔"

"کچھ نہ پوچھو۔ آج سے ایک سال پہلے پچاس روپے اس پٹھان سے قرض لیا

تھا۔ اور آج تک دو سو روپے ادا کر چکا ہوں۔ میں نے کئی مرتبہ قرضہ چکانے کی کی کوشش کی لیکن اس نے ہمیشہ اصل زر وصول کرنے سے انکار کر دیا۔"

"وہ کیوں!"

"اس لیے کہ اس کا سود درسود چلتا رہے۔"

میکائیل احمد کے علاوہ پریس کے دو تین مستری بھی پٹھانوں کے مقروض تھے اور ہمیشہ ان کے سائے سے بھاگا کرتے تھے۔ انور نے سوچا کہ آخر یہ لوگ پٹھانوں سے قرض لیتے کیوں ہیں! بعد میں اسے معلوم ہوا کہ میکائیل کو شراب تنگ کرتی تھی پریس کے ایک مستری کا کسی رنڈی سے یارانہ تھا اور دوسرے مستری صاحب افیم کا شوق فرمایا کرتے تھے۔ یہ تینوں حضرات اپنے تمام جان پہچان والوں سے قرض مانگ مانگ کر کئی روپے ہضم کر چکے تھے۔ اور جب ان کے دوستوں نے مزید قرض دینا بند کر دیا تو انہوں نے سود خور پٹھانوں کا دامن تھاما۔ سود خور پٹھان چونکہ ہر آدمی پر اعتبار کرتے ہیں (کیونکہ انہیں اپنے اوپر اعتبار ہوتا ہے) اس لیے انہیں فوراً وہاں سے قرض ملنے لگا۔ اور ساتھ ہی ساتھ سود بھی چڑھنے لگا۔ اب سود اتنا اونچا چڑھ گیا تھا کہ اس کا ایک دم نیچے اترنا محال تھا۔ لہذا پٹھان ان تینوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ آگے آگے بھاگ رہے تھے۔

انور اور نائر میں بہت جلد دوستانہ ہو گیا۔ انور کو اس مرہٹہ لڑکے کی خاموش طبیعت اور معصوم چہرہ بے حد پسند تھا۔ اس کی آواز کمزور اور باریک تھی۔ وہ بہت کم گو تھا اور بولتے وقت اس قدر احتیاط سے بولتا۔ گویا کانچ کے برتن اٹھائے بھیڑ میں سے گزر رہا ہو۔ اس کی ہلکے پیازی رنگ کی آنکھوں میں ہمدردی اور محبت کی چمک تھی۔ پتلی پتلی مخروطی انگلیاں لڑکیوں ایسی تھیں اور زرد گالوں کے نقوش مدھم دکھائی دیتے تھے۔ نائر بھی انور کی چپ چاپ اور شرمیلی طبیعت سے مانوس ہو گیا چنانچہ چھٹی کے روز یا جب کبھی انہیں موقع ملتا۔ وہ دونوں شہر سے باہر جھیلوں پر سیر کرنے نکل جاتے۔ ایک روز نائر نے بتایا۔ کہ اس کی طبیعت اکثر خراب

رہتی ہے۔ اور اس کے باپ کا ارادہ اسے میسور کے پہاڑ پر بھیج دینے کا ہے۔

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ دونوں ایک جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کے سروں پر بانس کے پیڑ کی نازک ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ سامنے کنول کے ان گنت پھول جھیل کی گہری سبز سطح پر کھلے ہوئے تھے۔ نائر نے ایک آدھ کھلے کنول کے نیم وا ہونٹوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ رنگون چھوڑ دینے سے میری تعلیم میں حرج ہو گا۔ میں بہت جلد پنجاب پہنچ کر کسی اخبار کے ادارتی عملے میں شریک ہونا چاہتا ہوں — یہی میری زندگی کا مقصد ہے اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے اس مقصد سے کس قدر محبت ہے۔ اردو سے بھی زیادہ!"

"لیکن نائر! کیا تمہیں یقین ہے کہ تم پنجاب جا کر کامیاب ہو گے؟"

اپنی کامیابی پر میرا ایمان ہے — علاوہ ازیں پنجاب زندہ دل خطہ ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ لاہور فن کاروں کی ماں ہے جسے کوئی اپنے گھر میں جگہ نہیں دیتا۔ لاہور اسے اپنے سینے سے لگاتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے۔ انور کیا یہ غلط ہے؟"

انور سگریٹ منہ کے پاس لے جاتے ہوئے رک گیا۔ اس نے نائر کی آنکھوں میں امید کی پرسکون خاموشی اور چمک دیکھی اور سر جھکا کر بولا۔

"تم نے ٹھیک سنا ہے نائر۔ لاہور فنکاروں کی پرورش کرتا ہے لیکن تم اس جھنجھٹ میں کیوں پڑتے ہو۔ اگر تمہیں اپنی کامیابی کا یقین ہے اور تمہارے بازوؤں میں قوت ہے اور تمہارے دل میں نیکی ہے تو پھر تمہیں اس کی کیا پرواہ کہ لاہور فن کاروں کی پرورش کرتا ہے۔ یا ان کے خون پر خود زندہ ہے۔ میں فنکار نہیں ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے۔ اگر میں فنکار ہوتا تو میں کبھی لاہور نہ ٹھہرتا۔ وہاں یقیناً میرا دم گھٹنے لگتا لیکن تم وہاں ضرور جاؤ۔ شاید وہاں کا کھاری

پاتی تمہیں راس آجائے۔"

نائر تک گویا انور کی آواز بالکل نہ پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات میں گم کھوئی کھوئی آنکھوں سے جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف تک رہا تھا۔ جہاں کیلے کے درختوں کے جھنڈوں تلے کوئی عورت جھیل میں کچھ دھو رہی تھی۔

"تم میرے دوست ہو انور ــــ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میرے اندر امیدوں اور آرزوؤں کا جوالا مکھی کھول رہا ہے۔ پنجاب میں کچھ مدت گزارنے کے بعد میں ایران جاکر وہاں کے غریب لوگوں میں رہنا بسنا چاہتا ہوں۔ پھر وہاں سے شام، مصر اور یمن کے علاقوں میں گھومنا چاہتا ہوں۔ تم نہیں جانتے مجھے ان علاقوں سے کس قدر انس ہے میں آداگون کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ گویا پچھلے جنم میں۔ میں کہیں وسطی ایشیا میں پیدا ہوا تھا۔"

نائر دھیرے سے ہنسنے لگا۔ اور اس کا زرد، پتلا و بلا چہرہ پہلے سے زیادہ اداس ہوگیا۔ یہ اداسی نائر کی سب سے بڑی ساتھی تھی اور کسی وقت بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی۔ وفادار کتے کی طرح ہر لمحہ اس کے پیچھے پیچھے لگی رہتی اور وہ جہاں جا کھڑا ہوتا۔ یہ اس کے قدموں کے پاس رُک کر محبت سے دم ہلانے لگتی نائر اپنے محبت کرنے والے والدین اور بہنوں کے ساتھ شہر کے آخری کنارے پر رہتا تھا۔ نائر کا باپ ناکام وکیل تھا اور بڑی مشکل سے بھرے کنبے کے اخراجات پورے کر رہا تھا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں اسکول میں پڑھتی تھیں اور بڑی بہن تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر گھر میں اپنی ماں سے سینے پرونے کا کام سیکھ رہی تھی۔ نائر دن کے وقت ایک ولایتی کمپنی کے دفتر میں ٹائپسٹ کا کام کرتا تھا۔ اور رات کو چند گھنٹے قاضی صاحب کے اخباروں کے لیے خبریں ترجمہ کیا کرتا۔ نائر کے باپ کا خیال تھا کہ اپنی بڑی لڑکی کیسر اور لڑکے کی شادی کے بعد وہ دونوں بچیوں کو ساتھ لے کر اپنے وطن چلے جائیں گے۔ اور زندگی کے باقی دن وہیں بسر کریں گے۔

قاضی صاحب انور سے اپنے بچوں ایسا سلوک کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ وہ بہت ذہین ہے اور اس میں کام کو سمجھنے کی پوری اہلیت ہے وہ اکثر کہا کرتے۔

"بھئی ہمارا انور بہت جلد ترقی کر رہا ہے۔ ترجمہ کافی روانی سے کرنے لگا ہے اور میکائیل صاحب کہہ رہے تھے کہ کاپی تو اب انور ہی جوڑا کرتا ہے ــــ میرا خیال ہے اسے اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا جائے۔"

لیکن ڈیڑھ سال سے انور سو روپے ماہوار تنخواہ لے رہا تھا اور جوں جوں جنگ لمبی ہو رہی تھی۔ رنگون میں ہر شے مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ تاہم انور نے اپنے دل سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اخبار میں زیادہ دیر کام نہیں کرے گا۔ وہ میکائیل احمد نہیں بننا چاہتا تھا وہ پندرہ برس ایڈیٹری کرنے کے بعد اپنی زندگی کو ادھ موئے کتے کی طرح تاڑی خانے کی سیڑھیوں پر نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے بالوں، اپنی آنکھوں، اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنی زندگی سے بھرپور، صحت مند آواز سے محبت تھی۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ شفیق ماں ایسا سلوک کرتا تھا پیار کرتا تھا ــــ وہ ایک سادہ آدمی کی طبعی اور معتدل زندگی بسر کرنا چاہتا تھا جس کا ایک گھر ہو، بیوی ہو، بچے ہوں، جس کی خواہشات نیک اور اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہوں۔ جس کا سر گنجانہ ہو۔ جس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں پر بھدی عینک نہ ہو۔ جو قرض لے کر شراب نہ پیتا ہو۔ اور جس کے پیچھے سود خور پٹھانوں کی بجائے خوش حالی اور فارغ البالی اس کا تعاقب کر رہی ہو اور جو زندگی کی تڑپ اور خون کی گرمی کو اپنی بے اعتدالیوں کی بھینٹ چڑھا کر وقت سے پہلے موت کے منہ میں نہ جا رہا ہو۔ اس لیے کہ وہ ابھی نوعمر تھا اور زندگی نے وقت کے سمندر سے ابھی سرہنی نکالا تھا۔ اس کی شریانوں میں تازہ خون گردش کر رہا تھا اس کی ماں اور محبت کرنے والی بہنیں اور بھائی ابھی زندہ تھے۔ وہ ان سب کے لیئے اور اپنے لیئے زندہ رہنا چاہتا تھا اور ٹھیک وقت پر مرنا چاہتا تھا۔ اور مرنے سے پہلے اپنی تمام آرزوؤں کے دیئے روشن دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن قاضی صاحب کے اخباروں کی کاپیاں جوڑتے اور ترجمہ کرتے

ہوئے یہ سب کچھ ناممکن تھا۔ اخبار اسے بین الاقوامی حالات اور وقت کی سیاسی زندگی کا نباض بنا سکتے تھے۔ لیکن اس کی زندگی کو بدمورتی بدنصیبی اور مفلسی کے جہنم میں گرنے سے نہ روک سکتے تھے۔ اسے میکائیل احمد کے وہ الفاظ اچھی طرح یاد تھے جو اس نے ایک رات باہر فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے اسے کہے تھے۔

"میرے لونا نال! زندگی گزارنے کا یہ ڈھب بڑا غیر قدرتی ہے۔ کسی اور ڈگر پر اپنی منزل تلاش کرو۔ تم نوجوان ہو اور بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یہ راہ وہ لوگ اختیار کرتے ہیں۔ جو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ابھی ہمارے ملکوں میں یہ بوٹا بار آور ہونے کے لیے ہزاروں انسانوں کا خون چاہتا ہے۔ میری طرف دیکھو۔ جب میں یہاں آکر ملازم ہوا تو تمہاری طرح زندگی سے لبریز تھا۔ لیکن اب ایک ایسا ناریل ہوں۔ جس کا گودا نکال لیا گیا ہو۔ اگر کبھی میری شادی ہوئی اور میرا کوئی بچہ ہوا تو میں اسے گھوڑوں کی نعل بندی کا کام سکھاؤں گا۔ اور کبھی کوئی اخبار نہ پڑھنے دوں گا۔"

شہر میں درجنوں سینما ہال تھے۔ جہاں زیادہ تر انگریزی اور ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ تامل تیلگو اور برمی تصویروں کی نمائش گنجان آبادیوں والے گھٹیا قسم کے سینما گھروں میں ہوتی۔ مدراسی فلموں میں سوائے ناچ اور گانے کے اور کچھ نہ ہوتا تھا اور برمی فلم ساز ابھی بھوت پریت کی کہانیاں فلما رہے تھے ان کی تصویروں میں اژدھے آنکھ جھپکتے ہی خوبصورت نازک اندام پریاں بن جاتے اور نیک دل شہزادے جوگیا کپڑے پہن جنگلوں کی راہ لیتے۔ شہر کے دو بہترین سینما گھروں میں دو ہندوستانی فلمیں (پردیسی اور خزانچی) چھ ماہ سے مسلسل رش لے رہی تھیں۔ ہر چائے خانہ میں انہیں فلموں کے ریکارڈ بجتے تھے اور برمی، مدراسی اور چینی لڑکے رنگون کے گلی کوچوں میں ہندوستانی دھنیں اڑایا کرتے

یونین مسلم کلب کی یک منزلہ مختصر سی عمارت منکی پوائنٹ روڈ پر تھی اس کلب

تا دھرتا چند سورتی مسلمان لڑکے تھے۔ جن کے باپ چاول اور گرم مصالحے کا کاروبار ... تھے۔ کلب میں چھوٹی سی لائبریری بھی تھی۔ جہاں اردو کتابوں کے علاوہ لاہور سے ہر ماہ اردو کے رسالے بھی آتے تھے۔ انور عموماً یہاں جایا کرتا۔ ہر ہفتے کی شام کو لائبریری کے چھوٹے سے ہال میں راگ سبھا منعقد ہوتی۔ سازوں پر غزلیں اور ٹھمریاں گائی جاتیں۔ محمود نامی سورتی لڑکا گٹار بجانے میں بڑا ماہر تھا۔ لمبے بالوں کو پیچھے جھٹک کر وہ گٹار کو گود میں لے کر بیٹھ جاتا۔ اور جب وہ سر جھکا لیتا تو دور سے یوں معلوم ہوتا۔ گویا ماں بچے کو گود میں لیے اسے دودھ پلا رہی ہو۔ اس کی نازک انگلیاں گٹار کے کانپتے تاروں سے چھو کر دل گداز سریں نکالنے لگتیں اور کمرے کی فضا میں دھیمی دھیمی سوگوار موسیقی اداسی سرما کی نیلگوں دھند بن کر پھیل جاتی۔ انور نے محمود سے گٹار سیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بہت جلد اکتا گیا اور مشق چھوڑ دی۔

سولی پیگوڈا شہر کا سب سے بڑا بدھی مندر تھا۔ اس کے اونچے اور خوبصورت کلس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔ چوڑی چوڑی سنگین سیڑھیوں کا اوپر اٹھتا ہوا سلسلہ مندر کے صدر پھاٹک تک چلا گیا تھا۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب صندل کے مدور ستونوں کے پاس برمی لڑکیاں پھولوں کی ٹوکریاں سجائے بیٹھی رہتیں۔ مندر میں مہاتما بدھ کی سونے کی مورتی تھی۔ جو چھوٹی چھوٹی ان گنت مورتیوں کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ ہر پجاری کے لیے اندر داخل ہوتے ہوئے کنول، بیلا، موتیا یا رتنا کلی کے پھولوں کا گلدستہ خریدنا بڑا ضروری تھا۔ برمی لڑکیاں (جو عام طور پر کنواریاں تھیں) اپنے جوڑوں میں سفید کلیاں سجائے بے داغ لباس پہنے، مندر میں داخل ہونے والے کو متبسم چمکیلی نگاہوں سے پھولوں کا گلدستہ پیش کرتیں اور اس کے دام وصول کر کے کرتی کی ننھی سی جیب میں رکھ لیتیں۔ انور نے اسی مندر کی سیڑھیوں پر پہلے پہل ساتبیں کو دیکھا۔ ایک شام جبکہ دن بھر کی بارش کے بعد مغربی افق پر بادل کھل گئے تھے اور ان کے حاشیوں پر ڈوبتے سورج

کا سونا جھلملا رہا تھا۔ انور سُولی پیگوڈا کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ رنگون کا یہ بدھی مندر برما کی روح ہے۔ لیکن وہ اس کے اندر کبھی نہ گیا تھا اس روز وہ غیر معمولی طور پر اداس تھا اور اس بیکراں اداسی کو مقدّس مندروں کی پرسکون خامشی میں تحلیل کر دینا چاہتا تھا۔ تنہائی اور افسردگی سے لبریز اپنے مغموم دل کو وہ کنول کے نازک پھول کی طرح ہتھیلیوں میں رکھے مندر کی سیڑھیاں طے کر رہا تھا۔ یہ سولی پیگوڈا کی سیڑھیاں تھیں یا جامع مسجد کی یا کتھولک چرچ کی؟ وہ اس خیال سے بالکل بے خبر تھا۔ کہ اوپر اٹھتا ہوا ہر قدم اسے رنگ و نور کے اس عظیم شعلے سے قریب تر کر رہا تھا جس کی ازلی و ابدی چمک کے سنہری پرتو کو اس نے جامع مسجد کے میناروں اور گرجا گھر کے روشندانوں پر لرزتے دیکھا تھا۔ طویل سیڑھیوں کی پہلی منزل طے کرنے کے بعد اس نے جوتا اتار کر قریبی بکس میں رکھا اور کنول کے زرد پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ خریدا۔ جس برمی لڑکی نے اسے گلدستہ پیش کیا۔ اس کا رنگ کنول کے پھول ایسا تھا زردی مائل سفید ـــــ محراب دار گول پیشانی پر باریک بھنوؤں کے وسط میں سرخ بندیا تازہ زخم کا نشان معلوم ہو رہی تھی۔ ناک عام برمی لڑکیوں کی مانند چھوٹی لیکن قدرے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ سپید و نازک گردن پر سبز سبز دریدیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ سیاہ بالوں کا جوڑا کس کر بندھا تھا۔ جس کے ارد گرد گجرے کا دودھیا ہالہ بنا ہوا تھا۔ وہ سفید ململ کی کرتی اور سبز ریشمی لہنگہ میں ملبوس پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ اور اس کے چہرے پر کنول کے زرد پھولوں کی گہری اداسی اور کومل تازگی تھی۔ انور کو جوتا بکس میں رکھ کر اپنی دوکان کی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے رتنا کلیوں کا ایک جھاڑ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ کلیاں بھگوان کی بیوی اپنے بالوں میں لگاتی تھی۔"

انور برمی زبان سے کافی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ لیکن اس زبان کی شاعری سے بے خبر تھا۔ ادھر ادھر دوسری پھول بیچنے والی عورتوں اور لڑکیوں نے بھی

اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ لیکن وہ اسی لڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ جس نے اس کے خیال میں غیر شعوری طور پر غزل کا ایک مصرعہ کہہ دیا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے کلیوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"وہ پھول دکھاؤ جو بھگوان بدھ کو پسند تھے۔"

پھول بیچنے والی مسکرانے لگی اور انور نے باریک اور سرخ ہونٹوں کے درمیان موتیوں کی ایک ہموار لڑی کو چمکتے دیکھا۔ برمی لڑکی نے شبو کے پھول پیش کیے۔

"کتابوں میں لکھا ہے۔ جب بھگوان بدھ، خدا کی تلاش میں راج محل سے نکلے تو ان کے ایک ہاتھ میں شبو کے پھول تھے؛

"اور دوسرے ہاتھ میں کیا تھا؟"

پھول بیچنے والی کے معصوم چہرے پر تبسم غائب ہو گیا۔ وہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔ انور جلدی سے سنبھل گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔

"میرا مطلب ہے ان کے دوسرے ہاتھ میں کون سے پھول تھے؟"

لڑکی پھر مسکرانے لگی۔ اب کی بار اس نے تخت کے نیچے سے ایک ٹوکری نکالی اور مینگو تسین کے چوڑے اور لمبے پتوں والے سفید پھول انور کو دکھائے انور نے محسوس کیا۔ کہ ان کی خوشبو میٹھی اور بے حد گہری تھی۔ وہ ابھی پھولوں کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہا تھا۔ کہ لڑکی نے پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں سے چھوٹے کنول کے ہلکے گلابی اور لمبے سبز ڈنٹھلوں والے پھول اس کی طرف بڑھائے اور بولی۔

"اور یہ پھول بھی بڑے خوبصورت ہیں۔ یہ ہمارے بدھا کو بہت پسند تھے۔ اور مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ یہ ہمارے تالاب کے ہیں۔"

انور نے پہلے پھول ٹوکری میں رکھ دیئے!

"ٹھیک ہے کنول کے پھول مجھے بھی پسند ہیں۔ کیا یہ تمہارے تالاب میں اُگے تھے؟"

"ہاں" لڑکی اپنی نازک اور خوبصورت گردن کو ایک طرف جھکائے ہوئے بولی۔ کنول کے لمبے ڈنٹھلوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اور لڑکی اپنے

دھیان میں انہیں کیلے کے چوڑے پتوں میں لپیٹ رہی تھی۔ انور اس کے چھوٹے چھوٹے نرم نازک ہاتھوں کو چھوتے ہوئے بولا

"تمہارا تالاب کہاں ہے؟"

"ہمارے گھر کے پاس"

"اور تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"تالاب کے پاس"

"یعنی تالاب اور گھر بالکل آس پاس ہیں"

"جی ہاں! اور ایراوتی ہمارے گھر کے سامنے سے گزرتی ہے۔ یہ کنول میں ایراوتی کے پانی سے دھو کر لاتی ہوں۔ میری ماں کہتی ہے۔ ایراوتی کے پانی میں بھگوئے ہوئے پھول کبھی نہیں مرجھاتے"

انور چپ چاپ کھڑا اس پھول بیچنے والی معصوم لڑکی کی شیریں آواز سن رہا تھا اس نے کنول کے پھولوں کا دستہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آٹھ آنے جناب"

"انور جیسے سوتے میں چونک پڑا"

"او ــــ ہاں، آٹھ آنے تو بہت زیادہ ہیں"

لڑکی ہنسنے لگی۔

"نہیں جناب زیادہ نہیں ــــ آپ کو کیا معلوم۔ انہیں چنتے وقت ہمیں گھٹنوں تک کیچڑ اور دلدل میں اترنا پڑتا ہے"

"کیا تمہارے ہاں نوکر کام نہیں کرتے؟"

"لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جناب ہم غریب لوگ ہیں"

"انور نے محسوس کیا کہ ادھر ادھر چند ادھیڑ عمر کی عورتیں اسے مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگی ہیں۔ اس نے کنول کے پھولوں کا دستہ تھام کر دام ادا کئے۔ اور

مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مندر کے لمبے کھلے روشن دان اور عود و عنبر کی بوجھل خوشبوؤں سے بھرے ہوئے کمروں میں گھومتے ہوئے اس نے گہری اجنبیت اور تنہائی محسوس کی۔ جیسے وہ کسی ناواقف آدمی کے گھر میں داخل ہو گیا ہو۔ بدھی پر دہت اور زرد زرد لباس والے بہت سے بھکشو دھنکی، بدھ کی سنہری مورتی کے سامنے مؤدب بیٹھے لوبان کے دھوئیں میں کچھ پڑھ رہے تھے بدھ کے قدموں میں پھولوں اور چڑھاوے کی چیزوں کا ڈھیر لگا تھا۔ انور باہر دالان میں آ گیا۔ کنول کے پھول بیچنے والی بھکشوؤں کو دینے کی بجائے اس نے انہیں ایک کم عمر بچی کی جھولی میں ڈال دیا جو آہنی جنگلوں کے پاس پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔ انور مندر کی سیڑھیاں اترنے لگا بکسے میں سے جوتا نکالتے ہوئے اس کی نگاہیں پھول بیچنے والی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ گجرے بنا رہی تھی۔ انور نے گجروں کی ایک جوڑی خرید لی۔ دام ادا کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں"

"ساتیں: لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

مندر سے باہر نکلتے ہوئے انور نے یوں محسوس کیا گویا ساتیں مہاتما بدھ کا نام تھا اور وہ ہنس پڑا۔

۵

کچھ روز ٹھہر کر انور ایک شام پھر مہاتما بدھ کے درشن کرنے گیا۔

ساتیں نے اسے دیکھتے ہی کنول کے پھول اس کی طرف بڑھائے۔ انور نے دیکھا کہ ساتیں نے سرخ لہنگا پہن رکھا تھا اور جوڑے میں رتنا کی تر و تازہ سفید کلیاں سج رہی تھیں۔ واپسی پر اس نے تین روپے کے پھول، گجرے اور کلیاں خریدیں۔ رنگ برنگے خوشبودار پھولوں کو بانس کی چھوٹی سی ٹوکری میں ڈالتے ہوئے ساتیں نے پوچھا۔

"آپ اتنے سارے پھول کیا کریں گے؟"

"سرھانے رکھ کر سوؤں گا۔"

"کیا آپ کی بیوی نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

ساتیں نے بڑے بھولپن سے کہا۔

"میری ماں کہا کرتی ہے۔ جو لوگ پھول سرھانے رکھ کر سوتے ہیں انہیں آسمانی پریاں اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ کیوں جناب آپ کا کیا خیال ہے؟"

انور کوٹ کی جیبوں میں سے ہاتھ نکال کر بولا۔

"میرا خیال یہ ہے کہ تمہاری ماں کا خیال بالکل غلط ہے۔"

"نہیں جناب ایسا نہ کہیں ـــــ میری ماں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور کبھی کوئی بات نہیں چھپاتی۔ ہمارے بھگوان جب جنگل میں پیاس سے نڈھال ہو گئے تھے۔ تو پریوں نے ہی آکر انہیں ناریل کا پانی پلایا تھا۔ ماں کہتی ہے بس اسی دن سے ناریل کا پانی میٹھا ہو گیا۔"

"ساتیں ـــــ تمہاری ماں کہاں رہتی ہے؟"

"ہم اکٹھے رہتے ہیں جناب ـــــ ایک ہی گھر میں۔"

اس نے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری انور کو پکڑاتے ہوئے کہا:۔

"تین روپے جناب"

انور وہاں ٹھہر کر ساتیں سے کتنی ہی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پہلے روز کی طرح اس نے محسوس کیا کہ ارد گرد ادھیڑ عمر کی عورتوں نے پھر سے گھورنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے ٹوکری سنبھالی۔ ساتیں کو مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہا۔ اور مندر کی سیڑھیاں اترنے لگا۔

دوسرے دن انور اسکاٹ مارکیٹ میں کچھ چیزیں خریدنے گیا۔ تو اس نے ایک پنساری والے کی دوکان پر ساتیں کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی دستے والی ٹوکری تھی اور دوکاندار ان کے لیے سرخ مرچیں لفافے میں ڈال رہا تھا۔ ساتیں کے ساتھ ادھیڑ عمر کی موٹی عورت تھی جس کے زرد گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ سگار پی رہی تھی۔ اور ہولے ہولے کھانس رہی تھی۔ انور بالکل سامنے والی دکان پر کھڑا تھا۔ مرچوں والا لفافہ ٹوکری میں رکھنے کے بعد جب وہ دکان سے باہر نکلیں تو ساتیں کی نظر انور پر پڑی انور مسکرانے لگا۔ ساتیں پہلے تو گھبرا گئی پھر وہ بھی زیر لب مسکرائی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ادھیڑ عمر کی عورت کے ساتھ دوسری طرف گھوم گئی۔

وسط ایشیا میں جرمنوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے برطانیہ اپنے ٹینک ایران میں سے گزارنا چاہتا تھا۔ حکومتِ ایران کے انکار پر انگریزوں نے ایران پر حملہ کر دیا۔ قاضی صاحب برما کا دورہ کر رہے تھے۔ لبسین میں انہیں برطانوی حملے کی خبر ملی اور آپ نے فوراً دورہ ملتوی کر دیا اور رنگون واپس آ گئے۔ انگریزوں کے خلاف ان کے غصے کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ آپ نے اس رات ایران کی حمایت میں اتحادیوں کی جنگی پالیسی کے خلاف ایک زبردست اداریہ لکھا اور بیک وقت دونوں اخباروں میں چھاپ دیا دوسرے دن جب اخبار مارکیٹ میں آیا۔ تو لوگ قاضی صاحب کی اس جرأت پر حیران رہ گئے۔ برما حکومت نے فوراً ضمانت ضبط کر لی اور بیک وقت دونوں اخبار بند ہو گئے اور تین درجن کے قریب ملازم بے کار ہو گئے۔ قاضی صاحب نے حقے کا کش لگا کر خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے حق کی آواز لگائی ہے۔ میں بھوکوں بھی مر جاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا"

قاضی صاحب کے بھوکوں مرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ انہوں نے بنک میں اتنا روپیہ جمع کرا رکھا تھا کہ اگر دس سال بھی بے کار رہنا پڑے تو وہ اطمینان سے جھنگ کا خالص تمباکو پیتے رہیں اور غسل کے بعد بدن پر ولایتی پوڈر کا استعمال بھی جاری رہ سکے۔ لیکن کاتب، ایڈیٹر، پریس مین اور چپڑاسی ——— ان لوگوں کے ہاں تنخواہ ملنے کے دوسرے روز بعد ہی پیسے ختم ہو جاتے تھے اور پھر سارا مہینہ قرض پر چلتا تھا۔ قاضی صاحب کا خیال تھا کہ ان کے اخبارات پر زیادہ دیر تک پابندی نہ رہے گی اور وہ دن بھر دفتر میں حقہ آگے رکھے اس انتظار میں رہتے کہ کب حکومت کی طرف سے ایسا خط آئے جس میں معذرت کے اظہار کے ساتھ اخبارات پر سے پابندی اٹھا دینے کی خوش خبری سنائی گئی ہو۔ مگر تین ماہ گزر جانے پر بھی اس قسم کا کوئی خط نہ آیا۔ ملازموں کو ہر ماہ نصف تنخواہ مل جاتی

تھی۔ جب چوتھا مہینہ بھی بے کاری میں گزر گیا۔ تو قاضی احب نے چھتری ہوا میں لہراتے ہوئے اعلان کر دیا۔

"آج سے آپ لوگ آزاد ہیں اور جہاں چاہیں ملازم ہو سکتے ہیں"

آزاد ہونے کے بعد کاتبوں نے اپنا اپنا بوریہ بستر باندھا اور ہندوستان جانے والے جہاز کی ٹکٹیں خرید لیں۔ چھاپے خانے کے مستریوں نے کچھ روز کی دربدری کے بعد کام حاصل کر لیا۔ میکائیل احمد نے پٹھانوں سے سود پر قرض لینا شروع کر دیا۔ نائر پنجاب جا کر قسمت آزمانے کے متعلق سوچنے لگا اور انور نے رنگون کے بازاروں میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ جنگ کا زمانہ تھا اور ملازمت حاصل کرنا کوئی دشوار کام نہ تھا۔ اخبار میں کچھ عرصہ گزارنے کے باعث اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے بھی تھی۔ جو رنگون کے سرکاری حلقوں میں کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ رنگون ٹائمز میں یہ پڑھ کر کہ حکومتِ برما نے ریڈیو پر اردو پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انور نے فوراً پریس اینڈ پبلسٹی برانچ کے انچارج مسٹر ڈیم موس سے ملاقات کی جو ایک غیر شادی شدہ نوجوان آدمی تھا۔ اور انور سے اس کی دیرینہ واقفیت تھی۔ موس نے اسے یقین دلایا کہ رنگون ریڈیو کے اردو سیکشن میں انور کا نام ضرور شامل ہو گا۔ ایک ماہ بعد انور کو ایک سرکاری خط موصول ہوا۔ جس میں اسے بحیثیت سکرپٹ رائٹر انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ انٹرویو کامیاب رہا اور انور اڑھائی سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا گیا۔

رنگون ریڈیو اسٹیشن کی ایک منزلہ عمارت مرچنٹ سٹریٹ اور فیئر سٹریٹ کے درمیان میں گلی نمبرے کے آخری سرے پر واقع تھی۔ گلی کے منہ پر رنگون کا مشہور شراب خانہ "میکسم" تھا۔ میکسم کا بڑا دروازہ بازار کی طرف تھا۔ لیکن ایک چھوٹا دروازہ گلی میں بھی کھلتا تھا۔ شریف آدمی اسی دروازے سے گزرا کرتے تھے۔ ریڈیو اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن پروگرام بڑے وسیع پیمانے پر ہوتے تھے۔ اردو سیکشن کے انچارج مسٹر ریاض ملک تھے۔ جن کا آبائی وطن لاہور تھا۔ لیکن ایک مدت سے برما میں

رنگون سیکریٹریٹ کے پریس برانچ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کا قد چھوٹا۔ بدن دبلا پتلا اور آواز بھاری تھی۔ شراب کے رسیا تھے۔ اور گلی والے دروازے سے میکسم بار میں داخل ہوتے تھے مذہب اور اسلامی ملکوں کی سیاسیات پر بے تکان گفت گو کرتے تھے۔ اور در پردہ جرمنوں کی عسکریت پرستی کے بے حد مداح تھے۔ داڑھی مونچھ صفا چٹ، سوٹ پہنتے تھے۔ لیکن دنیا کی نجات اسلام میں ڈھونڈھتے تھے۔ ان کی بیوی ان سے کئی گنا لمبی، چوڑی اور صحت مند تھی۔ پردے کے حامی نہ تھے۔ چنانچہ بازار میں اپنی بیوی کے ساتھ گزرتے ہوئے گردن اکڑا کر چلنے کے باوجود بچہ معلوم ہوتے تھے دفتر آتے وقت میکسم بار سے ہو کر آتے تھے۔ اور واپسی پر بھی پیر مغاں کو سلام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میکسم کا مدراسی عیسائی مینجر مسٹر ہیپٹی انہیں بے دریغ قرض پر شراب پلانے کا عادی تھا۔ اس لیے کہ مہینہ کے شروع میں مسٹر ملک میکسم کا بل سب سے پہلے ادا کرتے تھے۔ رنگون ریڈیو کے ڈائرکٹر کا نام مسٹر میکائے تھا جو مرہٹہ عیسائی تھے اور کسی اینگلو انڈین لڑکی سے شادی کر رکھی تھی۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے عقب میں اپنے دو لڑکوں اور بیوی سمیت رہائش پذیر تھے۔ ٹرانسمیشن انچارج مسٹر ڈی کوسٹا خالص انگریز تھے۔ ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی اور اوپر تلے کے تمام دانت مصنوعی تھے۔ ان کا گھر منکی پوائنٹ پر ایراوتی کے کنارے پر تھا۔

اردو پروگرام شام کے سات بجے شروع ہو کر سوا نو بجے ختم ہو جاتا تھا اس پروگرام میں خبریں، خبروں پر تبصرہ، تقریریں، اردو اور بنگالی گانے۔ ریکارڈ اور ہندوستانی فوجوں کی تفریح کے لیے چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی شامل تھے۔ اتفاق سے انور کی آواز مائیکروفون پر بالکل فٹ اتری اور مسٹر ملک نے ہفتے میں ایک بار اس سے خبروں پر تبصرہ کرانا بھی شروع کر دیا۔ اس کام کے عوض انور کی تنخواہ میں پچیس روپوں کا اضافہ ہو گیا۔ انور شیو گاؤں سٹریٹ سے اُٹھ کر لبوس سٹریٹ میں آ گیا۔ یہاں جس فلیٹ میں اس نے اپنا سامان لگایا۔ وہ ایک بہت بڑی عمارت کی دوسری

منزل پر واقع تھا۔ دو بڑے کمروں کے علاوہ ایک غسل خانہ، کچن اور سڑک کی جانب آگے کو بڑھی ہوئی بالکونی بھی تھی۔ چھت اور فرش لکڑی کا تھا۔ اور دیواروں پر سبز روغن پھرا ہوا تھا۔ انور نے اگلا کمرہ ڈرائینگ روم اور پچھلا بیڈ روم میں تبدیل کر دیا۔ کچھ عرصہ ہوٹلوں میں تیز مرچوں والا سرخ سالن اور موٹے چاول کھانے کے بعد انور کو محسن نامی ایک چانگا می باورچی مل گیا۔ محسن بوڑھا آدمی تھا۔ اور بہت جلد وہ انور کا بالکل اپنے بچوں کی طرح خیال رکھنے لگا۔ اس عمارت میں قریباً نصف درجن کے قریب بلی اتنے موٹے تازے چوہے بھی سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ جنہوں نے تمام کرایہ داروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ محسن بہتیرا دروازے وغیرہ بند کرتا اور غسل خانے کی نالی میں اینٹیں رکھتا۔ لیکن اندھیرا ہوتے ہی کوئی نہ کوئی موٹا تازہ چوہا چہل قدمی کرتا ہوا کچن میں آ نکلتا اور خوب دھما چوکڑی مچاتا۔ چوہوں کے علاوہ اس بلڈنگ میں ایک چوہیا بھی رہتی تھی۔ اس کا نام عنیزہ تھا۔ عنیزہ ایک سورتی میمن تاجر کی اکلوتی لڑکی تھی۔ جس کا اسکاٹ مارکیٹ میں ہلدی، چاول اور گرم مصالحوں کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ عنیزہ بھی ہلدی کی گانٹھ ہی تھی۔ اس کا رنگ زرد اور جسم بے حد دبلا پتلا تھا۔ انور کے بائیں ہاتھ والا فلیٹ ان لوگوں کے پاس تھا۔ عام سورتی گھرانوں کی طرح ان کے ہاں بھی عورتیں سختی سے پردہ کرتی تھیں لیکن انور اس سے مستثنیٰ تھا۔ وہ بلا روک ٹوک عنیزہ کی بوڑھی ماں اور اس کا چھوٹی سی داڑھی والا کمزور سا باپ انور کو کم عمر سمجھتا تھا اور دوسری سب سے اہم وجہ یہ تھی۔ کہ انور نے ایک مرتبہ ریڈیو پر عنیزہ کے باپ کے کاروبار کا ذکر کر دیا تھا۔ جس کے بعد سورتی سیٹھ کی بڑی مشہوری ہو گئی۔ اور انور کی ڈائرکٹر کے سامنے پیشی ہو گئی تھی۔ پرسکون سیاہ آنکھوں اور زرد چہرے والی خاموش طبع عنیزہ کو خوش کرنے کے لیے ایک تقریر میں کہہ دیا۔

"دشمن کا ریڈیو ہر روز ہم پر یہ الزام لگاتا ہے کہ جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات کا بوجھ ہندوستان اور برما پر پڑ رہا ہے اور یہاں بھوک کے باعث لوگ گھروں اور سڑکوں پر دم توڑ رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی کل کی بات ہے کہ اسکاٹ مارکیٹ میں سے

گزرتے ہوئے میں نے اسحاق سیٹھ کے ہاں چاولوں کی بوریوں کے انبار دیکھے۔ جو بے حد سستے نرخوں پر لوگوں میں فروخت کئے جا رہے تھے۔"

عنیزہ کو بے حد خوشی ہوئی۔ اسحاق سیٹھ، عنیزہ کا باپ دوکان کی گدی پر بیٹھا بیٹھا اچھل پڑا اور گھر لوٹتے ہوئے اس نے ہر واقف کار سے پوچھا کہ اس نے ریڈیو سنا ہے یا نہیں۔ اس نے انور کو چاولوں کی ایک بوری اور کچھ نقد روپے تحفے کے طور پر دینے چاہے جس کے لئے انور نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اسے ڈر تھا۔ اگر بات باہر پھیل گئی تو وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ اس سے پیشتر وہ عنیزہ کے ہاں کبھی نہ گیا تھا۔ بلکہ چھپ چھپا کر ادھ کھلے دروازے میں ہی اس سے باتیں کر لیتا تھا۔ اس واقعے کے بعد اسحاق سیٹھ نے انور کی دعوت کی اور جب انور ان کے ہاں گیا تو کسی نے بھی اس سے پردہ نہ کیا۔ پہلی مرتبہ عنیزہ کو اپنے سامنے آزادی سے اِدھر اُدھر پھرتے دیکھ کر انور کو بڑا عجیب سا لگا۔ وہ دسترخوان پر ملازمہ کی مدد سے کھانا چن رہی تھی اور اس کے پرسکون چہرے پر خوشی کی پراسرار چمک تھی۔ انور بالکل نہیں جانتا تھا۔ کہ وہ عنیزہ سے کس قسم کی محبت کرتا ہے۔ اگرچہ عنیزہ خوبصورت نہیں تھی۔ اس کے جسم میں بھی کوئی خاص کشش نہ تھی۔ پھر بھی انور اُسے ہر قدم اپنے قریب چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے دیکھنا چاہتا تھا پہلے روز جب اس نے عنیزہ کو دیکھا تھا تو اسے ایکا ایکی شبو گاؤں سٹریٹ والی ایرانی عورت درخشاں یاد آگئی تھی اسے یوں محسوس ہوا تھا۔ گویا وہ اس نغمے کی صدائے بازگشت سن رہا ہو جو کبھی اُسے بڑا محبوب تھا۔ اور جو مدت ہوئی فضا میں کہیں گم ہو چکا ہے۔ درخشاں کا نقش اس کے دل میں کافی گہرا تھا۔ اس کا ذہن درخشاں کے وجود سے ہی منکر تھا۔ لیکن اس کا دل کسی گم کردہ راہ مسافر کی طرح دھند سے ڈھکے ہوئے راستوں پر اپنی کھوئی ہوئی منزل کی جستجو میں رواں دواں تھا عنیزہ اس ایرانی عورت سے زیادہ خوبصورت نہ تھی۔ اس کی آواز میں وہ شعلے نہ تھے۔ اور اس کی آنکھوں میں اصفہان وشیراز کے شراب خانے نہ تھے۔ لیکن اس کا رنگ درخشاں کی طرح زرد تھا اور

اس کے بال درخشاں کے بالوں ایسے تھے۔ سنہری اور ریشمی ـــــ عنیزہ درخشاں درخشاں عنیزہ!۔

انور نے عنیزہ کو اپنے قریب لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کاغذ کے چھوٹے سے پرزے پر محبت کے چند الفاظ لکھے اور سیڑھیاں اترتے ہوئے ادھ کھلے دروازے کے پیچھے کھڑی عنیزہ کے پاؤں میں پھینک دیئے۔ عنیزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ انور نے ایک اور خط لکھا۔ عنیزہ خاموش رہی۔ تیسرے خط پر اس نے جواب میں انور کو اپنی لامحدود و بیکراں محبت کا اس قدر زوردار الفاظ میں یقین دلایا کہ وہ حیران رہ گیا۔ اور اسے عنیزہ کے مقابلے میں اپنی محبت کم تر محسوس ہونے لگی۔ اب وہ سیڑھیوں میں ہی چوری چھپے ملنے گئے۔ عنیزہ کے باپ سے انور کی محض علیک سلیک ہی تھی۔ اب اس نے تعلقات بڑھانا شروع کر دیئے اور جس روز اس نے ریڈیو پر اس کے کاروبار کا ذکر کیا۔ یہ تعلقات زقند لگا کر کئی سالوں کی اجنبیت اور بیگانگی کی خلیج کو پاٹ گئے۔ اور انور نے اپنے سامنے عنیزہ کو دسترخوان پر کھانا چنتے دیکھا کھانے سے فارغ ہو کر اسحاق سیٹھ نے لمبا سا کالا سگار سلگایا اور گدے دار کرسی پر نیم دراز ہو کر انور سے ریڈیو پر ایک مرتبہ پھر اس کے چاولوں کی بوریوں کے ذکر کے امکانات پر گفتگو کرنے لگا۔ عنیزہ سامنے والی کرسی پر کروشیا لے کر بیٹھ گئی۔ اس کی ماں قالین پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر چھالیہ کترنے لگی اور انور عنیزہ کے باپ کی بورنگ گفتگو سے چھٹکارا حاصل کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک بڑا ہی بصوبت خیال سوجھا۔ اپنے ذہن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ہمارے ہاں بھینس کو ابھرا ہو جائے تو اسے میٹھا تیل پلاتے ہیں۔ آپ کے ہاں کیا کرتے ہیں؟"

اسحاق سیٹھ، انور کو رنگون کے سب سے بڑے ہوٹل میں پائن ایپل پلانے کی بابت سوچ رہا تھا۔ وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ انور بیچ میں خود ہی بول اٹھا۔

"غالباً آپ نے کبھی بھینس نہیں رکھی اور اگر رکھی ہے تو اسے ابھرا کی بیماری نہیں

ہوتی اور اگر ہوئی ہے تو آپ نے یقیناً اسے کچھ اور پلا دیا ہوگا۔"

"بھئی مجھے بھینسوں سے کوئی واقفیت ہی نہیں۔"

"مجھے ہے۔" انور نے آنکھ کے کونوں سے عنیزہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عنیزہ منہ دوسری طرف کر کے ہنسنے لگی۔ اس کی ماں چھالیہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"بیٹا۔ ہمارے ہاں پیچھے وطن میں بھینسیں ضرور تھیں۔ لیکن انہیں ایسی ویسی بیماری کبھی نہ ہوئی تھی۔ اور پھر ان کی خبر گیری کو گوالے جو تھے۔"

اس کے بعد ایک گھنٹہ تک بھینسوں کی مختلف بیماریوں پر گفت گو ہوتی رہی انور نے ان لوگوں کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں بتایا۔ کہ بھینس کو اگر زکام ہو جائے تو وہ اندھی ہو جاتی ہے دانت درد کر رہا ہو تو قبض ہو جاتی ہے۔ اور دودھ خون بن جاتا ہے اور اگر ہر سال اس کی نعل بندی نہ ہو تو انتڑیوں میں ایک مینڈک پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کے حلق کے قریب آ کر ٹراتا رہتا ہے۔ عنیزہ نے کروشیا روک لیا۔ اس کی ماں نے سروتہ نیچے رکھ دیا۔ اسحاق سیٹھ داڑھی سہلانے لگا۔ وہ تعجب سے بولا۔

"ارے باپ رے ــــ بھئی یہ سالی بھینس تو بڑا خطرناک جانور ہے۔"

"جی ہاں۔"

"لیکن بیٹا۔" عنیزہ کی ماں کہنے لگی۔ "تمہیں تو ڈنگروں کا ڈاکٹر ہونا چاہیئے تھا۔"

انور جھٹ بولا۔

"وہ تو میں ہوں۔"

اسحاق سیٹھ نے سگار راکھ دان میں رکھ دیا۔

عنیزہ جس قدر کم گو تھی۔ اس سے کہیں زیادہ احمق تھی۔ اس کی خاموشی سونا لیکن باتیں کھوٹا سکہ تھیں۔ اسے خموش دیکھ کر محسوس ہوتا کہ وہ بیش قیمت الفاظ کے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ مگر جب وہ کوئی بات کرتی تو معلوم ہوتا۔ وہ تمام انڈے گندے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ نہایت سنجیدگی سے سر جھکائے آنکھوں میں

پردہ ... اکیے کروشیا کاڑھتی رہی ہے۔ اچانک وہ سر اٹھا کر اپنی ماں یا انور سے کہتی۔

پچھلی شبرات پر جمیلہ پھوپھی نے جو حلوہ بنایا تھا ــــ میرے خدا ــــ بس اس میں اور گائے کے گوبر میں کوئی فرق نہ تھا۔"

دراصل عنیزہ اور گائے میں بھی سوائے دم کے اور کوئی فرق نہ تھا۔ اسے اس بات کا قطعاً احساس نہ تھا کہ اس کی تشبیہہ کراہت پیدا کر دے گی۔ اس کے ذہن کی دلدل میں اس قسم کی مکروہ تشبیہات کیڑوں کی طرح رینگا کرتی تھیں اور وہ موقعہ محل کو دیکھے بغیر بڑی بے تکلفی سے ان کا استعمال کرنے کی عادی تھی۔ انور جس چیز سے زیادہ متاثر تھا۔ وہ عنیزہ کی خاموشی اور گفتگو کا حیرت انگیز فرق تھا۔ بولتے وقت چپ رہنے والی عنیزہ غائب ہو جاتی اور جب وہ چپ ہو جاتی تو باتونی عنیزہ کا نشان نہ ملتا۔ انور کے خیال میں ان دو متضاد صفات کے درمیان میں ہی کہیں اصلی عنیزہ غائب ہو گئی تھی اور وہ اس کی تلاش میں تھا۔ عنیزہ کا معدہ عموماً خراب رہتا۔ رنگون میں ہر سورتی میمن لڑکی کا رنگ پیلا اور معدہ خراب رہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ گھروں میں بند رکھی جاتی ہیں۔ وہ اگر سال میں ایک بار گھر سے باہر قدم بھی رکھتی ہیں تو سر سے لے کر پاؤں تک موٹے برقعے میں لپٹی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں گھر پر وہ کھانے پکانے اور کپڑے دھونے کا کام ملازم عورتوں سے لیتی ہیں۔ چنانچہ ان کے معدے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ عنیزہ بھی شادی کے بعد سے کبھی باہر نکلی۔ ان کے ہاں بھی برتن مانجھنے سے لے کر بستر بچھانے تک گھر کا سارا کام ملازمہ ہی کرتی تھی۔ وہ خود یا تو کسی جگہ گھنٹوں بیٹھی کروشیا کاڑھا کرتی یا اپنی ماں سے باتیں کرتی رہتی اور یا پھر منشی تیرتھ رام فیروزپوری اور ادیم اسلم کے ناولوں کا مطالعہ شروع ہو جاتا اور یہ مطالعہ رات گئے تک جاری رہتا۔ اسے بہت کم بھوک لگتی تھی اور وہ بہت زیادہ کھاتی تھی۔ گھر میں ایک ہی بچی ہونے کے باعث ماں باپ اس کے بہت ناز اٹھاتے تھے۔ اس کے لیے شیشے کے مرتبان سیب، انناس اور گاجر کے مربّے سے ہمیشہ بھرے رہتے تھے مغل سٹریٹ

والے بڑے حکیم صاحب جب بھی اس کے لیے کوئی دوائی بنا کر بھیجتے۔ اس میں طبا شیرا اور خمیرہ گاؤزبان ضرور ہوتا۔ نہ معلوم انہیں ایک دوسرے سے کس قسم کی محبت تھی۔ وہ جب کبھی تنہا ہوتی۔ عنبزہ عام طور پر انور کے آگے اپنے بیمار معدے اور کھٹے میٹھے ڈکاروں کا رونا لے بیٹھتی۔ اور انور ہر بار اس کے لیے کوئی نہ کوئی نسخہ تجویز کرنا شروع کر دیتا۔ وہ عاشق و محبوب کم اور مریض و حکیم زیادہ تھے۔ انور ڈنگروں کے علاوہ آدمی اور اس کی بیماریوں سے بھی خوب واقف تھا۔ چنانچہ ایک روز جب اپنی قابلیت کے ثبوت میں اس نے عنبزہ کے بیمار معدے کو ٹھیک کرنے کے لیے گدھے کے جبڑوں کے کباب تجویز کیے تو وہ تڑپ اٹھی۔

"آپ کے لیے تو یہ مذاق ہے"

عنبزہ ایک دم چپ ہو گئی۔ وہ آنکھیں جھکا کر کتاب پڑھنے لگی۔ اور اس نے ایک بالکل دوسری لڑکی کا روپ بدل لیا۔ انور اس کی طرف محویت کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس عنبزہ کی ٹوہ میں تھا۔ جو ابھی ابھی اس کے پاس بیٹھی کھٹی ڈکاریں لے رہی تھی اور جس کے لیے اس نے گدھے کے جبڑوں کے کباب تجویز کیے تھے۔ لیکن وہ عنبزہ اس قدر تیزی اور بجلی ایسی سرعت سے گزر گئی تھی۔ کہ اسے اس بار بھی اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی۔

انور کے فلیٹ کے نیچے بازار میں ایک بوڑھے جاپانی کی لانڈری تھی۔ دکان کے اگلے حصے میں شیشہ لگی الماریاں تھیں۔ جن میں گاہکوں کے استری کیے ہوئے کپڑے لٹکے رہتے اور پچھلے حصے میں وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ انور صبح دفتر جاتے ہوئے اور واپس لوٹتے ہوئے اسے سلام کہنا کبھی نہ بھولتا تھا۔ ٹخنوں سے اونچی چوڑے پائنچوں والی پرانی سی پتلون اور بنیان پہنے وہ عام طور پر میز کے سامنے کھڑا کپڑوں کو استری کیا کرتا۔ اور اس کی بیمار بیمار سی زرد چہرے والی بیوی گندے کپڑوں کے ڈھیر میں بیٹھی انہیں اپنی لانڈری کا نشان لگایا کرتی۔ ہر وقت آگ کے سامنے رہنے سے بوڑھے کا چہرہ بہت زیادہ کمزور اور پیلا پڑ گیا تھا۔ کام ختم کر کے وہ لمبا اور

باریک نلکے والا پائپ سلگا لیتا اور باہر فٹ پاتھ پر لوہے کی کرسی پر دونوں گھٹنے چھاتی سے لگا کر بیٹھ جاتا اور ہر آنے جانے والے کو آدھ کھلی پراسرار چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے گھورنے لگتا۔ اس کی تیرہ چودہ سالہ لڑکی اوٹا شارات کے وقت خالی سڑک پر سکیٹنگ کیا کرتی تھی۔ سفید قمیض اور نیکر میں ملبوس اوٹا شا پاؤں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے پہیے (سکیٹس) باندھ لیتی اور بانہیں پھیلائے سڑک پر تیرنے لگتی۔ انور اگر اپنے کمرے میں کچھ پڑھ رہا ہوتا۔ تو اسے اوٹا شا کے پاؤں میں بندھے ہوئے پہیوں کے سڑک پر گھسنے کی آواز پر ٹرام کار کا شبہ ہوتا۔ اوٹا شا بڑی پیاری بچی تھی اور وہ کانونٹ اسکول میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ صبح کے وقت بچے بچیوں سے بھری ہوئی کانونٹ کی لاری ان کی دکان کے آگے رک جاتی۔ اوٹا شا گلے میں نیلا رومال باندھے کتابیں ہاتھ میں لیے دکان سے باہر نکلتی اور اچھل کر لاری میں سوار ہو جاتی۔

عین سامنے سالولیشن آرمی 'مکتی فوج' کا صدر دفتر تھا۔ دفتر کے بڑے دروازے پر صلیب کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایک ہی لباس میں ملبوس لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں دن بھر اس دفتر میں داخل ہوتی اور باہر نکلتی رہتیں۔ شام ہوتے ہی بلا ناغہ دفتر کے کھلے روشندانوں میں سے مذہبی گیت گانے کی لمبی اور نرم آوازیں سنائی دینے لگتیں جب سے جنگ شروع ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے مذہبی گیتوں کی سروس میں دوپہر کی سروس کا اضافہ کر دیا تھا یوس سٹریٹ کے کونے پر بنگالی چائے گھر (مانزی بھنڈار) تھا۔ یہاں کے رس گلے اور کافی رنگون بھر میں مشہور تھی۔ عنبزہ اپنے لیے ہر روز یہاں سے رس گلے منگاتی تھی۔ مانزی بھنڈار کے باہر، دروازے کے ساتھ ہی ایک بوڑھے برمی موچی نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا۔ لکڑی کے دو بڑے ڈبے پرانے سوکھے ہوئے جوتوں سے بھرے رہتے تھے۔ اپنے سامنے چمڑہ کاٹنے، سینے اور جوتا مرمت کرنے کے تقریباً تمام اوزار پھیلائے بوڑھا بوریئے پر بیٹھا سگار پیتے ہوئے اپنے کام میں معروف رہتا۔ اسے کام کرتے ہوئے خود بخود باتیں کرنے کی عجیب عادت تھی۔ پھٹا ہوا مرمت طلب جوتا ہاتھ میں لے کر وہ اسے اصیل مرغ کی طرح چاروں

طرف سے گھما پھرا کر دیکھتا اور ساتھ ساتھ بولے جاتا۔

"ہوں ل ل ..... چمڑا پرانا تھا۔ تلے میں گتا بھرا تھا۔ پالش کبھی کبھی کیا گیا ہے ـــ تو پھر پھٹتا کیا نہ کرتا۔ ہی ہی ہی ہی۔

خود بخود ہنستے ہوئے وہ سگار لکڑی کے ڈبے میں رکھ دیتا۔ بٹے ہوئے مضبوط دھاگے پر موم پھیرتا۔ تیز آرکی بوٹ کے تلے میں چبھوتا اور کام شروع کر دیتا۔ ساتھ ساتھ وہ رک رک کر بولے بھی جاتا۔

"اب تلہ مکمل ہو چکا۔ صرف چمڑے کا ٹکڑا لگانا باقی ہے۔ میرے خیال میں کیل ہی ٹھونک دینے چاہئیں۔ کیوں بھئی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

بوڑھا برمی موچی جھک کر بوٹ سے پوچھتا اور پھر کوئی جواب نہ پا کر خود ہی ہنسنے لگتا اور سگار منہ میں دبا لیتا۔ انور ایک مدت سے بوڑھے کو اسی گلی کے کونے میں ماتری بھنڈار کے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کی پچکی ہوئی کنپٹیوں پر سبز سبز رگیں ابھری ہوئی تھیں کھردری انگلیوں پر جا بجا زخموں کے نشان تھے۔ گنجے سر پر کہیں کہیں سفید بالوں کے کانٹے سے اُگ رہے تھے۔ منہ میں بہت کم دانت باقی رہ گیے تھے۔ اور گالوں کی زرد جھریوں بھری کھال نیچے لٹک آئی تھی۔ انور کبھی کبھی ماتری بھنڈار میں کافی پینے آتا تو اُسے بوڑھے موچی کی وہ تمام باتیں سنائی دیتیں جو وہ پھٹے ہوئے جوتوں سے کر رہا ہوتا۔ ایک روز اس نے بوڑھے کو کہتے ہوئے سُنا۔

"کیوں ری میری پیاری مزدورنی! تو ہر روز کتنا بوجھ اٹھائے پھرتی ہے۔ جتنی خوبصورت تو ہے کیا تمہاری مالکن کے پاؤں بھی اتنے ہی خوبصورت ہیں؟"

باہر نکلتے ہوئے انور نے دیکھا کہ بوڑھا موچی سرخ رنگ کی ایک خوبصورت سینڈل کی مرمت کر رہا ہے۔

ریڈیو سٹیشن پر اصل کام اردو پروگرام کے آغاز کے ساتھ شروع ہوتا لیکن انور دوپہر یعنی ایک بجے دفتر پہنچ جاتا تھا۔ ایک بجے سے لے کر ساڑھے چھ بجے

تک وہ سننے والے شہریوں اور فوجیوں کے آئے ہوئے خطوں سے بھتے کے فرمائشی پروگرام کا خاکہ بناتا ایک آدھ سکرپٹ لکھتا، اس روز کے ریکارڈوں کی فہرست لائبریرین کے حوالے کرتا۔ اور جب چار بجے مسٹر ریاض ملک میکسم بار کے گلی والے دروازے سے نکل کر دفتر میں داخل ہوتا تو اس کے بعد انگریزی خبروں کے ترجمے میں بھی وقت لگ جاتا گانے والوں اور والیوں سے وہ ایک روز پہلے اور پھر پروگرام شروع ہونے سے چند گھنٹے پہلے ضروری باتیں کہہ سن لیتا۔ وقت پر وہ کسی سے غیر ضروری تفصیلات میں پڑنے کے لیئے تیار نہ ہوتا۔ رنگون میں ہندوستانی گیت گانے والوں اور والیوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ گانے والے عام طور پر سورتی میمن نوجوان یا ہندوستانی قوال ہوتے اور گانے والیوں میں بنگالی گھریلو لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہ ہندو لڑکیاں شریف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں اور ریڈیو پر شوقیہ گاتی تھیں بہت کم لڑکیاں گانے کا معاوضہ قبول کرتیں۔ انور نے ہر بنگالی لڑکی کی آواز میں لوچ اور رسیلے پن کو بدرجہ اتم موجود پایا۔ ان کی آواز میں خاص قسم کا ٹھہراؤ اور گہرائی تھی۔ جو انور کو دوسری قوم کی عورتوں میں بہت کم نظر آئی۔ ہر آرٹسٹ کو گانے کے بعد رنگون ریڈیو کی طرف سے چائے۔ رس گلے اور پیسٹری کھلائی جاتی تھی۔ جو لڑکیاں گیت کا معاوضہ نہ لیتیں انہیں ٹھونس ٹھونس کر رس گلے اور پیسٹری کھلائی جاتی۔ انور ایک سٹوڈیو سے دوسرے سٹوڈیو میں جاتے ہوئے ٹی روم میں ضرور پھیرا مارتا۔ اور لڑکیوں میں گھوم پھر کر انہیں رس گلے جیب میں ڈالنے کی تلقین کرتا۔ لڑکیاں شرما کر ہنسنے لگتیں جو بے تکلفی سے کھا رہی ہوتیں۔ وہ ہاتھ کھینچ لیتیں اور انور گھڑی دیکھتے ہوئے جلدی سے سٹوڈیو میں گھس جاتا۔

"یہ رنگون ہے۔ کملا ماتھر سے سین چندر کا ایک اور گیت سنیئے ـــ"

کملا ماتھر کی آواز بہت دل کش تھی اور وہ رنگون کے ایک کامیاب بیرسٹر کی لڑکی تھی۔ کولمبیا اور ہز ماسٹرس وائس والوں کی طرف سے اسے ریکارڈ بتا کرانے کی پیش کش بھی ہوئی تھی۔ لیکن اس کے باپ نے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ کملا بھی راضی

نہ ہوتی تھی۔ وہ بھی ریڈیو سٹیشن سے اپنے گیتوں کا معاوضہ نہ لیتی تھی۔ مہینے میں اس کے چار پروگرام ضرور ہوتے تھے۔ لیکن جس روز کملا کی مرضی نہ ہوتی یا بارش ہو رہی ہوتی وہ گھر پر ہی بیٹھ رہتی۔ اور اس کی جگہ کوئی شیلا، میرا یا بلا گیت گا دیتی۔ کملا بڑی چنچل لڑکی تھی۔ اس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ عام طور پر اپنی چھوٹی سی کار میں ڈرائیور کے ساتھ آتی اور گنگناتے ہوئے ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں داخل ہوتی۔

"مسٹر انور! آج میں بھی جی بھر کے گانا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی آپ کوئی فلک (ELICK) وغیرہ نہ دیں۔

"یہ بات ہے؟ جب تو تمہارا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا؟"

"کیوں؟" کملا کے محراب دار ماتھے پر ننھی سی تیوڑی پڑ جاتی۔

"اس لیے کہ جناب کی آئٹم کے بعد ہمیں خبریں پڑھنا ہے۔"

اوہ مائی گاڈ — مسٹر انور کیا ہی اچھا ہو اگر آج آپ خبریں نہ پڑھیں۔"

"اوہ مائی گاڈس — مس کملا کیا ہی اچھا ہو اگر آج تم صرف رس گلے ہی کھاؤ۔"

پھر دونوں ہنس پڑتے۔ کملا کا رنگ سانولا، چہرے کے نقوش تیکھے اور جسم بھرا بھرا سا تھا۔ پروگرام ختم کرنے کے بعد وہ ٹی روم میں چائے۔ پیسٹری اور رس گلوں پر ٹوٹ پڑتی اور دوسری لڑکیوں سے ہنسی مذاق شروع کر دیتی۔ ایک بار انور نے پوچھا:۔

معلوم ہوتا ہے کملا تم گھر سے بھوکی آتی ہو۔"

"آنا ہی پڑتا ہے۔"

"کیوں؟"

"رس گلے جو کھانا ہوتے ہیں۔"

"تو تم معاوضہ لے لیا کرو۔"

"پھر ذرا شان میں فرق آجاتا ہے۔"

"اچھا یہ بات ہے — اب کل ہی اخبار میں پڑھ لینا۔"

"کیا؟" کملا رس گلہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

یہی کہ کملا نے رنگون ریڈیو پر رس گلوں کا صفایا کر دیا۔ ماتری بھنڈار پر حملے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

کملا اور اس کے ساتھ ہی دوسری بنگالی اور مدراسی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں

چھ ماہ کی پابندی کے بعد قاضی صاحب کو ضمانت واپس مل گئی۔ اور روزنامہ "مجاہد" و "ہیر پھیر" پھر سے نکلنے لگا۔ وہ خاص طور سے انور کو ریڈیو سٹیشن پر ملنے آئے۔

"برخوردار! اخباری زندگی کا تجربہ تمہیں ہندوستان میں بھی کام آسکتا ہے ریڈیو کی نوکری کا کیا بھروسہ۔ کل جنگ ختم ہو گئی تو تمہیں جواب مل جائے گا۔ میں تمہارے کام سے بے حد خوش ہوں اور اسی لیے تمہیں دوبارہ اپنے سٹاف میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

لیکن انور دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ وہ اب زندگی بھر کسی اخبار کے دفتر میں کام نہ کرے گا۔ اسے میکائیل کے وہ الفاظ کبھی نہ بھول سکتے تھے۔

اگر میری کبھی شادی ہوئی تو میں اپنے بچوں کو گھوڑوں کی نعل بندی کا کام سکھاؤں گا اور کبھی اخبار نہ پڑھنے دوں گا۔"

قاضی صاحب کو ناکام لوٹنا پڑا۔ میکائیل نے پھر سے دونوں اخبارات کے مزاحیہ کالم سنبھال لیے اسے قاضی صاحب کی ملاقات کا پتہ چلا تو اس نے انور کو فون پر اخباری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہونے کی مبارک باد پیش کی۔ قاضی صاحب نے ہندوستان سے دوبارہ کاتب منگوا لیے تھے۔ اس دوران میں ناٹر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ انور کو صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ ان کا گھر رنگون جیٹی کی طرف، کہیں ہے۔ وہ جس انگریزی فرم میں ملازم تھا۔ وہاں سے بھی کام چھوڑ چکا تھا انور نے بہتیری کوشش کی۔ لیکن اتنے بڑے شہر میں ایک دبلے پتلے مختصر سے

لڑکے کا کھوج لگانا کافی دقت طلب کام تھا۔ علاوہ ازیں انور کو ریڈیو کی مصروفیات سے ہی چھٹکارا نہ ملتا تھا۔

اخبارات سے پابندی اٹھتے ہی رنگون ریڈیو نے قاضی صاحب، اور میکائیل احمد کو تقریروں اور جنگ کے حالات پر تبصروں کا کنٹریکٹ بھیج دیا۔ قاضی صاحب جب بھی تقریر شروع کرتے پہلے السلام علیکم کہتے اور بعد میں تقریر کچھ اس قسم کے جملے پر ختم کرتے۔

"اس موضوع پر انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں روشنی ڈالی جائے گی۔"

اردو شعبے کے انچارج مسٹر ریاض ملک نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ تو قاضی صاحب سخت ناراض ہوئے۔

"آپ مسلمان ہو کر مجھے ایسا کرنے سے منع کرتے ہیں؟"

لیکن کیا کیا جائے۔ رنگون ریڈیو مسلمان نہ تھا۔ چنانچہ قاضی صاحب کا کنٹریکٹ کینسل کر دیا گیا۔ میکائیل احمد کو معاوضے کا جو چیک ملتا۔ وہ اسے جیب میں ڈال کر گلی والے دروازے میں سے میکسم بار میں داخل ہو جاتا۔ چیک بار کے منیجر مسٹر ہمپٹی کے پاس جمع کرا دیتا اور تین دن تک بلا ناغہ وہیں سے شراب پیتا۔ اب میکائیل صرف انہی دنوں تاڑی خانے کا رخ کرتا۔ جب اس کی جیب بالکل خالی ہوتی۔ عام طور پر وہ میکسم بار میں ہی رات کو دیکھا جاتا کیونکہ مانڈلے وسکی خالص دیسی شراب تھی اور کافی سستی مل جاتی تھی۔

ایک روز عنیزہ نے ریڈیو سٹیشن دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے ہمراہ اس کی اماں بھی تیار ہو گئی۔ انہوں نے جھولا نما سفید برقعے اوڑھے اور گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر فیئر سٹریٹ کی طرف چل پڑیں مسٹر ڈی کوسٹا نے کنٹرول روم میں انہیں تمام کل پرزے دکھلائے۔ ٹرانسمیٹر کے اندر چھوٹے چھوٹے ان گنت پرزوں اور تاروں کا جال بچھا دیکھ کر عنیزہ کی ماں نے برقعہ کے اندر سے پوچھا۔

"قوال یہاں بیٹھ کر گاتے ہوں گے؟"

انور نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مسٹر ڈی کوسٹا اردو زبان نہ جانتا تھا۔ سٹوڈیو نمبر ۲ میں مور کی شکل ایسا بڑا سا چنگ پڑا تھا۔ عنیزہ نے انور سے پوچھا۔

"تم نے کبھی مور کا گوشت کھایا ہے؟ میرے اللہ میں تمہیں کیسے بتاؤں اس میں کتنی لذت ہوتی ہے۔"

سارا ریڈیو اسٹیشن دیکھنے کے بعد انور انہیں ٹی روم میں لے آیا۔ عنیزہ نے سب سے پہلے رس گلوں کی پلیٹ صاف کی۔ پھر پیسٹری سے دو دو ہاتھ کیے اس کے بعد چائے پیتے ہوئے اس نے ڈکار مار کر شکر الحمد اللہ کہا۔ اور پھر پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"رس گلے تو ماتری بھنڈار والے بناتے ہیں۔ کیوں انور صاحب! آپ نے تو ضرور کھائے ہوں گے۔"

واپس چلتے ہوئے جب عنیزہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوئی۔ تو وہ اپنی اماں سے کہہ رہی تھی۔

"آج پھر معدہ جل رہا ہے۔"

۶

ایک روز انور مسٹر ڈی کوسٹا کے ہاں جا رہا تھا کہ اس نے جھیلوں والے باغ کے عقب میں سے گزرتے ہوئے ساتیں کو دیکھا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ناریل کے درختوں میں سے ہو کر گزر رہی تھی جس پگڈنڈی پر وہ چل رہی تھی۔ وہ آگے جا کر منکی پوائنٹ روڈ سے آ کر ملتی تھی۔ انور سڑک اور پگ ڈنڈی کے سنگھم پر جا کھڑا ہوا۔ ساتیں ذرا فاصلے پر اپنے خیال میں مگن اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر اچانک اس کی نگاہ انور پر پڑی۔ اور وہ ٹھٹھک سی گئی۔ انور اسے کئی ماہ بعد دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اس وقت بھی کنول کے نوتازہ پھولوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ساتیں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بیدار ہوئی۔ وہ جلدی سے بولی۔

"آپ پھر پیگوڈا نہیں آئے جناب؟"

انور نے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دے کر ساتیں کو گھور کر دیکھا۔

"ساتیں! یہ جھوٹ بولنا تم نے کب سے شروع کیا؟"

ساتیں کا معصوم چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

"کیوں جناب؟"

"وہ یوں جناب کہ میں تین دفعہ پیگوڈا گیا۔ لیکن تمہارا کہیں نشان بھی نہ ملا۔ اب میں کسی سے پوچھتا بھی کیا؟"

ساتیں تیزی سے بولی۔

"لیکن میں نے تو ایک ماہ سے وہاں جانا چھوڑا ہے۔ اس سے پہلے تو آپ بھی نہیں آئے؟"

معاً انور کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ پتلون سے باہر نکال لیے اور ساتیں کے ساتھ بڑی سڑک پر روانہ ہوا۔ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"مگر تم نے پھولوں کا دھندا کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہمارے تالاب میں پھولوں کا موسم ختم ہو گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"جناب ہمارے ہاں اس موسم میں پھول بہت ہی کم تعداد میں ہوتے ہیں۔"

"تو منڈی سے کیوں نہیں خرید لیتے؟"

"منڈی سے خرید کر بیچنے میں نفع بہت کم ہوتا ہے۔"

"منافع نہ سہی لیکن کام میں دل تو لگا رہتا ہے۔"

ساتیں زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"دل لگانے کے لیے میرے پاس اور بہت سے کام ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ میں گھر کا سارا کام کرتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ روزانہ اپنے بوڑھے باپ کے لیے پانی گرم کرتی ہوں۔ گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ کپڑے دھوتی ہوں پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرتی ہوں۔ میرا بھائی جونوں کے کارخانے میں نوکر ہے۔ کبھی کبھی اس کے جوتوں پر روغن پھیرتی ہوں۔"

"اوہو — تم تو بہت کام کرتی ہو۔"

"جی ہاں۔ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

وہ دونوں کچھ دور تک خاموشی سے چلتے گئے۔ سڑک پر کبھی کوئی کار تیزی سے گزر جاتی تو تیز ہوا میں ساتیں کے بال لہرانے لگتے۔ اس کے ساتھ قدم قدم چلتے ہوئے انور کو محسوس ہوا کہ ساتیں کے بغیر، اس سے دور رہ کر گزرنے والے لمحات کس قدر دردانگیز اور تاریک ہو سکتے ہیں ساتیں کے ہاتھ میں ٹوکری تقریباً خالی ہی تھی۔ صرف پیاز کی دو تین گنٹھیاں پڑی تھیں۔ ساتیں نے اپنا چہرہ انور کی طرف اٹھا کر پوچھا۔

"لیکن جناب، آپ کہاں کام کرتے ہیں؟"

"میں؟" انور سوچنے لگا پھر فوراً بولا۔ "میں سرکا کے دفتر میں نوکر ہوں۔"

"بڑے دفتر میں؟" ساتیں نے خوبصورت بالوں والا سر ہلا کر کہا:۔

ہوں ـــ بڑے دفتر میں۔"

"کیا طلب ملتی ہے؟"

اب انور ذرا گھبرایا ساتیں اس قسم کے احمقانہ سوال کیوں کر رہی ہے؟"

"طلب؟" ـــ یہی کوئی دو اڑھائی سو روپیہ۔"

ساتیں کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"دو اڑھائی سو روپیہ؟"

"ہاں ہاں ـــ لیکن اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــ مگر جناب میرا بھائی پچیس روپے طلب پاتا ہے۔"

"وہ کیا کرتا ہے؟"

وہ جوتوں کے کارخانے میں ملازم ہے ـــ وہاں چپڑاسی ہے جناب۔"

انور چپ ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر موضوع بدل ڈالا۔

"ساتیں تمہیں کہاں تک جانا ہے؟"

ساتیں نے گویا چونک کر سڑک کے دائیں بائیں اور پھر سامنے دور تک دیکھا اور بولی۔

"میں تو اپنے گھر جا رہی ہوں۔"

"گھر؟"

"جی ہاں ـــ شہر میں اماں کو لینے آئی تھی۔ وہ بیرسٹر صاحب کی کوٹھی میں کام کرتی ہیں۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ گھر چلی گئی ہے۔"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"کلا بستی میں۔"

"لیکن وہ تو یہاں سے کافی دور ہے۔"

"مچھلی منڈی سے چھکڑے ہمارے گاؤں جاتے ہی رہتے ہیں۔ میں وہاں سے چھکڑے پر سوار ہو جاؤں گی۔ میرا خیال ہے۔ اماں بھی وہیں ہو گی اور آپ کہاں جا رہے ہیں جناب؟"

"مجھے صرف منکی پوائنٹ تک جانا ہے۔"

"آپ بس پکڑ لیتے۔"

"پھر تم سے ملاقات کیسے ہوتی؟"

ساتیں کے زرد چہرے پر بیک وقت کئی رنگ لہرا گئے اس نے یوں سر جھکا لیا۔ گویا اب وہ دوبارہ اوپر نہیں اٹھے گا۔ انور بے خیالی میں یہ جملہ کہہ گیا تھا۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی پہلے سے کہیں زیادہ گہری تھی۔ لیکن انہیں ایک دوسرے کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ انور کہہ رہا تھا۔

"ساتیں مجھے تمہارے تالاب میں کھلنے والے پھولوں سے محبت ہے۔ میں ہی، تمہاری ماں، تمہارے بوڑھے باپ اور تمہارے بھائی ـــ تم سب لوگوں سے پیار کرتا ہوں۔ تم ایراوتی کی لہروں سے پیدا ہوئی ہو ـــ تمہارے جسم میں ایراوتی کے کنارے اگنے والے ناریل کی مہک ہے....."

اور ساتیں کہہ رہی تھی۔

"پردیسی تم مسلمان ہو اور ہم صدیوں سے مہاتما بدھ کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہمارا

تمہارا ملاپ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کاش تم بدھی ہوتے اور کلا بستی میں تمہارا گھر ہوتا۔ اور ہم برادری کی گیلی ریت پر کھیلا کرتے۔ لیکن اجنبی تم کسی اور دیس سے آئے ہو۔ تم کسی اور بھگوان کی پوجا کرتے ہو پھر ہماری محبت کا پھول کیسے کھل سکتا ہے۔ ہماری محبت مندر کی سیڑھیوں سے شروع ہوئی تھی اور سڑک پر آکر رک گئی ہے۔ ہمیں یہیں ٹھہر جانا ہوگا۔ اس کے آگے جوالا مکھی کا آتشیں دہانہ شروع ہوتا ہے.....“

لیکن منکی پوائنٹ پر پہنچ کر جب انور نے ساتیں سے پوچھا۔ کہ پھر کب ملاقات ہوگی تو اس نے بھولپن سے گردن اٹھا کر کہا۔

”اگلی اتوار کو میں پھر موسی کے ہاں آؤں گی۔ کیا آپ بھی یہاں اپنے دوست کے ہاں آئیں گے؟“

”ہاں ساتیں ـــــ میں ضرور آؤں گا“

ساتیں نے مسکراتے ہوئے انور کو دیکھا اور آگے گزر گئی۔ کچھ دور جا کر جب وہ ایک موڑ مڑنے لگی تو اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ انور ابھی تک وہیں کھڑا تھا جب ساتیں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ سڑک سے ہٹ کر اس کچے راستے پر گھوم گیا۔ جو تاڑ کے اونچے لمبے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اور دریا تک چلا گیا تھا آسمان بھورے رنگ کے ہلکے ہلکے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دریا کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ مسٹر ڈی کوسٹا اور مسز ڈی کوسٹا اپنے گھر کے باہر گھاس پر کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ مسز ڈی کوسٹا ادھیڑ عمر کی عورت تھیں۔ جسم ڈھل چکا تھا لیکن لپ سٹک اور پاؤڈر کے سہارے چہرے کی تھوڑی بہت دل کشی قائم رکھے ہوئے تھیں۔ انور قریب پہنچا۔ تو مسٹر ڈی کوسٹا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کیا بس لیٹ تھی؟“

”ہاں کچھ ایسی ہی بات تھی“

مسٹر ڈی کوسٹا نے اپنی بیوی کا تعارف کروایا۔

”میری بیوی ـــ مسٹر انور، سکرپٹ رائٹر“

”آپ کیسی ہیں مادام؟“

”آپ کیسے ہیں مسٹر انور؟“

انور اور مسٹر ڈی کوسٹا دفتری امور پر گفتگو کرنے لگے۔ مسز ڈی کوسٹا نے دل چسپی لینے کی کوشش کی۔ لیکن بہت جلد وہ بور ہوگئی۔ اور برآمدے میں جا کر بچوں سے کھیلنے لگی۔ قریباً پون گھنٹہ باتیں کرنے کے بعد وہ دونوں اٹھے اور بس میں بیٹھ کر ریڈیو سٹیشن آگئے۔

اتوار کے دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور تڑکے ہی سے ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ٹھیک وقت پر انور نے برساتی اوڑھی اور بس میں سوار ہو کر اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں ساتیں نے انتظار کرنے کو کہا تھا۔ درختوں کی بھیگی ہوئی شاخوں میں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور زمین پر لمبی گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ انور سڑک سے اتر کر پگ ڈنڈی پر آگیا۔ اور ایک برساتی نالے کی چھوٹی سی پلیا پر بیٹھ کر ساتیں کا انتظار کرنے لگا۔ پیچھے دریا کی طرف سے آنے والی ہوا کبھی گرم تھی اور کبھی خنک ـــ ناریل اور تاڑ کے درختوں میں سے ہو کر گزرنے والی پگ ڈنڈی دور تک ویران تھی۔ تنوں کے درمیان میں سے جھیلوں والے باغ کے چند ایک ہرے بھرے لان نظر آرہے تھے۔ سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بسیں گزر رہی تھیں انور کو دور پگ ڈنڈی پر سایہ سا دکھائی دیا۔ وہ سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے رک گیا۔ سایہ درختوں کے جھرمٹ سے باہر نکلا تو وہ ایک برمی پھنگی (بدھی بھکشو) تھا جو زرد دھوتی میں ملبوس سر پر ناریل کے پتوں کی چھتری کیے ہوئے تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس نے چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں سے انور کو گھورا۔ لیکن انور اپنے خیال میں مگن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ کافی دیر انتظار کے بعد جب انور کو یقین ہو چکا کہ ساتیں نے اسے بے وقوف بنانا چاہا تھا۔ اور وہ اس بھیگے ہوئے موسم میں اپنے گھر آرام سے بیٹھی ہوگی۔ تو وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ برساتی کندھوں پر اچھی طرح پھیلا کر اس نے سگریٹ پاؤں تلے مسل ڈالا اور پگ ڈنڈی پر واپس چل پڑا۔ اس کے دل میں کوئی آواز اسے

سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی کہ ساتیں ضرور آئے گی، ساتیں ضرور آئے گی۔ چنانچہ سڑک کے بجائے اس نے باغ میں سے ہو کر جانے والا راستہ اختیار کر لیا۔ بوندا باندی رک گئی تھی۔ درختوں کے نیچے ہوا بالکل بند تھی۔ اور سیلی زمین نیم گرم بخارات چھوڑ رہی تھی اور اس کی پتلون کے پائینچے بھیگ رہے تھے۔ اتوار کی وجہ سے جھیلوں والے باغ میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ بارش کے رک جانے سے لوگ عارضی پناہگاہوں اور گھنے درختوں کی چھاؤں سے باہر نکل آئے تھے اور پیچدار پتھریلی روشوں پر آزادی سے چل پھر رہے تھے۔ خادماؤں بچہ گاڑیاں روکے سبز گھاس پر بچوں سے کھیل رہی تھیں۔ جھیلوں کی طرف سے عورتوں کے دوڑنے بھاگنے کی مسرور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بارش میں دھل جانے سے پھولوں کا رنگ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر گیا تھا اس قدر سہانے اور مسرت سے بھرپور لمحات میں بھی انور کا دل پژمردہ تھا۔ ساتیں سے نہ ملنے کا دکھ کہرے کی دبیز چادر بن کر اس کی روح کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اور اس چادر میں سے خوشی و مسرت کی غیر مرئی کرنوں کا گزر محال تھا۔

"وہ کیوں نہیں آئی؟ وہ کیوں نہیں آئی؟"

یہی ایک سوال تھا جو بار بار اس کے ذہن میں پیدا ہو رہا تھا۔ اور جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کوئی برمی لڑکی سامنے سے آتی دکھائی دیتی۔ تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ آگئی ہے ـــــ لیکن قریب پہنچنے پر اسے ناامیدی ہوتی اور اس کا دل پہلے سے زیادہ بوجھل ہو جاتا۔ اب اسے معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ ساتیں، اس برمی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا اسے کئی بار خیال آیا کہ ساتیں نے اس سے فریب کھیلا ہے اور اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہر بار اس معصوم پھول بیچنے والی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ جو کنول کے زرد پھول کی طرح اپنا منہ اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔

"اگلی اتوار کو میں پھر موسی کے ہاں آؤں گی۔ کیا آپ بھی اپنے دوست کے ہاں آئیں گے؟"

اور پھر انور ان پر محبت الوداعی نگاہوں کا خیال کرتا۔ جنہوں نے سڑک کے موڑ پر اسے پلٹ کر دیکھا تھا ـــــ خاموش و غمگین نگاہیں! ان میں طلوعِ محبت کی تروتازگی اور گرمی تھی پھر ساتیں نے اپنے وعدے کو فراموش کیوں کیا؟ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ ایک زخم خوردہ پردیسی پلیا پر بیٹھ کر اس کی راہ دیکھ رہا ہوگا! عورت بھول جاتی ہے، گزر جاتی ہے۔ اس کے دل کی مہمان سرائے میں ہر جذبہ کسی نامعلوم پردیسی کی طرح داخل ہوتا ہے اور رات دو رات ٹھہر کر وہاں سے کوچ کر جاتا ہے ـــــ سیال مادے کی مانند وہ ہر سانچے میں ڈھل سکتی ہے۔ اور ہر ماحول کو اپنا سکتی ہے۔ انور سگریٹ سلگانے کے لیے رکا تو اسے خیال آیا۔ کہ ایک دم واپس پلٹ کر اسی جگہ پہنچے جہاں ساتیں نے ملنے کا وعدہ کیا ـــــ یوں وہاں جیسے وہ برساتی نالے کے پل پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اس خوبصورت خیال پر جی ہی جی میں ہنس پڑا۔ اور بجھی ہوئی دیاسلائی کے ہمراہ اسے بھی کوڑے کرکٹ والی ٹوکری میں پھینک دیا۔

وہ جس روش پر سے گزر رہا تھا۔ اس کی ایک جانب سرسبز گھاس کے پھولوں بھرے تختے باغ کے مغربی دروازے تک چلے گئے تھے۔ اور دوسری جانب ایک اونچا سا ٹیلہ تھا۔ جہاں بانس اور ساگوان کے درختوں کے جھنڈ اگے ہوئے تھے ایک پتلا سا پرپیچ راستہ درختوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا ٹیلے کے اوپر تک چلا گیا تھا انور اس راستے پر چلنے لگا۔ ٹیلے کے اوپر ساگوان کے درختوں میں گھرا ہوا چھوٹا سا ہموار ٹیلہ تھا۔ جس کے وسط میں مہاتما بدھ کا سنگین بت نصب تھا۔ انور قدرے سستانے کے لیے یہاں ایک آہنی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ٹیلے کی دوسری جانب جھیلوں کا سلسلہ تھا۔ اس طرف سے لڑکیوں کے ایک دوسرے کو بلانے اور ایک دوسری کے پیچھے بھاگنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی وقت تیز سیٹی کی آواز گونج جاتی اور کبھی کوئی لڑکی بلند آواز میں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں انور کو یہ پرمسرت اور زندگی سے لبریز آوازیں بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔ وہ اگرچہ اپنے غمگین خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو ان صحت مند آوازوں سے الگ بھی نہ کرنا چاہتا تھا ان میں چند ایک

آوازیں ایسی تھیں جن پر انور کو شبہ ہوا کہ اس نے انہیں کہیں پہلے بھی سنا ہے۔ لیکن وہ آوازیں کن کی تھیں؛ انور کو یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے ذہن میں ابھی تک وہی آواز گونج رہی تھی۔ جس نے اس کے دل تک ساتیں کے یہ الفاظ پہنچائے تھے "میں اگلی اتوار کو پھر موسی کے ہاں آؤں گی۔"

آج اگلی اتوار ہی تھی۔ پھر وہ اپنی موسی کے ہاں کیوں نہیں آئی؟ اسے درخشاں کا خیال آگیا۔ وہ پراسرار ایرادتی شہزادی جس نے اس کی اوّلین مثالی محبت کے تصور کو پیاز کے چھلکے سمجھ کر کچرا گلی میں پھینک دیا۔ ہر عورت ایرادتی شہزادی نظر آتی ہے لیکن درخشاں ثابت ہوتی ہے۔ ہر عورت پیاز کا چھلکا ہے۔ دیکھو تو نازک اور خوش رنگ۔ لیکن ذرا چکھو تو زبان کڑوی ہو جائے گی۔ اور آنکھوں میں پانی آجائے گا ان کا صرف ایک ہی مصرف ہے اور وہ یہ کہ انہیں گھی میں بھون کر کھا جاؤ ــــ سگریٹ پھینک کر انور نے برساتی کا سرہانہ بنایا۔ اور ٹانگیں بنچ پر پھیلا کر لیٹ گیا۔ ایکا ایکی اسے یوں معلوم ہوا۔ جیسے چند ایک لڑکیاں جھیلوں کی طرف سے ٹیلے کے اوپر چڑھی آرہی ہوں۔ وہ اطمینان سے لیٹا رہا۔ بتدریج لڑکیوں کی آوازیں صاف ہوتی گئیں اور اب وہ بالکل چند گزوں کے فاصلے پر تھیں۔ ایک لڑکی جس کا سانس پھول رہا تھا۔ بولی۔

"ہائے دیدی؛ تھرمس تو نیچے ہی بھول آئے۔"

"کوئی بات نہیں ــــ آہا! یہاں تو مونگرہ کے پھول ہیں۔"

یہ آواز قدرے نیچے سے آئی تھی اور انور کو جانی پہچانی سی معلوم ہوئی لیکن وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ اب اسے پتھریلی راہگذر پر پاؤں جما جما کر اوپر چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے عقب میں جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

"اوئی ــــ یہاں تو کوئی سو رہا ہے۔"

اگرچہ انور کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن وہ اپنے قریب ایک ناواقف لڑکی کو دیکھ سکتا

تھا جو اسے بنچ پر لیٹا پاکر اچانک پیچھے ہٹ گئی تھی اور بڑی بڑی پلکیں جھپکاتی اسے حیرانگی سے تک رہی تھی۔ "دیکھوں تو کون لیٹا ہے؟"

یہ دوسری لڑکی کی آواز تھی جو آگے بڑھی اور انور کو غور سے دیکھ کر بے اختیار بول اٹھی۔ "ارے ــــ یہ تو انور بابو سو رہے ہیں۔"

انور کی آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔

سامنے ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس کملا ماتھر کھڑی تھی وہ جلدی سے برساتی سنبھال کر اٹھ بیٹھا۔ کملا کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن شیلا بھی تھی۔ جس کی ساڑی کا رنگ شوخ تھا۔ کملا قریب آگئی۔ "انور بابو، ہم نے خواہ مخواہ آپ کو جگا دیا۔"

"کوئی بات نہیں ــــ میں ابھی ابھی لیٹا تھا۔" انور نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا

"لیکن آپ اکیلے یہاں کیوں پڑے ہیں؛ شیلا نے بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔ انور پرلی طرف منہ کر کے پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

"یونہی ــــ گھومتے پھرتے تھک گیا تھا۔"

کملا مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ جھیلوں کی طرف کیوں نہ آگئے۔"

"وہاں کیا تھا؟"

"میں نے آج اپنی سہیلوں کو دعوت دی تھی۔ ہم لوگ کب سے وہاں کھیل کود رہے ہیں۔ چلیئے آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔ کملا، سرتیا، میرا ــــ میری بھابی اور بڑی دیدی ــــ سبھی وہاں جمع ہیں۔ اٹھئے ناں۔"

انور تنہائی چاہتا تھا اور یہ لڑکیاں اس سے یہی چیز چھین رہی تھی۔ تاہم کملا ماتھر کا مسکراتا اور خوشی سے جگمگاتا ہوا چنچل اور پر رونق چہرہ انور کو بڑا بھلا لگا اور وہ دل ہی دل میں ان ہنس مکھ لڑکیوں کی سنگت مل جانے پر بہت خوش تھا۔ لیکن اس نے خوشی کے اس گہرے جذبے پر اپنی برساتی پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کملا! تم لوگ پک نک کا لطف اٹھاؤ۔ مجھے واپس دفتر جانا ہے۔"

کملا جلدی سے بولی۔

مگر آج نو اتوار ہے اور اتوار کو آپ شام کے بعد ریڈیو سٹیشن جاتے ہیں۔"

انور لاجواب سا ہو گیا۔ شیلا ضدی بچے کی طرح منمنائی۔

"اچھے ناں انور بالو۔"

"چلیئے نا ذرا لطف رہے گا۔"

انور چلنے کے لیے تیار ہو گیا شیلا نے برساتی اٹھالی۔ اور وہ تینوں ٹیلے سے جھیلوں کی طرف اتر گئے نیچے جھیل کے کنارے آم اور دریان کے درختوں کے درمیان ان لڑکیوں نے گھاس پر سفید چاندنی اور قالین بچھا رکھا تھا۔ دو تین لڑکیاں وہاں بیٹھی پلیٹوں میں مٹھائی لگا رہی تھیں۔ کملا کی بھابھی اور بڑی دیدی ذرا پرے کھانے پکانے میں لگی تھیں۔ قریب ہی چینی کے برتن، گلاس، پلیٹیں، پیالے بکھرے ہوئے تھے۔ ذرا پرے درخت میں جھولا ڈال رکھا تھا۔ دو لڑکیاں اسے زور زور سے جھلا رہی تھیں اور ان کی ساڑھیوں کے پلو ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ بچے بچیاں جھاڑیوں میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ جھیل کی پرسکون سطح پر چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان کنول کے آدھ کھلے، نیم کھلے اور پورے کھلے ہوئے زرد، گلابی اور دودھیا پھول سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ایک بھاری جسم کی ادھیڑ عمر عورت جھیل کنارے بیٹھی شیشے کے گلاس مانجھ رہی تھی۔ انور کے وہاں پہنچتے ہی قالین پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے مٹھائی کے لفافے اور پلیٹیں وہاں سے اٹھالیں۔

ارے یہ مٹھائی کے لفافے کیوں اٹھا لیے؟"

بملا اور میرا شرما گئیں۔ کملا اور شیلا زور سے ہنس پڑیں۔ ان کی آواز پر کملا کی بھابھی اور بڑی دیدی اور جھولا جھولنے والیوں نے گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔

کملا نے اپنی بھابھی اور دیدی سے انور کا تعارف کرایا۔ ان دونوں نے شرماتے ہوئے انور کو دیکھا اور ساڑھیوں کے پلو درست کر لیے۔ شیلا نے برساتی نیچے رکھ کر تھرمس سے گرم گرم کافی نکال کر پیالے میں ڈالی اور انور کے آگے رکھ دی۔ انور نے پیالی اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"اور یہاں رس گلے کھانا منع ہے کیا؟"

"جی ہاں۔" کملا نے شرارت سے سر ہلا کر کہا اور اس کے جوڑے میں سے کنول کا سفید پھول گھاس پر گر پڑا۔

"معاف کیجئے گا آپ کے جوڑے میں سے رس گلا گر گیا ہے۔"

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ گلاس مانجھتے ہوئے برمی خادمہ بھی زیر لب ہنس پڑی۔ لیکن انور اسے دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ خادمہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ لمبے قد والی دبلی پتلی سرتیا بولی۔

"انور بھائی ہم نے سنا ہے آپ مانڈلے جا رہے ہیں؟"

انور نے دیکھا۔ میرا ذرا پرے ٹب میں ہاتھ ڈالے آم ٹٹول رہی تھی۔

"جی ہاں — میں وہاں جا کر آم بھیجوں گا۔"

میرا کے ہاتھ میں آیا ہوا آم نیچے گر پڑا۔ انور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اور اس کے بعد وہاں ہنسی مذاق اور قہقہوں کا بازار گرم ہو گیا۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے شیلا جھیل میں سے ڈھیر سارے کنول کے پھول توڑ لائی۔

"بھائی جان ان میں سے جو آپ کو پسند ہیں وہ میرے جوڑے میں لگا دیجئے۔"

انور نے چند ایک کو چھوڑ کر باقی سارے پھول شیلا کے جوڑے میں لگا دیئے شیلا عجیب کارٹون سا بن گئی۔ کملا اور سرتیا نے اس کا وہ مذاق اڑایا کہ اس نے طیش میں آ کر سارے پھول نوچ ڈالے۔

کھانے کے بعد کملا نے جھیل پار کے ٹیلوں پر چڑھائی کا پروگرام پیش کر دیا۔ شیلا کے علاوہ اور کوئی لڑکی ساتھ چلنے پر تیار نہ ہوئی۔ سرتیا اور میرا کو جھولا نہ جانے دیتا تھا۔ بملا نے گلاب جامن کئی ہزار من کھا لیے تھے اور اب قالین پر چت لیٹی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی اور بھابی اور دیدی برتنوں کے رکھ رکھاؤ میں مصروف تھیں چنانچہ انور، شیلا اور کملا — تینوں سیر کے لیے چل پڑے۔

جھیل کا پاٹ کوئی آدھ میل آگے جا کر تنگ ہو گیا تھا۔ یہاں لکڑی کا ایک

خوبصورت پل دونوں کناروں کو آپس میں ملاتا تھا۔ پُل پر سے گزر کر انہوں نے اناس کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے پودوں میں سے ایک راستہ دریافت کر لیا۔ یہ راستہ جھیل کی دلدل اور کیچڑ سے بچ کر ٹیلوں تک چلا گیا تھا۔ جھیل پار والے ٹیلے نسبتاً زیادہ اونچے تھے اور اوپر گھنے جنگل سے اگے ہوئے تھے۔ ڈھلوانوں پر ناگ پھنی اور کرنڈا کی گنجان جھاڑیاں تھیں۔ جن کے بیچوں بیچ پتھریلے نالے بہہ رہے تھے۔ کملا کا خیال تھا۔ کہ ان ٹیلوں کے اوپر مہاتما بدھ کے وقتوں کی ایک پرانی بارہ دری ہے جس کے چھت پر سونے کا پترا چڑھا ہوا ہے۔ وہ اس بارہ دری پر اپنا نام لکھنا چاہتی تھی۔ انور کو یہ خیال اگرچہ احمقانہ معلوم ہوا۔ لیکن اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اور اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ چڑھائی تکلیف دہ نہ تھی۔ لیکن راستہ دشوار گزار ضرور تھا۔ پتلی سی پگڈنڈی تھی جس پر بارش کے باعث پھسلن ہو رہی تھی۔ پھر پتلے سانپ کی مانند یہ پگ ڈنڈی چلتے چلتے اچانک ایک طرف گھوم کر جھاڑیوں میں گھس جاتی تھی راستے پر جگہ جگہ اگا ہوا لمبا گھاس اس بات کا ثبوت مہیا کر رہا تھا کہ اس کی طرف شاذ و نادر ہی کوئی آدمی آتا ہے انور سب سے آگے تھا۔ شیلا اور کملا نے ساڑھیوں کے پلّو کمر کے گرد اچھی طرح کس لیے تھے اور خاردار جھاڑیوں اور نیچے جھکے ہوئے درختوں کی لمبی ٹہنیوں سے بچتی بچاتی چلی آ رہی تھیں۔ انور شاخوں کو ادھر ادھر ہٹا کر راستہ صاف کیے جا رہا تھا۔ پھر بھی ان دونوں کی ساڑھیاں کئی بار کانٹوں میں الجھیں کچھ دور اوپر چڑھنے کے بعد ان دونوں کا دم پھول گیا۔ شیلا کے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور وہ کئی گز پیچھے رہ گئی تھی۔ راستہ اس قدر پیچ دار تھا۔ کہ ہر تیسرے قدم پر اگلا آدمی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بار بار انور اور کملا کو رک کر شیلا کا انتظار کرنا پڑا تین چوتھائی چڑھائی ختم کرنے کے بعد شیلا بہت پیچھے رہ گئی۔ کافی انتظار کے بعد جب وہ پگ ڈنڈی پر نمودار نہ ہوئی۔ تو انور نے اسے آواز دی۔ شیلا کی آواز کہیں دوسری طرف سے سنائی دی انور اور کملا سمجھ گئے کہ شیلا نے راستہ کھو دیا ہے۔ انور نے بلند آواز سے پکارا۔

"ہم اس طرف ہیں شیلا"

شیلا کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی۔

"ہائے دیدی — میں کہاں آ گئی ہوں"

کملا ہنس پڑی۔

"اری پگلی اوپر کی طرف چڑھتی چلی آ۔ یہ راستہ بہر حال اوپر ہی جاتا ہے"

"پر دیدی مجھے ڈر لگتا ہے"

انور اور کملا زور سے ہنس پڑے شیلا کی آواز پھر سنائی دی۔

"تمہیں تو ہنسنے سے کام ہے کوئی مرے یا جیئے"

"اری میری منی تو مرتی نہیں — ہم بارہ دری میں تمہارا انتظار کریں گے"

اس کے بعد شیلا کی آواز سنائی نہ دی۔ اب کملا آگے چل رہی تھی اور انور اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

کملا! اگر شیلا کو اوپر آنے کا راستہ نہ ملا تو برا ہو گا"

کملا مینگوستن کی بڑھی ہوئی شاخ کو پرے ہٹاتی بولی۔

"برا کیا ہو گا — بس واپس چلی جائے گی"

دونوں چپ چاپ چڑھائی چڑھتے گئے۔ اب خاردار جھاڑیوں کی جگہ ان پودوں نے سنبھال لی تھی۔ جن پہ سفید، سرخ اور کاسنی رنگ کے پھولوں کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں بانس کے جھکے ہوئے درختوں میں سائے گہرے اور مرطوب تھے اور فضا میں ان کی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی پگ ڈنڈی پر پھسلن باقی نہ رہی تھی۔ لیکن چھوٹے بڑے پتھر اس بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے کہ ہر قدم پر پھسل جانے کا امکان تھا۔ شاخوں سے لٹکتی ہوئی بیلیں زمین کو چھو رہی تھیں۔ انور کو بالکل پتہ نہ چل سکا کہ کملا کا پاؤں پتھر سے کس طرح پھسل گیا اسے صرف اسی وقت معلوم ہوا۔ جب وہ اس کی بانہوں میں آن گری وہ ایک لمحے کا ہزارواں حصہ تھا یا ایک ہزار سال کا تاریخی عرصہ — دونوں پر گویا سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ انور کملا کو سنبھالتے

ہوئے خود بھی گر پڑا تھا۔ لیکن اس کی پیٹھ خود بخود ایک بڑے سے پتھر کے ساتھ جا لگی تھی۔ کملا کا جسم اس کی گود میں تھا اور اس نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کملا نے انور اور انور نے کملا کی طرف دیکھا جیسے وہ ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ اور پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں اور پھر جیسے انہوں نے ایک دوسرے کی صورت پہچان لی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کملا محبوب سی ہو کر شرما گئی اور جلدی سے اٹھ کر بال درست کرنے لگی۔

لیکن تم گریں کس طرح ؟"

کملا کا ازل سے شرارتی چہرہ سرخ ہو گیا اس نے جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے خود نہیں پتہ کیوں کر پاؤں پھسلا۔ یہ پتھر بڑے خطرناک ہیں"

انور نے کملا کے کان کے قریب منہ لا کر کہا۔

اور یہ جنگل بھی! خطرناک ہے"

کملا زیادہ شرما گئی اور چپ چاپ چڑھائی چڑھنے لگی۔ انور ابھی تک اپنے بازوؤں میں کملا کے جسم کی پرسکون گرمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اس کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کملا اس کے بعد بالکل نہ بولی۔ چڑھائی طے کرنے کے بعد ٹیلے کی ہموار چوٹی پر جو چیز انہیں سب سے پہلے نظر آئی وہ شیلا تھی جو ایک بڑے سے پتھر پر بارہ دری کے سامنے پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اور ان دونوں کو غصے میں گھور رہی تھی۔

ارے واہ! یہ منی جان تو ہم سے بھی پہلے پہنچ گئیں" کملا نے حیرانگی سے کہا۔

انور کو یوں لگا۔ گویا شیلا نے کملا کو اس کے بازوؤں میں دیکھ لیا ہو۔ لیکن شیلا بہت زیادہ معصوم تھی۔ وہ یوں ناراض ہو کر بیٹھی تھی۔ جیسے کسی نے اس کی گڑیا چھین لی ہو۔

"بھئی شیلا تم نے تو کمال کر دیا"

شیلا نے منہ بنا کر کہا۔

"جی ہاں ـــ اور اگر راستے میں مجھے کوئی شیر مل جاتا تو پھر کیا ہوتا ؟"

انور بے اختیار ہنس پڑا

"اونہوں شیلا ـــ شیر نہیں البتہ کالے ناگ یہاں ضرور ہوتے ہیں"

شیلا ڈر کر اٹھی اور کملا کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ انور اور کملا نے اس بے چاری کا خوب مذاق بنایا۔ بارہ دری مہاتما بدھ کے وقتوں کی تو خیر نہ تھی۔ لیکن اس کی دیواروں پر جا بجا لکھے ہوئے ناموں اور سنگ مرمر کی اکھڑی ہوئی اینٹوں نے اسے اس سے بھی زیادہ پرانی اور خستہ حال بنا رکھا تھا۔ چھت پر تانبا چڑھا ہوا تھا جو کالا پڑ رہا تھا۔ فرش پر جہاں جہاں سے اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ وہاں گھاس اُگ رہی تھی۔ بارہ دری کے عقب میں کیلوں کے درختوں کی قطار کھڑی تھی۔ جن کی شاخوں میں کچے کیلوں کے بور لٹک رہے تھے۔ کملا نے پنسل نکال کر ایک جگہ تاریخ لکھی اور نیچے یہ جملہ گھسیٹ ڈالا۔

"آج ہم پہلی مرتبہ یہاں آئے۔ اور نیچے پھسل پڑے"

"مسٹر انور، مس کملا ماتھر"

اپنے دستخط کرنے کے بعد انور نے کملا کو دیکھا وہ بھی اپنا نام لکھ رہی تھی۔

"بھلا ان باتوں سے کیا ہوتا ہے کملا ؟"

کملا نے پنسل کا منہ بند کیا اور بلاؤز میں اڑاتے ہوئے انور کی آنکھوں میں ڈوب کر اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"کچھ نہیں ہوتا"

وہ تینوں ایک بار پھر نیچے اترنے لگے۔ اترائی عام طور پر زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ مگر وہ صحیح و سالم نیچے اتر آئے۔ لڑکیوں کی منڈلی میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ ان کی عدم موجودگی میں آموں کا صفایا کیا جا رہا تھا۔ کملا اور شیلا آموں پر ٹوٹ پڑیں۔

سہ پہر کی چائے کے بعد انہوں نے سامان وغیرہ باندھ کر کار میں رکھا اور گھر کی طرف واپس چل پڑے۔ انور لیوس سٹریٹ کے ناکے پر اتر گیا۔

گھر پہنچ کر اسے ساتیں کے خیال نے گھیر لیا۔ ساتھ ہی اسے وہ پر لطف لمحات یاد آ گئے۔ جب کملا اتفاق سے اس کے بازوؤں پر آن گری تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ گویا ساتیں نے اسے اور کملا کو ہم آغوشی کی حالت میں دیکھ لیا ہو اور ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ وہ جوتا اتار کر بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ جب اس طرح لیٹنے سے اسے سکون نہ ملا تو وہ سیدھا ہو گیا۔ لیکن اس کا ذہن اور زیادہ منتشر ہو گیا اس نے باورچی خانے میں جا کر کلہاڑا اٹھایا۔ لکڑ کا بہت بڑا ٹکڑا دہلیز میں رکھا اور لکڑیاں پھاڑنا شروع کر دیں۔

۷

ساتیں کی موسی آمرا پور بستی میں رہتی تھی۔

یہ بستی شہر کا ایک حصہ تھی اور رنگون ریلوے سٹیشن کے پرلی طرف واقع تھی اس روز کوئی مذہبی تہوار تھا اور ساتیں کی موسی کے ہاں عورتیں رات بھر بھاتمادھ کی کتاب "دھرم کنول" کے منظوم ٹکڑوں کا ورد کرتی رہی تھیں۔ ساتیں تمام رات جاگتی رہی تھی اور صبح اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ لیکن وہ انور کے خیال سے غافل نہیں تھی۔ لکڑی کے پیالوں میں ناریل کا دودھ نچوڑتے وقت اور مہمان عورتوں میں مچھلی بھات بانٹتے وقت وہ من ہی من میں اس وقت کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ جب وہ منکی پوائنٹ روڈ کے قریب پہنچ کر انور کو اپنے انتظار میں بے قراری سے اِدھر اُدھر ٹہلتے دیکھے گی۔ دن کافی نکل آیا تھا اور عورتوں نے ابھی تک کھانے سے ہاتھ نہ کھینچا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ ساتیں کا اضطراب بڑھ رہا تھا کہیں وہ انتظار سے تنگ آ کر واپس نہ چلا جائے! ارے جلدی جلدی فارغ ہو کر گھر سے نکل پڑنا چاہیئے۔ اگرچہ موسم ابر آلود تھا اور صبح ہی سے بوندا باندی ہو رہی تھی۔ لیکن ساتیں اس سے بے نیاز تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا۔ کہ اگر مینہ زیادہ زور سے برسنے لگا تو وہ بس میں سوار ہو کر چلی جائے گی۔ اس کے پاس کوئی گھڑی نہ تھی۔ لیکن ایک لمحہ ایسا آیا۔ جب ساتیں

نے محسوس کیا کہ اسے اٹھ چلنا چاہیئے، انور اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ چنانچہ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں کا جوڑا کس کر باندھا۔ چپل پہنی اور موسی سے اجازت مانگنے ساتھ والے کمرے میں آگئی اس کی موسی چٹائی پر دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی کوکو پی رہی تھی۔ ساتیں کی ماں صبح صبح ہی چلی گئی تھی۔ وہ جن بیرسٹر صاحب کی کوٹھی میں ملازم تھی۔ وہاں الصبح نصف درجن آدمی چائے کے ساتھ ایک ایک اباہوا انڈا کھاتے تھے جاتے ہوئے اس کی ماں ساتیں کو جلدی گھر پہنچنے کا کہہ گئی تھی۔ اس نے اپنی بہن کو بھی تاکید کر دی تھی کہ لڑکی کو جلدی چھٹی دے دے۔ کیونکہ پیچھے گھر میں اس کا باپ دن میں کئی بار چائے پیتا ہے لیکن اس کی بہن ساتیں کو تیار پا کر بولی۔

"بیٹا! اتنی بھی جلدی کیا ہے کوئی دم اور ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں موسی گھر میں کوئی نہیں ہے اور پھر دادا کو تکلیف ہوگی۔"

ساتیں اپنے بوڑھے باپ کو دادا کہا کرتی تھی۔ اس کی موسی کوکو پینے لگی۔

"تو پھر یوں کرو۔ ماچی کو بھی ساتھ لیتی جاؤ۔ اسے تمہاری پھوپھی کے ہاں پکوان پہنچانا ہے۔ وہ ان کا گھر نہیں جانتی۔ تم اسے پینا بستی میں چھوڑ کر آگے چلی جانا۔ ہوں؟"

ساتیں پر گویا کسی نے ٹھنڈا پانی ڈال دیا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے سارا کھیل بگڑتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی پھوپھی کا گھر منکی پوائنٹ سے بہت آگے تھا۔ اگر وہ بوڑھی کھوسٹ ماچی کو لے کر پہلے وہاں گئی تو اسے واپس منکی پوائنٹ آتے کافی دیر لگ جائیگی اور ممکن ہے پھر وہ انور سے نہ مل سکے۔ وہ غریب دل میں کیا کہے گا! لیکن موسی کو ٹالنے کے لیے اسے بروقت کوئی بہانہ نہ سوجھا اور ماچی اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگئی ساتیں نے صبح ہی سے انور کے لیے ناریل کے دو میٹھے ٹکڑے ایک کاغذ میں الگ لپیٹ رکھے تھے۔ ماچی نے پکوان کی سینی اپنے سر پر رکھی۔ ساتیں نے میٹھے ٹکڑے سبز ریشمی رومال میں باندھے اور دونوں گھر سے باہر نکل آئیں۔

بوندا باندی رک گئی تھی۔ لیکن فضا میں حبس ہو رہا تھا۔ سٹیشن پر سے انہیں

پینا بستی کی بس مل گئی۔ بس میں کافی رش تھا۔ بوڑھیا سینی نیچے رکھ کر بیٹھ گئی اور ساتیں زنجیر پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ منکی پوائنٹ پر بس رکی۔ ساتیں نے جھک کر کھڑکی میں سے باہر دیکھا اسے دور درختوں کے درمیان وہ پگڈنڈی تنہا اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں انور نے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ بس آگے روانہ ہوگئی اور شکستہ دل ساتیں میٹھے ٹکڑے ہاتھ میں لیے چپ چاپ کھڑی رہی۔ پینا بستی میں کھوسٹ بڑھیا کو اپنی پھوپھی کا گھر دکھلا کر ساتیں تیز تیز قدم اٹھاتی بس سٹینڈ پر پہنچی۔ ابھی ابھی ایک بس نکل گئی تھی۔ پندرہ منٹ قیامت کا انتظار کرنے کے بعد شہر سے ایک بس وہاں آکر خالی ہوگئی۔ ڈرائیور نے اس کا رخ شہر جانے والی سڑک کی طرف موڑا۔ پانچ منٹ سواریوں کا انتظار کیا اور بس سٹارٹ کر دی۔ ساتیں منکی پوائنٹ پر نیچے اتر آئی۔ اس مقام پر پہنچ کر جہاں جھیلوں والے باغ سے آنے والی پگڈنڈی منکی پوائنٹ روڈ میں مل جاتی ہے۔ ساتیں نے رک کر متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور برساتی نالے کی چھوٹی سی پلیا پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اسے خیال آیا۔ شاید انور باغ میں اسے تلاش کر رہا ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور باغ کی طرف چل پڑی۔ ناریل کے گیلے تنے ہلکی ہلکی خوش گوار مہک چھوڑ رہے تھے۔ گھنے درختوں میں سے بارش کا رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔ لمبی گھاس مرطوب تھی اور تھوڑی دور ہی چلنے کے بعد ساتیں کے سبز لہنگے کے کنارے بھیگ گئے۔

اب وہ جھیلوں والے باغ میں داخل ہو چکی تھی۔ عورتیں اور مرد دو دو تین تین کی ٹولیوں میں بٹے پھولوں بھرے تختوں کے درمیان سرخ روشوں پر گھوم پھر رہے تھے۔ دور سے ساتیں کو ہر آدمی پر انور کا گمان ہوتا۔ لیکن قریب آنے پر ہر آدمی غیر آدمی ثابت ہوتا۔ ساتیں کو یقین تھا کہ انور نے اس کا کافی دیر انتظار کیا ہوگا۔ کاش وہ موسی سے اجازت طلب کرتے اس کے کمرے میں نہ جاتی۔ انور کو کس قدر دکھ ہوا ہوگا۔ اور پھر اسی نے تو انور کو بلایا تھا۔ ہائے اسے ایک شریف آدمی کو اس طرح خراب کرنے کا کیونکر حق پہنچتا تھا؛ وہ بے چارا دل میں کیا خیال کرتا ہوگا! یہی

ناں کہ ساتیں نے جھوٹ بولا۔ اور اسے بیوقوف بنانے کی کوشش کی۔ وہ اس وقت کہاں ہوگا؛ وہ اس کے بعد پھر کہاں ملے گا؛ انہیں خیالات میں گم ساتیں باغ کے تختوں میں سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھنے لگی ٹیلے کے اوپر ساگوان کے درختوں نے بھگوان بدھ کے بہت بڑے بت پر اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ سنگین بت بارشوں کی مار کھا کر سیاہ پڑ گیا تھا اور اس کے شانوں اور بازوؤں پر سبز سبز کائی جم رہی تھی۔ بت کے قدموں میں پتھر کا چھوٹا سا چبوترہ تھا۔ ساتیں چبوترے پر بیٹھ کر بدھ کے سامنے جھک گئی اس کے معصوم دِل نے دعا کے لیے اپنے لب کھول دیئے۔

"تتھاگتو! میں تجھ میں اور تیرے نام میں پناہ لیتی ہوں۔"

ساتیں نے اپنے جوڑے میں سے اشوک کلی، کا سنہری پھول نکال کر بُدھ بھگوان کے پاؤں میں رکھ دیا۔ اور خود چبوترے سے اٹھ کر قریب ہی پڑے ہوئے ایک ایک بنچ پر آن بیٹھی۔ دعا کے بعد اس کا دل کافی ہلکا ہلکا سا ہو گیا۔ لیکن اب اسے پھر انور کا خیال گھیرے ہوئے تھا۔ ٹیلے کے پرلی طرف سے لڑکیوں کے ہنسنے کھیلنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ ساتیں کو یہ آوازیں سخت ناگوار لگیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لڑکیاں اس کی شکستہ دلی اور بے بسی کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ اس نے میٹھے ٹکروں کو سبز رومال میں ٹھیک طرح لپیٹا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگی۔ اس نے باغ کا ایک ایک کونا چھان مارا۔ لیکن اسے انور کہیں دکھائی نہ دیا۔ جب وہ بالکل ناامید ہو گئی تو اس نے جھیلوں کے قریب سے ہو کر مچھلی منڈی کی طرف نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ راستہ ایک تو تنہا تھا اور علاوہ ازیں مختصر بھی تھا۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ باغ میں سے نکل آئی اور جھیل کنارے چلنے لگی۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے پھر لڑکیوں کے قہقہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ وہ اپنے غمزدہ چہرے کو لیے دوسری پگ ڈنڈی پر ہو لی۔ یہ پتلا سا غیر ہموار راستہ ان لڑکیوں کی ٹولیوں کے عقب سے ہو کر گزر گیا تھا۔ وہ لڑکیاں گھاس پر قالین وغیرہ بچھائے۔ کھانے پینے کا سامان ایک جگہ ڈھیر کیے بیٹھی تھیں اور کسی مرد یا عورت کو اپنے درمیان میں لیے

اس سے ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ ساتیں کو ان کے قہقہوں کی آوازیں اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ جب وہ اس خوش باش منڈلی کے قریب سے گزرنے لگی تو اس کے اور اس منڈلی کے بیچ میں اونچی جھاڑیوں کی ایک دیوار سی حائل ہو گئی۔ ساتیں نے یونہی جھاڑی کی شاخیں ایک طرف ہٹا کر پرلی طرف جھانکا۔ سب سے پہلے اس کی نظر جس عورت پر پڑی وہ اس کی اپنی ماں تھی جو جھیل کنارے بیٹھی شیشے کے گلاس مانجھ رہی تھی۔ وہ فوراً سمجھ گئی۔ کہ بیرسٹر صاحب کی لڑکیاں اپنی سہیلیوں کے ساتھ سیر و تفریح کو آئی ہوئی ہیں۔ آم کے گھنے پیڑ تلے کچھ لڑکیاں جھولا جھول رہی تھیں اور دوسری طرف بیرسٹر صاحب کی بڑی لڑکی اور بہورانی کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ لیکن اِس کے بعد ساتیں نے جو منظر دیکھا وہ سر سے لیکر پاؤں تک کانپ اٹھی۔ پہلی نظر میں اسے اپنی آنکھوں پر بالکل اعتبار نہ آیا مگر جب اس نے دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی وہی کچھ دیکھا تو اس کا نازک دل ایک دم گویا گہرے پانیوں میں ڈوب گیا۔ اس کے سامنے قالین پر انور بیٹھا بیرسٹر صاحب کی چھوٹی لڑکی شیلا کے بالوں میں کنول کے پھول سجا رہا تھا۔ ساتیں نے محسوس کیا اس کے سامنے کسی نے دھکتی ہوئی بھٹی کا منہ کھول دیا ہے اور اگر وہ ایک پل اور وہاں کھڑی رہی تو اس کا چہرہ جھلس جائے گا۔ وہ یک دم پیچھے ہٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے آگے گزر گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ کہ انور کسی اور لڑکی سے بھی محبت کر سکتا ہے اسے ایک ایک کر کے وہ تمام لمحے یاد آ گئے۔ جب انور نے اس کی طرف محبت کی خاموش اور گہری نظروں سے دیکھا تھا۔ اور اس کا انگ انگ لرز اٹھا تھا تو کیا وہ سب کچھ محض فریب تھا۔ دھوکا تھا، سراب تھا؛ کیا وہ ساتیں کو دیکھتے وقت اس کی آنکھوں میں کسی اور لڑکی کی تصویر دیکھتا رہا تھا؛ کیا وہ ساتیں سے گزر کر کسی اور لڑکی سے ملنا چاہتا تھا؛ ساتیں نے اپنی آنکھوں سے اپنی محبت کی لاش پر انور کو کسی دوسری لڑکی سے ہاتھ ملاتے دیکھ لیا تھا۔ شیلا ـــــ ہاں وہ ساتیں سے زیادہ خوب صورت تھی اور ان کا اپنا بنگلہ تھا۔ اپنی موٹر تھی۔ اسے انور

سے محبت کرنے کا حق حاصل تھا اسے دنیا کی ہر ساتیں پر اپنی محبت کا علم لہرانے کی اجازت تھی۔ بیچاری ساتیں! ـــــ اس کے پاس کیا تھا؟ یہی جھوٹے برتن مانجھنے والی ماں اور ناریل کے میٹھے ٹکڑے؟ ہونہہ! ساتیں کی شفاف آنکھوں میں آنسو آگئے اسے محسوس ہوا اس کی ٹانگوں میں چلنے کی ہمت ختم ہو رہی ہے وہ ایک جگہ جھاڑیوں کے پاس درخت سے لگ کر بیٹھ گئی اور سبز رومال میں لپٹے ہوئے میٹھے ٹکڑے سینے سے لگائے دیر تک روتی رہی۔ جب اس کے جی کا غبار دھل گیا تو وہ آہستہ سے اٹھی۔ ناریل کے میٹھے ٹکڑے جھیل میں پھینکنے کے لیے آگے بڑھی۔ پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔ انہیں دوبارہ سبز رومال میں لپیٹا اور اس پگڈنڈی پر سے گزرنے لگی جو تاڑ کے درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی جھیلوں والے باغ سے باہر نکل گئی تھی۔

گھر پہنچ کر کملا ماتھرا اپنے کمرے میں گئی۔ کپڑے بدلے اور بستر میں گھس گئی اسے گہری نیند آئی۔ جب وہ سو کر اٹھی تو شام کا ہلکا ہلکا مرطوب اندھیرا کمرے میں پھیل رہا تھا۔ اس کا ذہن بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش تھا۔ آج دوپہر کا واقعہ اسے خواب معلوم ہو رہا تھا۔ کیا وہ جان بوجھ کر انور کے بازوؤں میں گر پڑی تھی؟ نہیں اس کا تو پاؤں پتھر سے پھسل گیا تھا۔ اس کی جگہ اگر میرا یا سرتیا ہوتی تو ان کا بھی پاؤں پھسل گیا ہوتا۔ انور کے بازو کس قدر مضبوط تھے۔ انہوں نے کملا کو پھول کی طرح اٹھا لیا تھا۔ اگر انور اتنی مستعدی سے کام نہ لیتا تو وہ یقیناً لڑھکتی ہوئی ٹیلے کے نیچے جا پہنچتی اور اب سنیڈیٹیوں میں لپٹی کسی ہسپتال میں پڑی ہوتی۔ وہ انور کا جتنا بھی شکریہ ادا کرے کم ہوگا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ کھسکا کر سرہانے والا لیمپ روشن کیا اور اپنی ڈائری میں اس روز کا واقعہ درج کرنے لگی۔ ڈائری لکھ کر اس نے میز پر رکھ دی اور تصویروں والے البم کے ورق الٹنے لگی اسے یہ معلوم کر کے بڑی ندامت سی محسوس ہوئی کہ اپنے بڑے البم میں کہیں بھی انور کی تصویر نہیں تھی۔ اس نے سوچا اب کی مرتبہ وہ پروگرام کرنے گئی تو انور سے اس کی تصویر ضرور مانگے گی۔ ایک

تصویر میں اس نے نائر کو اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھے دیکھا اس کی گود میں خوبصورت آنکھوں والی بلی تھی اور نائر اسے پیار بھری خاموش نگاہوں سے تک رہا تھا۔ کملا نے البم ایک طرف کر دیا اور پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نائر کے متعلق سوچنے لگی۔

نائر! ـــــ بھیگی بھیگی خاموش آنکھوں والا دبلا پتلا لڑکا!

وہ کلکتے میں بھی ان کے ہاں آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کی صحت کافی اچھی تھی اور اسے ان گنت لطیفے یاد تھے کملا کا باپ نائر کے باپ کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ رنگون آنے سے پیشتر یہ دونوں گھرانے کلکتہ میں ایک ہی علاقے میں آباد تھے۔ نائر کا باپ بیوہاڑے میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس نے کلکتے میں تعلیم حاصل کی تھی اور بعد میں یہیں شادی کر کے وکالت کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ کملا نائر اور اس کی بڑی بہن کیسر کالی گھاٹ کے ایک اسکول میں اکٹھے پڑھنے جایا کرتے۔ اسکول کی بس انہیں روزانہ گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر پہنچا دیا کرتی اسکول میں نائر سب لڑکے لڑکیوں سے زیادہ شرارتی تھا اور ہر روز کسی نہ کسی سے لڑائی مول لے لیتا تھا۔ کیسر بہت ڈرپوک اور بزدل تھی۔ لیکن کملا ہر معرکے میں نائر کا ساتھ دیا کرتی۔ ایک مرتبہ جب نائر کو اس کے مخالف نے اسکول کے لان میں بری طرح دبوچ لیا تھا تو کملا نے سلیٹ مار کر اس کا سر پھوڑ دیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ کہ خون دیکھ کر وہ بستہ وغیرہ وہیں چھوڑ وہاں سے نو دو گیارہ ہو گئی تھی۔ لیکن دوسرے روز ہیڈ مسٹرس کے سامنے نائر نے کملا کا خون اپنے ذمے لے کر اسے سزا سے بچا لیا تھا پھر بھی کملا نائر کو پتھر کی سل کمر پر لادے لان کے چکر لگاتے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ہولی دیوالی، درگاہ پوجا اور اسی قسم کے دوسرے تہواروں پر وہ ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ نائر کا یہ معمول تھا۔ کہ وہ شام کے وقت کملا کے ہاں ضرور آجاتا۔ جس روز وہ ادھر آنا بھول جاتا۔ کملا اس رات کھانا نہ کھاتی۔ دونوں کے والدین بچوں کے اس سلوک پر بے حد خوش تھے۔ لیکن جونہی وہ بڑے ہوئے یہی آپس کا سلوک ان کے لئے وجہ پریشانی بن گیا۔ کملا کا باپ اگرچہ نائر کے باپ

کا ہم جماعت رہ چکا تھا۔ لیکن وہ اس خیال سے اپنے تئیں بڑا ہلکا ہلکا محسوس کرتا۔ کہ اس کی بیٹی ایک عام وکیل کے لڑکے سے یوں گھل مل کر باتیں کرے۔ وہ کلکتہ کے کامیاب بیرسٹروں میں سے ایک بیرسٹر تھا اور اونچے طبقے میں اس کی کافی پوزیشن تھی۔ چنانچہ اس نے کملا کو نائر سے زیادہ تعلقات بڑھانے سے منع کیا۔ کملا کو اپنے باپ کا یہ رویہ سخت ناگوار گزرا بھلا ان دونوں کی دوستی اور سلوک سے دوسرے لوگوں کو کیا نقصان پہنچ سکتا تھا؛ بچپن کی محبت وقت کے ساتھ ساتھ پودے کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے تا آنکہ وہ ایک مضبوط اور تن آور درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیا ان کے ماں باپ قدرت کے اس سیدھے سادے اصول سے بھی ناواقف تھے؛ نائر کے باپ کے لیے کلکتہ ایسے شہر میں وکالت کا میدان کافی کھلا بھی تھا اور محدود بھی۔ شہر میں جتنی تعداد ملزموں کی تھی۔ قریباً اتنی ہی تعداد وکیلوں کی تھی۔ یوں کام رکا بھی کبھی نہ تھا۔ اور بڑھنے بھی نہ پایا تھا۔ جتنی آمدنی وہ دس مقدمے لڑ کر پیدا کرتا اتنی رقم کملا کا باپ ایک ہی مقدمے میں وصول کر لیتا۔ آمدنی اور مقدمات کی نوعیت کے اس فرق نے دونوں خاندانوں کو دو مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا تھا۔ کملا کے باپ کے پاس موٹر تھی اور نائر کا باپ بس میں سوار ہو کر عدالت جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملتے وقت اس فرق کو بڑی شدت سے محسوس کرتے۔ نائر کا باپ گلی میں کھڑا ہوتا اور کملا کا باپ پانچویں منزل پر بیٹھا ہوتا تھا۔ لیکن وہ دونوں جہاں بھی ملتے دیر تک ایک دوسرے سے ہم کلام رہتے۔

کملا اور نائر اگر بچپن کے ساتھی نہ ہوتے تو یہ طبقاتی خلیج انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا کر دیتی۔ مگر اسکول کے شکستہ دروازے اور کلکتہ کی پرشور گلیوں کے سائے میں پروان چڑھی ہوئی محبت نے ان دونوں کو ایک ایسے رشتے میں پرو دیا تھا جو ان طبقاتی بندشوں سے بالاتر تھا۔ یہ بھی ایک خاص طبقہ تھا جہاں پہنچ کر تمام طبقے مٹ گئے تھے۔ اس کے باوجود نائر کملا کے باپ کے اس روپے کو جن کا انحصار محض آمدنی کی کمی بیشی پر تھا۔ بھانپ گیا تھا۔ اور بہت کم کملا

کے ہاں۔ کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ وہ ہر بار نائر سے گلہ شکوہ کرتی اور نائر ہر بار مسکرا کر بات ٹال دیتا۔ اب وہ پہلے ایسا شریر اور نٹ کھٹ نائر نہ رہا تھا۔ وہ بہت کم بولتا اور کملا کی دس باتوں کا ایک بات میں جواب دیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کملا پہلے سے زیادہ چنچل اور شریر ہو گئی تھی۔ اسے ہر وقت گفتگو کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی موضوع چاہیئے تھا۔ وہ ہر اتوار اپنے بنگلے پر تمام سہیلیوں کی دعوت کرتی اور دن بھر خوب ہنسی مذاق کا بازار گرم رہتا۔ نائر کی بہن کیسر اپنے بھائی سے بھی زیادہ کم گو اور کم آمیز تھی۔ چنانچہ کملا اسے اپنے ہاں بلاتے ہوئے ہمیشہ گھبرایا کرتی۔ عشق و محبت کی باتیں تو خیر کملا کے لیے تضیع اوقات تھیں۔ لیکن اسے نائر کی دوستی اور سنگت بڑی پسند تھی۔ مگر نائر نے کملا کے سامنے کبھی اس دوستی کا بھی ذکر نہ چھیڑا تھا۔ کملا اس کے پہلو میں ہمیشہ اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرتی۔ اس کی اسکول کے زمانے کی ظرافت اور چلبلاپن کسی نے کانٹے کی طرح اس کے دماغ سے نکال باہر پھینکا تھا۔ وہ سوچتا زیادہ اور بولتا کم تھا۔ اس کی شربتی آنکھیں جو کبھی چالاک خرگوش کی مانند اِدھر اُدھر چوکنی رہا کرتی تھیں۔ اب ہر وقت یوں بھیگی بھیگی اور خاموش رہتیں جیسے ایک مدت سے کسی آنے والے کی راہ تک رہی ہوں۔ وہ کون اجنبی محبوب تھا۔ جس کے طویل انتظار میں نائر کی آنکھیں اپنی متبسم چمک کھو بیٹھی تھیں؛ وہ کوئی بھی ہو کملا اس اجنبی سے نفرت کرتی تھی۔

دونوں گھرانوں نے ایک ساتھ بوریا بستر باندھا اور کلکتے سے رنگون اُٹھ آئے دونوں قانون دانوں کا خیال تھا۔ کہ رنگون میں ہندوستانی عنصر مقابلے میں کم ہوگا اور وہاں تھوڑے ہی عرصے بعد کملا کے باپ نے پرانی موٹر بیچ کر نئی کار خرید لی۔ مگر نائر کے باپ کو بہت جلد معلوم ہو گیا۔ کہ رنگون اور کلکتے میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ بلکہ رنگون میں برمی اور غیر برمی کا سوال اس کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ تاہم اسے مہینے میں دو تین مقدمے مل ہی جاتے تھے۔ یہ الگ بات تھی۔ کہ ان مقدموں میں ہر بار ایک آدھ مقدمہ سائیکل یا موٹر کے غلط چالان کا ہوتا۔ نائر کو مجبوراً تعلیم کا سلسلہ ختم

کرکے ایک انگریزی فرم میں نوکری کرنا پڑی۔ پردیس میں آکر یہ دونوں خاندان قدرتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ نائر دوسرے تیسرے روز کملا کے ہاں نکل آتا۔ کملا اسے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دیتی۔ نائر خاموش نگاہوں سے کملا کی خوبصورت انگلیوں کو چائے بنانے میں مصروف دیکھتا رہتا۔ چائے بنا کر جب وہ پیالہ اس کی طرف بڑھاتی تو وہ آہستہ سے شکریہ کہہ کر یوں چائے پینے لگتا۔ گویا وہ کسی ہوٹل کے کمرے میں تنہا بیٹھا ہو۔ کملا غصے میں جل بھن جاتی۔ ایک دن وہ اس پر برس پڑی۔

"آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ اگر تمہیں یوں الگ تھلگ سا رہنا ہوتا ہے۔ تو پھر مجھ سے ملنے کیوں آتے ہو۔ کیا تم مجھے اپنا ہم درد نہیں سمجھتے۔ پھر یہ معاندانہ رویہ کیوں؟ یہ اجنبیوں ایسا سلوک کیوں؟ تم یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح تم مجھ پر اپنی برتری ثابت کر سکو گے آخر مجھے اس طرح ذلیل کرنے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟

کملا کی آواز بھرا گئی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے منہ پرلی طرف کر لیا۔ اور ساڑھی کے ریشمی پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ نائر بالکل سامنے والے صوفے پر فاختائی رنگ کے سوٹ میں ملبوس بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ کملا کی باتوں نے اگرچہ اس کے دل میں جذبات کا طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ اور وہاں کسی قسم کے جذباتی تغیر کے نشانات نہ تھے۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ کملا کے ایک دم چپ ہو جانے سے وہاں گہری خاموشی چھا گئی۔ نائر نے مدھم آواز میں گہرا سانس بھرتے ہوئے جیب سے سگریٹ کیس نکال کر ایک سگریٹ سلگایا اور بجھی ہوئی دیا سلائی راکھدان میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"کملا! تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے جذبات کے ساتھ بچوں کی طرح مت کھیلو۔ یہ صحیح بات ہے کہ میں نے تمہاری موجودگی میں ٹیگور کے پریم گیت کبھی نہیں گائے لیکن اس کا مطلب یہ مت سمجھو کہ میں ٹیگور کی شاعری اور اس کے درد کو محسوس نہیں کرتا۔ مجھے امید ہے۔ تم میرے اتنے کہے کو ہی بہت زیادہ سمجھو گی ....."

لیکن کملا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس جا کر

کھڑی ہو گئی۔

رنگون پہنچ کر کملا کے باپ کا حلقۂ اثر جس قدر وسیع ہو گیا تھا۔ کملا کی سہیلیوں کی تعداد میں بھی اسی قدر اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی سہیلیوں میں سرکاری افسروں امیر تاجروں وزارت کے امیدواروں لیڈروں انیل کے انگریز ایجنٹوں اور اعلیٰ برمی افسروں کی بیویاں اور لڑکیاں شامل تھیں۔ وہ جب کبھی ان عورتوں کو چائے پر بلاتی۔ نائر کو دعوتی کارڈ بھیجنا کبھی نہ بھولتی۔ لیکن نائر کی عین محفل میں تنہا پسندی اور یک سوئی اسے کبھی نہ بھاتی تھی اور جب اس کی ہنس مکھ اور ہر بات پر احمقوں کی طرح ہنسنے والی سہیلیوں نے اس سے نائر کی بوریت کی دبی زبان میں شکایت کی۔ تو وہ ایسی محفلوں میں اس کی شرکت سے پرہیز کرنے لگی۔ ایک سے ایک بڑھی ہوئی چنچل اور لطیفے باز سہیلیوں کی صحبت میں رہنے سے کملا بھی نائر کی بوریت کو محسوس کرنے لگی۔ نائر کی دوررس نگاہیں کملا کی خفیہ بے اعتنائی کو فوراً بھانپ گئیں اور اس نے کملا کے ہاں آنا جانا بند کر دیا۔ کملا نے اس کی جدائی کو زیادہ اہمیت نہ دی لیکن وہ اس کے خیال کو دل کی تہوں سے نہ نکال سکی۔ دعوتوں کے ہنگاموں اور قہقہوں کے پرشور طوفان کے بعد جب اس کی سہیلیاں کاروں میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتی ہوئی رخصت ہو جاتیں اور وہ اپنے کمرے میں تنہا چھوڑ دی جاتی تو اسے تاریک خاموشی کے بھنور اپنی طرف لپکتے معلوم ہوتے۔ اسے اپنے ذہن پر اس آہنی پٹڑی کا گمان ہونے لگتا۔ جہاں سے چیختی چلاتی برق رفتار ریل گاڑی ابھی ابھی گزر گئی ہو کمرے کی ہر شے جو اس سے بیشتر اس کے ہر قہقہے کا دل کھول کر ساتھ دے رہی ہوتی۔ اب اپنا روپ بدل لیتی اور قیدی پرندے کی طرح کملا کو بے بسی سے دیکھنے لگتی۔ جیسے انہوں نے اس کی سہیلیوں کے جاتے ہی جھوٹ موٹ کا مزاحیہ نقاب اتار پھینک دیا ہو اور اب اپنی اصل شکل میں آگئی ہوں۔ ایک لمحے کے لیے اسے نائر کی خاموشی کے کھرے پن اور اپنے بلند قہقہوں کی کھوٹ کا شدید احساس ہوتا۔ لیکن وہ جلد کسی نہ کسی کام میں لگ جاتی۔ اور روح کے اس کھوکھلے پن سے چھٹکارا حاصل کر لیتی۔

رنگون میں اپنی پہلی سالگرہ کے موقع پر کملا نے دوستی کے پرانے جذبے سے

متاثر ہو کر ناٹر کو بھی دعوتی کارڈ بھیج دیا۔ اسے یقین تھا۔ کہ وہ اس سے ناراض ہے۔ وہ اس کے جشنِ سالگرہ پر کبھی نہ آئے گا۔ لیکن جب بنگلے کے برآمدے میں اور مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس نے ناٹر سے بھی ہاتھ ملایا۔ تو وہ واقعی حیران رہ گئی ناٹر اس شام ہلکے سلیٹی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ سیاہ لہریالے بال چمک رہے تھے۔ آنکھوں میں بھیگی بھیگی پرسکون خاموشی تھی اور چہرہ خلاف معمول شگفتہ تھا۔ وہ بالکل نہ سمجھ سکی۔ کہ یہ خوشگوار تبدیلی اس کی سالگرہ کے جشن کی خوشی میں تھی یا اس میں رنگون کی اس شام کا ہاتھ تھا جو لاجوردی آسمان کے نیچے رنگین پھولوں اور مرطوب سبزے کی سنگت میں جنوبی ہند کی کنواری دیوداسی کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

ناٹر نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ کملا سے ہاتھ ملایا۔

"سالگرہ مبارک ہو"

کملا کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اب تک کئی مہمان اسے سالگرہ پر مبارک باد پیش کر چکے تھے۔ اس نے ہر ایک کو شکریئے کے دو بول کہے تھے۔ لیکن ناٹر کے "سالگرہ مبارک ہو" کہہ دینے سے اس کے جسم میں زندگی کا تازہ اور گرم خون دوڑنے لگا۔ اسے محسوس ہوا۔ واقعی وہ زندگی کی نئی منزل میں قدم رکھ رہی ہے سالگرہ مبارک ہو اس کے لیے "کھل جا سم سم" کے جادوئی حروف کی حیثیت رکھتا تھا جس کے سنتے ہی اس نے اپنے سامنے روشنیوں اور مسرتوں کے جگمگاتے ہوئے دروازے کھلتے دیکھے۔ جذبات کے تموّج میں کملا کی آواز ڈوب گئی اور وہ صرف مسکرا دی۔ ناٹر بھی مسکراتا ہوا باغ میں جا کر اور مہمانوں کے ساتھ بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور خاموشی سے سگریٹ پینے لگا۔ کملا نے سوچا۔ کاش وہاں کوئی مہمان نہ ہوتا اور وہ ناٹر کے قریب پہنچ کر گھاس پر بیٹھ جاتی اور اپنے بازو اس کے گھٹنوں پر رکھ کر محبت کی پراسرار سرگوشیوں میں کہتی۔

"تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو ناں؟"

لیکن وہاں مہمان مردوں اور عورتوں کا تانتا بندھ رہا تھا اور کملا بہت جلد اس پراسرار خواہش کو بھول گئی۔ کھانے کے بعد کملا نے مہمانوں کو ستار پر گانا سنایا مہمانوں نے تالیاں بجا کر اور شور مچا کر گانے کی تعریف کی۔ اس کے بعد پیٹ بھر کر کھائے ہوئے مرغن کھانے نے ان پر غنودگی اور کسل مندی کی حالت طاری کر دی۔ اور وہ بوجھل آواز اور بیزار لہجے میں شب بخیر کہتے ہوئے کاروں میں بیٹھ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔

لان میں کملا، شیلا، مسز پانڈے، مسٹر پانڈے، کیپٹن فاروقی۔ مسز فاروقی اور ناٹر کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ شام کے سائے گہرے سبز ہو گئے تھے اور باغ میں ہلکی ہلکی اوس گرنا شروع ہو گئی تھی۔ بنگلے میں ملازم برتن ادھر ادھر لے جاتے ہوئے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے اور پورٹیکو میں جلتی ہوئی بتیوں کی ملائم اور چمکیلی روشنی باغ میں بھی آ رہی تھی۔ مسٹر پانڈے ادھیڑ عمر کے آدمی تھے رنگ پھیکا گندمی، سر گنجا اور چھوٹی سی ناک طوطے کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھی آپ رنگون یونیورسٹی میں حیاتیات کے پروفیسر تھے۔ ان کی بھاری بھرکم بیوی سبز رنگ کی بھڑکیلی ساڑھی میں ملبوس تھی اور کئی بار اپنے گلے کا ہار درست کر چکی تھیں مسٹر فاروقی جاپانی حملے کے احتمال کے پیش نظر ہندوستان سے آئی ہوئی پہلی لڑاکا رجمنٹ میں کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ اور بہار کے رہنے والے تھے۔ دُبلا پتلا گورا بدن اور چمکیلی آنکھیں۔ ان کے سامنے میز پر گولڈ فلیک کا ڈبہ کھلا تھا۔ مسز فاروقی بھاری کامدار پشواز پہنے ہوئے تھیں۔ اور کملا سے دبے دبے کسی موضوع پر مصروف گفتگو تھیں۔ شیلا بالوں میں رتنا کلی کی سرخ کلیاں سجائے کرسی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اور بلی کی سی چمکدار آنکھوں سے ادھر ادھر تک رہی تھی۔ ناٹر سگریٹ سلگائے یوں خاموش تھا۔ گویا شام کے بڑھتے ہوئے پراسرار دھندلکوں نے اسے مسحور کر دیا ہو۔ کیپٹن فاروقی کچھ دیر جنگ کی تازہ ترین صورت حالات اور جاپان کے حملے کے امکانات پر گفتگو کرتے رہے اور مسٹر پانڈے اور مسز

پانڈے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں۔ جب وہ ان باتوں سے اکتا گئے۔ تو انگریزی فلموں پر باتیں شروع ہوگئیں۔ جب اس موضوع نے بھی انہیں بور کرنا شروع کر دیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ لیکن یہ خاموشی کالے ناگ کی پھن کی طرح ان کے سامنے لہرانے لگی۔ مسٹر پانڈے سگار پی رہے تھے۔ کیپٹن فاروقی نے گولڈ فلیک سلگاتے ہوئے یونہی پوچھا۔

"مسٹر پانڈے آپ کو سگار زیادہ پسند ہیں؟"

مسٹر پانڈے نے سگار منہ سے نکال کر ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولے:۔

"یہ مجھے ناگوار نہیں گزرتا۔"

ناٹر اب تک چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اب اس کا بھی جی باتیں کرنے کو چاہا وہ بید کی کرسی پر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یعنی آپ ہر گوارا شے کو پسند کرتے ہیں۔"

کملا نے چونک کر ناٹر کے پرسکون چہرے کو دیکھا وہ بالکل نہ سمجھ سکی کہ ناٹر کا اس جملے سے مطلب کیا تھا۔ مسٹر پانڈے اپنے ہی دھیان میں بڑے پر اعتماد لہجے میں بولے۔

"یقیناً جو چیز گوارا ہو وہ اچھی ہوتی ہے۔"

"گوارا سے آپ کی مراد کیا ہے؟"

"جس چیز کو میرا ذائقہ تسلیم کرے۔"

"اور آپ کے ذائقے کا معیار کیا ہے؟"

میرا ذائقہ ——"

کیا بیماری کی حالت میں یہ ذائقہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"بشرطیکہ ہمارا ذہن قوتِ امتیاز کھو نہ بیٹھا ہو۔"

"تو پھر یوں آپ ایک ایسی ہستی کو تسلیم کرتے ہیں جو ذائقے پر حاوی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

وہ یوں کہ جب ہم کھیرے کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اسے کھانا چاہئے کیونکہ ہمیں بھوک لگی ہے تو ہم کدو کو دیکھ کر ایسا کیوں نہیں کہتے؟ حالانکہ بھوک ہمیں واقعی لگ رہی ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ہمارا ذہن ہے جو ہمیں اس چیز سے باخبر کرتا ہے کہ کھیرا کچا کھانے والی چیز ہے اور کدو پکا کر کھانے والی —— اصل شے ذائقہ نہیں بلکہ ذہن ہے دنیا میں ایسی بے شمار چیزیں ہیں جن کا ذائقہ ناگوار ہوتا ہے لیکن وہ انسان کے لیے مفید ہوتی ہیں۔ مثلاً آملہ۔ نیم وغیرہ۔ علاوہ ازیں اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر آدمی کا مزاج مختلف ہوتا ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شے ایک کے لیے گوارہ ہو۔ اور دوسرے کے لیے ناگوار۔"

"تو پھر آپ انسانوں کو انسانیت کے رشتے میں کیونکر باندھیں گے۔"

"طبع اور ذہن سے جو بہر حال مشترک ہیں۔"

"کیا آپ ان میں کوئی فرق قائم نہیں کرتے؟"

"ضرور کرتے ہیں۔ طبع ہر انسان ساتھ لاتا ہے اور ذہن ہمارے خارجی حالات اور تجربات کی روشنی میں پروان چڑھتا ہے۔ بچہ آگ کے منفی پہلو سے اس وقت تک آشنا نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کا اپنا ہاتھ نہ جل جائے یا کسی کا ہاتھ جلتا نہ دیکھ لے مگر وہ اپنی نیند کے صحیح وقت پر سو جاتا ہے اور بھوک کے وقت شور مچاتا ہے اگر اسے دودھ نہیں ملتا تو وہ انگوٹھا چوسنے لگتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اس کی طبع پر اس کا ذہن غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ذہن میں زندگی گزارنے لگتا ہے اور اس کی طبع بہت نیچے دبی رہتی ہے۔"

"لیکن جانور اس سے مختلف کیوں ہیں۔"

اس لیے کہ ان کے ذہنی تجربات بالکل محدود ہیں۔ ان کی طبیعت پر ذہن کا غلبہ اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طبع ان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔ کتا کبھی گھاس نہیں کھاتا۔ لیکن بیماری کی حالت میں وہ کسی نہ کسی باغ میں جا کر گھاس کھانا ضرور شروع کر دے گا۔ تندرست گائے کبھی

نمک کو منہ نہ لگائے گی لیکن نفخ کی حالت میں وہ نمک ڈھونڈھ کر چاٹنا شروع کر دے گی۔ اس وقت ان کی طبع رہنمائی کر رہی ہوتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ اپنے ذہن کے سہارے بہت آگے نکل آیا ہے اور طبع کو بالکل کھو بیٹھا ہے۔"

"مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ انسانی طبع بھی اس کی درست رہنمائی کر سکتی ہے؟"

"آپ نے دیکھا ہوگا یا سنا ہوگا۔ جب ڈاکٹر اپنے مریض سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں تو اسے کھلی اجازت دے دیتے ہیں کہ وہ جو چاہے کھا پی لے۔ اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کہ وہ اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ انہیں امید ہوتی ہے کہ شاید وہ کوئی ایسی چیز کھا لے جو اس کی بیماری کا علاج ثابت ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر انسان کی طبع مکمل طور پر بیدار ہو جاتی ہے اور اس پر سے ذہن کا دباؤ اٹھ چکا ہوتا ہے۔ لازمی طور پر اس وقت وہ جو چیز کھانے کو طلب کریگا وہ اس کی طبع کا تقاضا ہوگا جو کبھی غلط نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ مریض بیحد کمزور ہو چکا ہو اور طبعی علاج بھی اس کے مضمحل قویٰ کی طاقت کو بحال نہ کر سکے۔ اہلِ یونان اسی علاج کے قائل تھے۔"

تو مسٹر ناٹر آپ کا مدعا یہ ہے کہ انسان ذہن سے نجات حاصل کر لے۔"

"بالکل نہیں — انسان کا ذہن اور پھر آج کے انسان کا ذہن بڑی انمول شے ہے اسے ہاتھ سے چھوڑ دینا انسانی سوسائٹی کے لیے ایک عظیم نقصان ثابت ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں طبعِ سلیم سے بھی دوستی رکھنی چاہئے اور اعتدال کے راستے پر چلنا چاہئے۔ تاکہ وقت آنے پر ہم دونوں میں جسے چاہیں استعمال میں لا سکیں۔"

کیپٹن فاروقی نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"اور اگر ہم صرف ذہن کا ہی ساتھ دیں تو؟"

"یعنی آپ کا مطلب ہے ہم ذہنی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔"

"جی ہاں — یہی سمجھ لیجئے۔"

تو پھر ایک وقت آئے گا جب انسان کا سر ہی سر ہوگا اور باقی جسم غائب ہو جائیگا۔"

"اوہ مائی گاڈ! وہ کس قدر ٹیریبل ایج ہوگی؟"

مسز پانڈے نے اپنا تربوز اتنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مسز فاروقی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔ کیپٹن فاروقی جلدی سے اس پر جھک گئے۔ اور آہستہ سے بولے۔

"فی لنگ سلیپی ڈارلنگ؟"

کملا اور شیلا بھی ناٹر کی گفتگو سے کافی بور ہو گئی تھیں اور سلیپی فیل کر رہی تھی۔ مسٹر پانڈے اپنا گنجہ سر کھجلا رہے تھے۔ مسز پانڈے نے آخری بار اپنا چمکیلا ہار درست کرتے ہوئے گھڑی دیکھی اور چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولیں۔

"ہم نے کافی دلچسپ وقت بسر کیا۔"

"اس کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے کرسیاں گھاس پر پیچھے گھسیٹ دی گئیں۔

"تھینک یو کملا۔"

"تھینک یو مس ماتھر —"

"او ونڈرفل ڈنر —"

سب سے آخر میں ناٹر نے کملا سے ہاتھ ملایا اور سگریٹ پھینک کر چپ چاپ بنگلے کے احاطے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد کملا ماتھر نے اسے کبھی کسی دعوت پر بلاوے کا پیغام بھیجنا گوارہ نہ کیا۔ آخر وہ ایسے روشن اور پر مسرت موقعوں پر اس قدر خشک موضوع کیوں چھیڑ دیتا ہے؟ وہ سر سے لے کر پاؤں تک بور ہے بگ بور!!"

کئی دنوں تک اس نے ناٹر کو نہ دیکھا۔ ایک روز اسے پتہ چلا وہ کسی اردو اخبار کے دفتر میں جرنلزم کی مشق حاصل کر رہا ہے۔ کملا اور جل گئی۔ اسے اخبار سے سخت نفرت تھی۔ کیونکہ ان میں بمباری۔ قحط۔ سٹرائیک اور پولیس فائرنگ کی دہشت انگیز خبروں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ جس روز اسے رنگون ریڈیو پر پہلا پروگرام ملا وہ بہت خوش ہوئی۔ دلچسپ زندگی بسر کرنے کا ایک اور پہلو نکل آیا تھا۔ ریڈیو پر دو بنگالی گیت گا کر کملا کار میں بیٹھ کر سکاٹ مارکیٹ کچھ خریدنے گئی۔ وہاں اسے ناٹر کی بڑی بہن کیسرل

گئی۔ باتوں ہی باتوں میں کملا نے نائر کا پوچھا۔ جس پر کیسیر نے غمگین لہجے میں اسے بتایا۔ کہ اس کی صحت کئی دنوں سے زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔ چنانچہ اسے میمیو پہاڑ پر بھیج دیا گیا ہے۔ کملا کانپ سی گئی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پہاڑ پر جاکر بحال ہونے والی صحت خراب کیوں ہوتی ہے اس رات اس نے نائر کو پورے صفحے کا خط لکھا۔ جس میں اسے اپنی صحت کا خیال رکھنے اور کھانے پینے کی چیزوں میں پرہیز رکھنے کی ہدایت کی۔ دس دن بعد نائر کا مختصر سا خط آیا کہ اس کی صحت پہلے سے کافی اچھی ہے اور وہ کوئی فکر نہ کرے ـــ دن گزرتے گئے اور کملا ماتھر کی بڑھتی ہوئی نت نئی دلچسپیوں میں نائر کی دبلی پتلی شبیہہ گم ہوکر رہ گئی۔ لیکن آج البم میں اس کی تصویر دیکھ کر کملا کی نگاہوں میں تمام گزرے ہوئے دنوں کی یادیں گھوم گئی تھیں۔

کمرے میں کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ کملا پلنگ پر سے اٹھ کر کھڑکی میں آگئی۔ رات کے اوّلین تاریک سایوں میں باغ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ آسمان پر کٹے پھٹے بادلوں کے درمیان کہیں کہیں چمکیلے تارے اپنی پلکیں جھپکا رہے تھے ایکا ایکی اسے یوں معلوم ہوا جیسے باغ کے اندھیرے میں انور اس کی طرف بانہیں پھیلائے بڑھ رہا ہے کملا نے جلدی سے کھڑکی بند کردی اور بجلی کا بٹن دبا دیا۔

۸

عید کی رات کو قاضی صاحب نے اخبار کے دفتر میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا اور انور کو بھی بلا بھیجا۔ کھانے پر بریانی۔ مُرغ، زردہ اور شامی کباب عام تھے قاضی صاحب انور کے بالکل سامنے بیٹھے تھے اور جرمن قوم کی جنگی صلاحیتوں پر تبصرہ فرما رہے تھے۔

"سوچنے کی بات ہے اتنا چھوٹا ملک اور اس قدر وسیع تیاریاں کہ آج نارویے پر قبضہ کیا ہے تو کل ہنگری میں ٹینک گھس رہے ہیں۔"

مغل سٹریٹ والے بڑے حکیم صاحب نے مرغ کی ٹانگ چباتے ہوئے پوچھا۔

"آخر قاضی صاحب اس کی وجہ کیا ہے؟"

"وجہ؟" قاضی صاحب چاولوں پر شوربے کا روغن ڈال کر بولے۔

"وجہ محض یہ ہے کہ ان میں جوشِ ایمان کی شدت ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا۔ جسے اپنے سینوں میں لے کر آج سے تیرہ سو سال پہلے عرب اٹھے تھے۔"

میکائیل۔ انور کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہنی کو ٹھوکا دیا اور بولا۔

"لیکن قاضی صاحب! امریکن بھی بڑی لڑاکا قوم ہے۔"

"ارے یہ زن مرید کیا لڑیں گے۔ انہیں ناچنے گانے سے تو فرصت ملے آج

کی تاریخ ڈال کر میری بات لکھ رکھو۔ اگر انہوں نے اپنا وطیرہ نہ چھوڑا تو ہٹلر سارے یورپ پر چھا جائے گا۔"

ایک کونے سے آواز آئی۔

"مگر ہٹلر بھی تو ایک ایکٹریس سے عشق کرتا ہے۔"

تقریباً سبھی لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ حکیم صاحب کو اچھو آگیا اور وہ رومال نکال کر کھانسنے لگے۔ قاضی صاحب زیر لب مسکرا رہے تھے اور چپ تھے۔ پرلی طرف سب سے آخری کرسیوں پر دفتر کے کلرک اور کاتب اور پریس کے مستری بیٹھے تھے اور ایک دوسرے سے بوٹیاں چھین رہے تھے۔ کھانے کے بعد مہمان ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور پان کی خوشبو اور سگریٹ کے دھوئیں میں لطیفہ بازی شروع ہو گئی۔ ایک آدمی کوئی انتہائی فحش لطیفہ انتہائی مہذب زبان میں سناتا اور باقی لوگ قہقہوں کے سیلاب میں لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ قاضی صاحب نے حقے کے لئے رحمت کو آواز دی۔ انور نے یونہی پوچھا۔

"عبدل کو چھٹی دے دی قاضی صاحب؟"

"ہاں بھئی وہ اس دنیا سے ہی چھٹی کر گیا ہے۔"

انور حیرت سے قاضی صاحب کو تکنے لگا۔ قاضی صاحب دانتوں کو خلال کرتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

"کہنے لگا قاضی صاحب مجھے چھٹی دیجئے۔ گھر جانے کو بڑا دل چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ بھئی چلے جاؤ۔ چنانچہ ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی دے دی۔ پتہ نہیں بھئی اس بوڑھے کو اپنی موت کی پہلے ہی سے کیونکر خبر ہو گئی تھی۔ میکائیل سے جاتی مرتبہ کہہ گیا۔ میکائیل صاحب مجھے تو وطن کی مٹی بلا رہی ہے۔ اس کے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد اس کی بیوہ لڑکی کا خط آیا کہ ابا جی ہمیں چھوڑ گئے ہیں اور کسی آتے جاتے کے ہاتھ ان کا باقی سامان بھیج دیجئے گا۔ اب میں سوچتا ہوں کس کے ہاتھ سامان بھیجوں۔"

قاضی صاحب کا حقہ آگیا۔ رحمت نے چمکیلی نے ان کی طرف پھیر دی اور خود چلم دبانے لگا۔ انور نے سوچا کیا رحمت عبدل کی جگہ آیا ہے؟ اس کے ذہن میں بوڑھے عبدل کی شکل گھوم گئی۔ سفید سر۔ جھریوں بھرا خشک چہرہ۔ نچلا جبڑا قدرے لٹکتا ہوا۔ انور کے ذہن میں قاضی صاحب کا ایک پرانا جملہ گونج اٹھا۔

"جب عبدل پہلے روز یہاں آیا تو اس کے گلے میں ریشمی رومال تھا۔"

اور جب وہ وہاں سے چلا تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کمر جھکی ہوئی تھی۔ نچلے تین دانت غائب تھے اور بوڑھی آنکھوں میں سائے لہرا رہے تھے۔ قاضی صاحب کے بیس روپے اسے ان کے گھر میں کھینچ لائے۔ اور وطن کی مٹی اسے قبر میں لے گئی بوڑھا کسی اجاڑ قبرستان میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہو گا اور اس کا جسم گل سڑ گیا ہو گا لیکن قاضی صاحب کا حقہ گڑگڑا رہا ہے۔ یہ حقہ خاموش نہ ہو گا۔ عبدل نہ سہی رحمت سہی۔ قاضی صاحب اسے بھی بھرنا سکھلا دیں گے۔"

قاضی صاحب نے خالص پنجاب کے دیہاتی تمباکو کے نشے میں ڈوب کر انور کو آہستہ سے کہا۔

"سناؤ بھئی ریڈیو پر کیسے گزرتی ہے؟ سنا ہے آج کل باغ میں خوب سیریں ہوتی ہیں۔ اچھا ہے چلنے پھرنے سے آدمی کا معدہ ٹھیک رہتا ہے۔"

انور ذرا گھبرا گیا۔ قاضی صاحب کا لہجہ جملے کی سادگی کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ انور فوراً سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ قاضی صاحب کے منہ سے یہ بات سننے کیلئے تیار نہ تھا۔ اس نے جلدی سے بات ٹال دی اور قاضی صاحب حقے کی نے منہ میں لیے مکار ہنسی ہنستے رہے۔ اس کے بعد انور وہاں سے اٹھ آیا۔ میکائیل احمد لیوس سٹریٹ کے موڑ تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے انور سے کہا۔

"اگرچہ تمہارے اور بیرسٹر صاحب کی لڑکی کے عشق کا دفتر میں سب کو علم ہے لیکن میں اس میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔ اس عمر میں کسی بھی لڑکی سے تعلقات کا بڑھ جانا ایک طبعی تقاضا ہے۔ ہاں عقلمند آدمی ان تعلقات کو ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھنے

دیتا اور مجھے تم سے یہی امید ہے۔"

انور گھر جانے کی بجائے بندرگاہ کی طرف چل دیا۔

وہ حیران تھا کہ قاضی صاحب کو ان تمام معاملات کا کیسے علم ہو گیا۔ اور پھر اسے کملا سے عشق ہی کب ہوا تھا؟ وہ تو ساتھیں کی تلاش میں جھیلوں کی طرف گیا تھا۔ انور قاضی صاحب کی بڑبولی طبیعت سے بہت گھبراتا تھا اور اسے اپنی عزت سے زیادہ کملا ماتھر کا خیال تھا وہ یہ کسی طرح گوارہ نہ کر سکتا تھا کہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی اس کی بیوقوفی کی وجہ سے خواہ مخواہ بدنام ہو جائے۔ وہ دریا کنارے لکڑی کے شکستہ بنچ پر بیٹھا دیر تک کملا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ آج تک ان کے ہاں نہ گیا تھا وہ کملا کے گھر سے بھی ناواقف تھا اور وہ بیچاری بھی اس کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی پھر یہ مفت کی جگ ہنسائی کیوں؟ اگر کملا تک کسی نہ کسی طرح یہ بات پہنچ گئی تو اس کا کیا حال ہوگا، شاید وہ بدنامی کے ڈر سے خودکشی کر لے۔ کم از کم وہ ریڈیو پر آنا بالکل چھوڑ دے گی اور جب اس کے باپ کو پتہ چلا تو وہ سب سے پہلے اسے نوکری سے برخاست کرا دے گا۔ سرکاری حلقوں میں اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ پھر وہ کہاں جائے گا؟ اس کی بوڑھی ماں اور بہنیں کیا کریں گی؟ انور اپنی ماں اور محبت کرنے والی بہنوں کو یاد کر کے غمگین سا ہو گیا۔ اسے دو روز پہلے ان کے عید کارڈ ملے تھے اور انہیں عید سے ایک دن پہلے پردیسی بھائی کی بھیجی ہوئی عیدی مل گئی ہو گی۔ عید اور وطن، ماں اور بہنیں!

انور بنچ سے اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ لمبا راستہ پیدل ہی طے کرنے کے بعد جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو نوکر محسن باورچی خانے میں سو رہا تھا۔ انور نے اسے بالکل نہ جگایا خود ہی پانی گرم کر کے چائے بنائی۔ پی۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بستر میں لیٹ کر پھر انہی افسردہ خیالات میں کھو گیا نہ جانے کتنی رات گزر گئی تھی کہ کسی نے سیڑھیوں والے دروازے پر آہستہ سے دستک دی وہ سمجھا کوئی چوہا ہوگا۔ لیکن جب دوسری اور تیسری بار وہی مدھم آواز سنائی دی تو انور آہستہ سے اٹھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور سیڑھیوں والے بند دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

سیڑھیوں والے بند دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کون؟" انور نے پوچھا

"میں ہوں۔"

دوسری طرف سے ایک خشک سی آواز سنائی دی۔ انور نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے عنیزہ کھڑی تھی۔ سیاہ دوپٹے میں لپٹا ہوا اس کا زرد چہرہ بے حد دبلا اور اداس ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں سہمی ہوئی خاموشی تھی۔ انور صرف اتنا کہہ سکا۔

"اندر آ جاؤ۔"

سیڑھیوں والا دروازہ بند کر کے اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ آگے پردہ اچھی طرح پھیلا دیا۔ میز کی دراز سے موم بتی نکال کر جلائی۔ عنیزہ ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"بیٹھ جاؤ عنیزہ۔"

عنیزہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی اور انور کرسی پر بیٹھ گیا۔

"اب بتاؤ۔ عنیزہ بات کیا ہے؟"

عنیزہ نے اپنا چہرہ لمبی انگلیوں والے سفید ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور موم بتی کی کمزور روشنی میں انور کو اس کا جسم ہلتا ہوا معلوم ہوا! وہ پریشان سا ہو گیا۔

"عنیزہ رو کیوں رہی ہو؟"

عنیزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب انور کو اس کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور پلنگ پر جا بیٹھا۔ اس نے بڑی محبت سے عنیزہ کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ عنیزہ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ادھ کھلے ہونٹوں کے درمیان سفید دانتوں کی قطار چمک رہی تھی اس نے انتہائی پیار بھرے لہجے میں عنیزہ سے کہا۔

دیکھو عنیزہ مجھ سے کوئی بات چھپاؤ نہیں۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے مجھے اپنے دکھ درد کا ساتھی سمجھتے ہوئے صاف صاف بتا دو۔"

انور کے اتنا کہنے پر عنیزہ بے اختیار پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گئی اور دبی دبی سسکیاں بھرنے لگی۔ انور کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ناچار وہ خاموش ہو گیا اور عنیزہ کو اپنے ساتھ لگا کر دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ جب عنیزہ کی سسکیاں بند ہوئیں تو اس نے اسے اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھیں جو سرخ ہو رہی تھیں۔ عنیزہ نے شانوں پر سے پھسلا ہوا دوپٹہ اچھی طرح سے سنبھال کر اوڑھا اور بھیگی ہوئی خفیف آواز میں بولی۔

"میں آپ سے کچھ کہنے آئی ہوں۔"

انور اس کے افسردہ چہرے سے آنکھیں ہٹائے بغیر بولا: "ہاں ہاں تم کہو تو؟"

ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ عنیزہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح چونک اٹھی۔

"یہ کیا تھا؟"

"کچھ نہیں یہاں چوہے بہت ہیں۔"

عنیزہ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

"آپ کا ملازم....."

تم فکر نہ کرو۔ وہ کچن میں سو رہا ہے۔"

اس نے پژمردہ رخساروں والا چہرہ جھکا لیا۔ اور کچھ دیر خموشی سے فرش کو گھورتی رہی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ انور کی بیتابی اور الجھن بڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے ملازم کے جاگ اٹھنے کا اتنا خیال نہیں تھا۔ جتنا اس بات کا ڈر تھا۔ کہ کہیں عنیزہ کی ماں یا اس کا باپ نہ جاگ اٹھے اسے ایک ہی لمحے میں کئی اک وسوسوں نے گھیر لیا تھا۔ عنیزہ راز کا انکشاف کرتے ہوئے اس قدر گھبرا رہی تھی۔ موم بتی پگھلی جا رہی تھی۔ اور اس کی نرم و پرسکون روشنی صرف ان دونوں تک ہی محدود تھی۔ تب عنیزہ ایک لمبی خاموشی کے بعد بولی:۔

میں یہ کہنے آئی ہوں کہ ــــ کہ مجھے ــــ"

"ہاں۔ ہاں کہ تمہیں

"مجھے کہیں سے زہر لا دیں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں اس زندگی کا اپنے ہاتھوں خاتمہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کیوں عنیزہ؛ زندگی اتنی سستی نہیں ہے۔"

"اسی لیے میں اسے ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ کہ یہ بہت مہنگی ہے میں اتنے مہنگے داموں یہ سودا قبول نہیں کر سکتی۔"

عنیزہ کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ اور اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

اس کے بعد عنیزہ نے سسکیوں اور آنسوؤں کے درمیان اسے رک رک کر بتایا۔ کہ وہ ماں بننے والی ہے اور اس نے زہر کھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت کی اس گھناؤنی زندگی کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انور کو یک بارگی یوں محسوس ہوا گویا کسی نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا ہو اور کمرے میں گہرا، دبیز، ناقابلِ عبور اندھیرا چھا گیا ہو وہ سگریٹ پینے کے لیے ڈبی میں سے سگریٹ نکال رہا تھا۔ اس نے سگریٹوں کی ڈبی اسی طرح میز پر رکھ دی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ عنیزہ، درخشاں! درخشاں! عنیزہ!!

لیکن یہ کیونکر ہوا؛ کیسے ہوا؛ کب ہوا؛ عنیزہ کا تعلق اور کس سے تھا؛ کیا وہ کسی اور سے بھی محبت کر رہی تھی؛ کیا محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے؛ انور کو یہ بات خوفناک حد تک عجیب سی لگی کہ محبت میں مبتلا ہو کر لڑکی دیکھتے دیکھتے ماں بن جائے عنیزہ تو انور سے محبت کرتی تھی۔ اس نے تو ہمیشہ اسے اپنی سدا ساتھ نبھانے والی دوستی کا یقین دلایا تھا پھر وہ راستے میں ہی کیوں بیٹھ گئی؛ مگر وہ کون تھا۔ جس نے اس کے ساتھ ایسا ذلت آمیز سلوک کیا؛

"عنیزہ ــــ عنیزہ مجھے بتاؤ وہ کون تھا؟"

عنیزہ پلنگ کی پشت پر رکھے ہوئے بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ پھر مضمحل لہجے میں بولی۔

"وہ ــــ وہ رشتہ دار لڑکا ہے۔ میں دو ایک بار ان کے ہاں گئی تھی وہ گٹار بجاتا ہے

اس نے آپ کا بھی مجھ سے ذکر کیا تھا وہ آپ کو جانتا ہے۔ اس نے کہا تھا وہ مجھ سے شادی کرے گا مگر.....“

”ہاں ہاں مگر.....“

”اب وہ صاف مکر گیا ہے۔ وہ میری صورت سے بیزار ہے۔“

”اس کا نام محمود تو نہیں؟“

”ہاں۔“

انور کا خون کھولنے لگا۔ وہ معصوم صورت والا عیار بھیڑیا۔ انور اسے کس قدر شریف سمجھے ہوئے تھا اس کا جی چاہا کہ ابھی جا کر پستول سے اس کے لمبے بالوں والی کھوپڑی اڑا دے۔

انور اپنی جگہ سے اٹھ کر عنیزہ کے پاس ہو بیٹھا۔ اس نے اس کا سنہری بالوں والا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس خوبصورت سر کے اندر کس قدر دہشت ناک خیالات بھوتوں کی مانند ناچ رہے تھے۔ انور پیار سے عنیزہ کے ابریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

یہ ہمت ہارنے کا مقام نہیں عنیزہ ـــ بلکہ بھول جانے اور نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا مقام ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اس پر آنسو بہانا اور اسے یاد کر کے اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرنا بے سود ہے۔ تم ایک گناہ کا ارتکاب کر چکی ہو۔ اب اس پر نادم ہو کر ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب مت کرو۔ جو کچھ ہوا اس میں تمہارے غیر معتدل جذبات کا زیادہ ہاتھ ہے اور یہ جذبات تمہارے گھر کی غیر معتدل ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس میں نہ تمہارا کوئی قصور ہے اور نہ محمود کا ـــ ہاں تمہارا جرم اس وقت شروع ہوتا ہے جب تم زہر کھانے کے متعلق سوچتی ہو اور تمہارا محمود اس لیے پھانسی پر چڑھا دینے کے لائق ہے کہ اس نے تمہیں دھتکارتے وقت اپنے جذبات کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے یہی جذبات جنہوں نے اسے بے قصور ثابت کیا اب اسے ایک سنگین گناہ کا مجرم ٹھہراتے ہیں۔

اپنے بارے میں میں تمہیں صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میرا دل اب بھی تمہاری عزت سے معمور ہے اور اس میں کبھی کمی واقع نہ ہو گی۔ میں اس وقت بھی وہی انور ہوں۔ جو سیڑھیوں کا دروازہ کھولتے وقت تھا۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔ پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں کوئی فکر نہ کرو۔ اگر تم اس سے واقعی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہو تو کل اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“

”پھر مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ کچھ بھی ہو وہ میرا خون ہے کوئی ماں اپنے بچے کا گلا نہیں گھونٹ سکتی پر ـــ میرے ماں باپ تو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اسی ڈر سے میں نے کسی سہیلی سے یہ بات نہیں کی۔ ان کے منہ سے بات نکل جانے کا ڈر تھا۔

میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس ننھی سی جان کا ضائع ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اگرچہ وہ غریب بالکل نردوش ہے۔ لیکن سوسائٹی ابھی ایسے بچے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی یہ الگ بات ہے کہ ہماری سوسائٹی بھی ایسا ہی ایک غیر قانونی بچہ ہے ـــ لو عنیزہ کافی دیر ہو گئی۔ تمہارے گھر میں کوئی جاگ نہ اٹھے۔ اب تم جاؤ۔“

عنیزہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آہستہ سے اٹھی۔ انور نے پردہ ہٹا کر کمرے کا دروازہ کھولا۔ سیڑھیوں والے دروازے میں سے گزرتے ہوئے دونوں نے محبت کی زخم خوردہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک لحظہ کے لیے۔ دونوں کے ہونٹ آپس میں مل گئے۔ عنیزہ کے ہونٹوں پر آنسوؤں کا نمکیں ذائقہ تھا۔ عنیزہ انور کی طرف دیکھ کر افسردگی سے مسکرائی اور انور نے محسوس کیا گویا اس نے باتونی اور خاموش عنیزہ کے درمیان میں گھومنے والی حقیقی اور سچی عنیزہ کو دیکھ لیا ہو۔

عنیزہ کو رخصت کر کے انور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میز کے کونے پر جلتی ہوئی موم بتی بجھ رہی تھی۔ انور سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنی محبت کی شکست پر غور کرنے لگا وہ اس دردناک حادثے کو اپنی محبت کی سب سے بڑی ہار سمجھ رہا تھا۔ ایکا ایکی اسے مندر کی سیڑھیوں پر پھول بیچنے والی لڑکی کا خیال آ گیا۔ ساتیں! ساتیں!!

وہ اس وقت کہاں ہو گی؟ انور نے اس روز کے بعد اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اسے کہیں نہ مل سکی تھی۔ کیا عجب اگر وہ اسے مل جاتی۔ تو اس کی محبت کا بھی یہی انجام ہوتا۔

درخشاں، سائیں، عنیزہ، کملا.....

پھول، جھیلیں، چشمے، سراب، دھوکا، فریب ـــ سب محبت کے غیر قانونی بچے۔ تمام جذبات کا غیر معتدل ابال۔ الف سے ی تک کھوٹے سکوں کی کہانی۔ کڑوے پھلوں کے درخت، جھوٹے موتیوں کے سیپ۔ صحراؤں میں تنہا چھوڑ جانے والے قافلے، ہوائی قلعے، ریت کی دیواریں ـــ سب جھوٹ، سب کچھ بکواس! دنیا کی ہر عنیزہ کسی نہ کسی انور سے محبت کرتی ہے اور کسی نہ کسی محمود کے پاس چلی جاتی ہے اور دنیا کا ہر انور سگریٹ سلگا کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ دنیا کا ہر محمود مزے میں ہے دنیا کا ہر نور تکلیف اٹھاتا ہے۔ پھر وہ کیا کرے؟ کہاں جائے۔

اس نے سگریٹ بجھا کر موم بتی بجھائی اور بستر میں گھس گیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ روشندانوں کے شیشوں سے چھن کر اس کے بستر پر پڑ رہی تھی لیٹے لیٹے اس نے ایک طویل انگڑائی لی اور اچھل کر بستر سے باہر آگیا۔ پلنگ کے پاس گرے ہوئے عنیزہ کے ریشمی رومال نے اس کے ذہن میں رات کے واقعے کی تلخ یاد تازہ کر دی۔ لیکن وہ اس قدر تازہ دم تھا۔ کہ رومال میز پر پھینک کر غسل خانے میں گھس گیا۔ تازہ اور ٹھنڈے پانی میں جی بھر کے نہانے کے بعد وہ اپنے تئیں اور زیادہ شگفتہ اور لطیف محسوس کرنے لگا۔ بوڑھا محسن چائے اور ناشتہ لے آیا۔ چائے وغیرہ پی کر اس نے کپڑے بدلے اور سگریٹ کیس میں نئے سگریٹ رکھے اور نیچے اتر آیا۔ لیوس سٹریٹ کے موڑ سے وہ بس میں سوار ہو کر سیدھا مغل سٹریٹ کے چوک میں جا اترا۔ وہاں اس نے گھڑی دیکھی۔ دن کے دس بج رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے انور گھڑیوں کی ایک بہت بڑی دوکان کے آگے رک گیا اسے دور سے محمود چند ایک برمی لڑکیوں کو گھڑیاں دکھاتا نظر آیا۔ انور دوکان کے اندر داخل ہو گیا

وہ کچھ دیر الماریوں میں لگی ہوئی گھڑیاں دیکھتا رہا۔ جب گاہک لڑکیاں دوکان سے باہر نکل گئیں تو انور محمود کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"اخاہ! انور صاحب، آج کدھر نکل پڑے؟ کہیئے کہاں رہتے ہیں آپ؟ ریڈیو پروگرام تو بھئی روز سنتے ہیں۔ خوب ریکارڈ بجاتے ہو؟"

انور کاؤنٹر کے شیشے پر کہنیاں ٹکائے خاموش کھڑا رہا۔

"کہیئے حضور کیسے آنا ہوا؟"

"ذرا میرے ساتھ پلاڈیم تک چلو۔"

محمود نے آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔

"خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں بالکل خیریت ہے؟"

"کوئی خاص کام ہے؟"

"بہت زیادہ خاص کام ہے۔"

"اوہو ـــ تو ابھی چلیئے۔"

محمود نے ریشمی مفلر اتار کر گلے میں ڈالا۔ سلکی قمیض کے کھلے کف بند کیئے اور انور کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا۔ کیفے پلاڈیم، پلاڈیم سینما کی عمارت میں دوسری منزل پر واقع تھا اور مغل سٹریٹ کے چوک سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ جب دونوں کونے والی ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھ گئے تو انور نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ فوراً ہی چائے آگئی۔ چائے بنا کر انور نے ایک پیالی محمود کی طرف سرکا دی اور دوسری پیالی اپنے سامنے رکھ کر سگریٹ سلگا لیا

"تم عنیزہ کو جانتے ہو؟"

محمود کے ہاتھ میں اٹھی ہوئی پیالی واپس پلیٹ میں آگئی

"آپ کا یہ بات پوچھنے سے مطلب؟"

"ابھی ظاہر ہو جائے گا۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو کیا تم عنیزہ کو جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں۔"

"اور تم نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے بھی واقف ہو؟"

محمود نے گھبرا کر انور کو دیکھا۔ انور کی نگاہیں عقاب کی طرح اس پر گڑی ہوئی تھیں۔

"آپ صاف صاف کہیئے چاہتے کیا ہیں؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم فوراً عنیزہ سے شادی کر لو۔"

"اور اگر میں ایسا کرنے سے انکار کر دوں؟"

"تم انکار نہیں کر سکتے۔"

"وجہ؟"

"وجہ محض یہ کہ اس بھولی لڑکی کو تم نے پھسلایا ہے اور اب اس کے پیٹ میں تمہارا بچہ ہے۔ وہ بچہ تم سے اپنا حق طلب کرتا ہے۔"

"اس کا کوئی ثبوت؟"

"اس کا ثبوت؟ — اس کا ثبوت خود عنیزہ ہے۔"

"وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"یہ مت بھولو کہ تم ابھی ابھی اپنے جرم کا اقرار کر چکے ہو۔"

"میں اسے اپنے اوپر ایک بہتان سمجھتا ہوں۔"

"تو گویا تم اس سے شادی کرنے سے انکار کرتے ہو۔"

"بالکل۔"

"تو پھر دو سو روپے یہاں رکھ دو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہارے بچے کو ضائع کرنے کے ڈاکٹری اخراجات۔"

"میں ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔"

"انور نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا

"دیکھو محمود — تمہیں منوانے کے لیے میرے پاس دلائل کے علاوہ ایک اور

ہتھیار بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کا استعمال تمہارے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تم شرافت سے یا تو دو سو روپے یہیں نکال کر رکھ دو اور یا دوکان پر جا کر مجھے ذاتی چیک لکھ دو۔ کسی عورت کے جذبات سے کھیلنے اور گٹار بجانے میں بہت فرق ہے اور تم دل میں یہ خیال مت کرنا کہ تم عنیزہ کو بدنام کر سکو گے اور اس کے ماں باپ کی عزت ہمیشہ تمہاری خوشنودگیِ طبع کی محتاج ہو گی۔ تمہاری زبان قبل اس کے کہ وہ عنیزہ کی آبرو پر حرف ریزی کرے جڑ سے کاٹ کر پھینک دی جائیگی۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم مجھ سے جہالت کے ساتھ پیش نہ آؤ۔ کیونکہ میں خود جاہلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر جاہل ہوں۔ مجھ سے ٹھنڈے دل سے بات کرو۔ مبادا میرے اندر چھپا ہوا غنڈہ بیدار ہو جائے۔"

محمود پر گویا انور کی باتوں کا بالکل اثر نہ ہوا۔ اس نے میز پر کہنیاں رکھتے ہوئے غصے اور نفرت کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں آپ کس حیثیت سے مجھ سے بات کر رہے ہیں؟"

"عنیزہ کے بڑے بھائی کی حیثیت سے۔"

"اس کا ثبوت۔"

"ابھی دیتا ہوں۔"

انور نے نہایت اطمینان سے اپنا سگریٹ راکھدان میں دبایا اور پوری قوت سے محمود کے بائیں جبڑے پر مکا رسید کر دیا وہ کرسی سے لڑکھڑا کر نیچے فرش پر گر پڑا اور اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی سی سرخ لکیر بہہ نکلی۔ انور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر اور ثبوت چاہئے تو وہ بھی دیئے دیتا ہوں۔"

ارد گرد بیٹھے لوگ ہوسے لوگ فوراً اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر ان کے گرد جمع ہو گئے ہوٹل کا مینجر کاؤنٹر پر سے چھلانگ لگا کر باہر کودا اور لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹانے لگا۔

محمود اگرچہ چھوٹے قد کا تھا۔ مگر طاقت میں انور سے کم بھی نہ تھا اس نے اٹھتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بجلی ایسی تیزی کے ساتھ چائے دانی اٹھا کر انور کے سر پر دے ماری چائے

دانی ٹوٹ گئی اور انور کی داہنی آنکھ کے آگے اندھیرا چھا گیا اس کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کی لڑائی اس قدر شدید تھی۔ کہ ان پر زخمی چیتوں کا گمان ہو رہا تھا۔ لوگ ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ بہت سے ہوٹل کے دروازوں میں جا کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کا سانس پھول رہا تھا اور موقع ملتے ہی ایک دوسرے پر کاری وار کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ محمود انور کے نیچے سے نکل آیا۔ انور نے محمود کی ٹانگوں پر اپنے دونوں ہاتھوں پر اچھال کر پرے پھینک دیا۔ محمود نے کرسی اٹھائی۔ انور نیچے جھک گیا۔ کرسی دوسری منزل کی کھڑکی سے گزر کر نیچے سڑک پر جا گری۔ انور نے سوڈا واٹر کی بوتل محمود کی طرف اچھالی۔ محمود پرے ہٹ گیا۔ بوتل دیوار سے ٹکرائی۔ زور کا دھماکا ہوا۔ اور منیجر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ٹیلیفون ریسیور اٹھا لیا۔ انور کاؤنٹر کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے ٹیلیفون کا تار اکھیڑ دیا۔ منیجر بھونچکا رہ گیا۔ پھر انور بھوکے شیر کی طرح محمود پر جھپٹا۔ اور پے در پے مکوں نے محمود کو فرش پر چاروں شانے چت گرا دیا۔ انور نے کاؤنٹر سے پانی کا جگ اٹھا کر اس کے منہ پر ڈالا اور کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ بٹن بند کر کے اس نے رومال سے منہ اور پیشانی پر سے خون پونچھا۔ بال درست کیے اور ہوٹل کے دروازے سے باہر نکل گیا سیڑھیاں اوپر چڑھتے ہوئے کچھ لوگوں نے انور کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے۔

نیچے فٹ پاتھ پر کچھ دکاندار ٹوٹی ہوئی کرسی کے ٹکڑے جمع کیے ہوئے تھے ایک موٹا سا بنگالی بنیا پھولی ہوئی توند پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا۔

"سالا ہم لوگ تو بال بال بچ گیا بابو"

پلاڈیم سے باہر نکل کر انور سیدھا ایک ڈاکٹر کی دکان میں گھس گیا اس کی پیشانی پر سے چائے دانی لگنے سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے زخم دھو کر اس پر دوائی لگائی اور پٹی کا ٹکڑا چپکا دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ کسی سے لڑ پڑے ہیں"

"جی ہاں ذرا جھگڑا ہو گیا تھا"

انور نے جیب سے کنگھی نکال کر بالوں کو اچھی طرح ٹھیک ٹھاک کیا اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر سیدھا ریڈیو سٹیشن پہنچ گیا دفتر میں چپڑاسی سے لے کر مسٹر ملک تک سبھوں نے اس سے پیشانی والے زخم کی وجہ پوچھی۔ اور اس نے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ وہ سڑک پر سے پھسل پڑا تھا۔

دوسرے روز گیارہ بجے دن انور پھر لیڈس سٹریٹ سے مغل سٹریٹ کو جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ فٹ پاتھ پر چلتے چلتے وہ محمود کی دکان کے آگے پہنچ کر رکا اور اندر داخل ہو گیا۔ محمود سیلز کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔ انور قریب جا کر کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا چپ چاپ کھڑا ہو گیا اور محمود کو معنی خیز نگاہوں سے گھورنے لگا محمود کا بایاں جبڑا ابھی تک سوجا ہوا تھا۔ اور پیشانی پر دو جگہ پٹیاں چپکی ہوئی تھیں پہلے تو وہ انور کو یوں بے باکانہ اندر آتے اور پھر کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے ہوتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ پھر آہستہ سے پرلی طرف گیا۔ میز کے دراز میں سے لمبی چیک بک نکالی۔ چیک لکھ کر کاٹا اور انور کے آگے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ انور نے دیکھا چیک پر ایک سو پچاس روپے لکھے تھے

"اس سے زیادہ میں ایک پائی نہیں دے سکتا"

انور نے چیک تہہ کر کے جیب میں ڈالا۔ محمود کو آخری نظر بھری مسکراہٹ سے دیکھا اور پروقار قدم اٹھاتے ہوئے دوکان سے باہر نکل آیا۔

بسین سکوئر میں انور کا ایک ڈاکٹر دوست دکان کرتا تھا۔ انور نے کسی فرضی لڑکی کے نام سے اسے عنیزہ کی ساری روئداد سنا ڈالی۔ ڈاکٹر نے کیس پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کہا۔

"مریض کو نصف درجن ٹیکے لگوانے پڑیں گے"

"لیکن ڈاکٹر وہ گھر سے باہر نہیں آ سکتی"

"تو پھر یہ کام آپ کو کرنا ہوگا"

انور اس فن سے اسی طرح ناواقف تھا جس طرح ڈاکٹر ریڈیو سکرپٹ لکھنے سے ڈاکٹر نے اس کے لیے ہفتہ بھر کی مشق تجویز کی۔ کام بڑا نازک تھا۔ لیکن انور تیار ہو گیا۔ اب

وہ ہر روز صبح دس بجے بکرے کی ایک ران لے کر ڈاکٹر کے ہاں پہنچ جاتا اور پرانے سرنج میں پانی بھر کر ران کے گوشت میں ٹیکے لگانے لگتا۔ شروع میں وہ یا تو ٹیکے کی سوئی گوشت میں جلد چبھو دیتا اور بار بار اس قدر آہستہ آہستہ کہ اگر بکرا زندہ ہوتا تو ضرور ٹھوکر مچانا شروع کر دیتا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ڈاکٹر نے اسے صحیح طور سے ٹیکہ لگانے کا ڈھنگ سکھا دیا۔ اب اس نے اصلی ٹیکے اور سرنج جیب میں ڈالے اور دوکان سے نصف ڈاکٹر بن کر باہر نکل آیا۔ عنیزہ کو اس نے ڈاکٹر کے تجویز کردہ ٹیکوں سے پہلے ہی باخبر کر دیا تھا۔ چنانچہ رات کا ایک خاص وقت مقرر ہو گیا۔ اور انور نے عنیزہ کو ٹیکے لگانے شروع کر دیئے پہلے روز ٹیکہ لگاتے ہوئے انور کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن اس نے عنیزہ کی ران کو بکرے کی ران سمجھتے ہوئے سوئی گوشت میں چبھو دی۔ عنیزہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

چھ عدد ٹیکے لگوانے کے بعد عنیزہ کو ایک شام زور کا بخار چڑھا اور وہ بستر پر پڑ گئی۔ کمزور تو پہلے ہی تھی۔ اب جو بخار نے الاؤ تیز کیا تو رہا سہا خون بھی خشک ہو کر رہ گیا۔ انور تقریباً ہر صبح خبر لینے جاتا۔ عنیزہ کی ماں اور باپ بڑے متفکر تھے۔ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی سے حد درجہ محبت تھی اور اسے دن بدن کمزور ہوتے دیکھ کر ان کے کلیجے غم سے پھٹے جا رہے تھے۔ انور گھنٹہ گھنٹہ بھر ڈاکٹر کے پاس بیٹھا اس سے مشورہ کرتا رہتا۔

"مسٹر انور فکر کی کوئی بات نہیں۔ مریضہ کا جسم ٹیکوں کا متحمل نہیں ہو سکا۔ اسے طاقت بخش دوائی دے رہا ہوں۔ پانی کی جگہ گلوکوز دینا مت چھوڑیئے۔"

انور اسے گلوکوز کی جگہ سونے کا پانی دینے کو تیار تھا۔ لیکن وہ اچھی تو ہو۔ اس کے برعکس اس کی صحت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی اور انور کے دل میں یہ خیال پختہ ہو رہا تھا کہ اس نے ٹیکے غلط لگائے ہیں اور وہی عنیزہ کی تمام بدنصیبی کا باعث ہے۔

ایک دن وہ عنیزہ کی خبر لینے گیا۔ تو اس نے دیکھا کہ رات ہی رات میں اس کا چہرہ سرسوں کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں سکڑ کر سیاہ حلقوں میں دھنس گئی تھیں اور گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئی تھیں۔ اس کے چہرے پر موت کا سایہ تھا اور وہ آنکھیں بند کئے

سو رہی تھی۔ اس کی غمزدہ ماں پلنگ کے پاس قالین پر بیٹھی منہ دوسری طرف کیے آنسو بہا رہی تھی۔ انور عنیزہ پر جھکا تو اس نے بستر میں سے اٹھتی ہوئی تازہ خون کی بو سونگھی اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے نیچے اترا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے ڈاکٹر دوست کو وہاں لے آیا۔ ڈاکٹر دیر تک مریضہ کا معائنہ کرتا رہا۔

"نقاہت سے غش آ گیا ہے — خون کی بے حد کمی ہے۔ کہیں سے تازہ خون حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ کیس بڑا سیریس ہے۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ انور بھی اس کے ساتھ ہی گیا۔

یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ انور کے جسم سے ایک خاص مقدار میں خون نکال کر عنیزہ کے جسم میں ڈالا گیا۔ تو اس کی رگوں میں اتنی توانائی آ گئی کہ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ سکے۔ لیکن چلنے پھرنے کی طاقت بحال نہ ہوئی تھی۔ اسحاق سیٹھ نے رنگون کے تمام بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے متفقہ مشورے سے اپنی لاڈلی بیٹی عنیزہ کو میمیو پہاڑ پر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ رنگون ایکسپریس میں درجہ اوّل کا ایک چھوٹا ڈبہ محفوظ کروا لیا گیا عنیزہ کو ٹیکسی میں بٹھلا کر سٹیشن تک لے جایا گیا۔ انور نے انگور اور پھول خرید کر عنیزہ کی جھولی میں ڈال دیئے۔ اس کی ماں اس کے ساتھ بیٹھی تھی گاڑی چلنے لگی تو اسحاق سیٹھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا کرے کہ وہ اپنی بیٹی کو خوش و خرم واپس گھر آتے دیکھ سکے — انور خاموش کھڑا تھا۔ عنیزہ اسے ویران نگاہوں سے تک رہی تھی۔

گاڑی چل پڑی۔

عنیزہ کے پھیکے چہرے پر ہلکا سا پژمردہ تبسم نمودار ہوا۔ انور نے بھی اسی قسم کے تبسم سے اس کا استقبال کیا اور دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ غمگین باپ اور افسردہ محبوب سٹیشن سے باہر نکل آئے۔

۹

دُرگا پوجا کا تہوار ہندو بنگالیوں کے محبوب تہواروں میں سے ہے۔ اس رات رنگون کی بنگالی بستیوں میں بڑی رونق تھی۔ ہر گھر میں دُرگا دیوی کی مورتی کے قدموں میں لوبان جل رہا تھا۔ اور دیئے جگمگا رہے تھے۔ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں صندل میں بھگوئے ہوئے کنول کے پھول دیوی کے چرنوں میں ارپن کر رہی تھیں اور ان کے سبک، نرمل اور دل موہ لینے والے پوجا کے گیت گلیوں میں راہ چلتے مسافروں کے قدم روک رہے تھے۔

ریڈیو سٹیشن پر بھی کافی چہل پہل تھی۔ ہر گانے والی بنگالی لڑکی کے ساتھ سہیلیوں کا چھوٹا سا جلوس بھی آیا تھا۔ ویٹنگ روم اور ٹی روم میں لڑکیوں کے جھرمٹ تھے گندمی پیشانیوں پر ابروؤں کے درمیان چندر کے سرخ ٹیکے لوٹ رہے تھے کمرے کی فضا خوشبوؤں۔ رنگ برنگ ساڑھیوں کی سرسراہٹوں اور شوخ و شنگ قہقہوں کی موسیقی سے لبریز ہو رہی تھی۔ انور کو رنگون ریڈیو کی عمارت پر درگا دیوی کے مندر کا گمان ہو رہا تھا۔ جہاں نازک بدن دیو داسیوں کے گروہ دیوناچ کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ وہ گوپیوں میں کاہن بنا پھر رہا تھا۔ کبھی ویٹنگ روم میں جا کر لڑکیوں سے باتیں کرتا کبھی ٹی روم میں ان کے معصوم قہقہوں کا ساتھ دیتا اور کبھی سٹوڈیو میں

پہنچ کر گانے والی کو وقت کی قلت کا احساس دلاتا۔ اکیلے اور تنہا بوتھ میں بیٹھنے کو اس کا ذرا جی نہ چاہتا تھا۔ بس اس رات تو ویٹنگ روم سے ٹی روم اور ٹی روم سے پھر ویٹنگ روم میں ہی گھومنا چاہتا تھا۔ مگر نوکری پھر نوکری ٹھہری — اسے مجبوراً بوتھ میں گھسنا پڑا۔ کچھ لڑکیاں کورس کی شکل میں ٹیگور کی ایک نظم گا رہی تھیں۔ ان کے بعد اوشا بھٹاچاریہ کو ایک گیت گانا تھا۔ اور پھر کملا ماتھر کا پروگرام تھا۔

لیکن کملا ابھی تک نہ آئی تھی۔ ابھی ابھی انور نے فون کیا تھا۔ پتہ چلا وہ کار میں بیٹھ کر گھر سے چل پڑی ہے۔ شاید راہ میں کسی سہیلی کے ہاں رک گئی ہو۔ کورس کے بعد اوشا بھٹاچاریہ کا گیت شروع کروا کر انور بوتھ سے باہر نکل آیا۔ ویٹنگ روم لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ گانے والی کی سہیلیاں لاؤڈ سپیکر کے گرد جمع ہو کر گانا سُن رہی تھیں۔ لیکن کملا کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ٹی روم میں کورس گا کر آئی ہوئی لڑکیاں رس گلے کھا رہی تھیں۔ اور کملا یہاں بھی نہیں تھی۔ وہ برآمدے میں آیا تو ریڈیو گھر کے دروازے پر کملا کی کار آہستہ سے آن رُکی۔ کملا خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ گہرے سرخ رنگ کی سنہری پٹی والی ساڑھی میں ملبوس تھی اور جوڑے میں سفید کلیوں کا تاج بنا ہوا تھا گورے پاؤں۔ سرخ رنگ کی ہلکی پھلکی خوبصورت چپل میں تھے اور ناخنوں پر پالش چمک رہا تھا۔ وہ ریڈیو پر گایا جانے والا گیت گنگناتی ہوئی برآمدے میں داخل ہوئی۔

"مسٹر انور! میں لیٹ تو نہیں؟"

"انور نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

صرف دو منٹ باقی ہیں۔

کملا انور کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی اور جلدی سے سٹوڈیو نمبر ۲ میں داخل ہو گئی۔ انور بوتھ کے موٹے شیشے میں سے کملا کو سازندوں کے درمیان بیٹھے اور انہیں ہاتھ کے اشاروں سے ہدایات دیتے دیکھ رہا تھا۔ اس رات کملا نے جو گیت گایا اس کی لَے اس قدر پُراثر اور گہری تھی کہ انور کانوں پر ہیڈ فون چڑھائے مسحور سا ہو گیا۔ وہ بنگالی زبان سے ناآشنا تھا مگر گیت کے بول دھیمے اور سوگوار

سروں میں ڈھل کر اسے اپنا مطلب سمجھا رہے تھے۔ آواز کی مدھم روشنی میں الفاظ کے سفید اور نیلگوں کنول ٹمٹما رہے تھے۔ افسردہ لَے کی دھیمی چمک میں انور نے بیتے دنوں کے ان دودھیا ابر پاروں کی ایک جھلک دیکھی جو ایک ایک کر کے اس کی زندگی کی کھیتی پر سے گزر گئے تھے۔ سب سے پہلے اس نے درخشاں کو دیکھا سنہری بال نازک لب۔ وہ شیو گاؤں سٹریٹ میں اپنے کمرے کی نیم روشن فضا میں قالین پر بیٹھی اُدن اور سلائیاں لیے کچھ بُن رہی تھی۔ پھر اس نے ساتیں کو بالٹی میں سے کنول کے پھول نکالتے دیکھا۔

"یہ پھول ہمارے بھگوان کو بہت پسند ہیں جناب۔"

کنول کی نازک ڈنڈیوں پر سے پانی ٹپک رہا تھا اور اس کے رخسار کنول کی زرد پتیوں ایسے تھے۔ اور وہ مندر کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ اور مہاتما بدھ اسے درشن دینے وہیں آگئے تھے۔ پھر اسے عنیزہ دکھائی دی ورنگون ایکسپریس میں بیٹھی تھی اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ اور اس کے غمگین چہرے پر مسکراہٹوں کے مرجھائے ہوئے پھول تھے۔ اب وہ جھیلوں والے باغ میں بڑے ٹیلے پر ایک پتھر کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ اور کملا اس کے بازوؤں میں تھی۔ انور کملا پر جھک گیا اور کملا جلدی سے ساڑھی سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کملا کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ دونوں ہاتھ پوجا کے انداز میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور وہ گا رہی تھی۔

کشتی بالنوں کو چل دینا چاہئے۔
اڑتے ہوئے پرندوں کی طرح
پھلگوندی کے پانی کی طرح
محبت کنول کا پھول ہے
کھلتا ہے اور مرجھا جاتا ہے
کشتی بالنوں کو گزر جانا چاہئے
جمنا ندی کے پانی کی طرح

جو کبھی نہیں رکتا.....

ختم ہو گیا۔ کملا بوتھ کے شیشے میں سے انور کو دیکھ کر مسکرائی۔ انور نے سٹوڈیو نمبر ۲ اُدن کیا اور انگریزی میں سنائی جانے والی خبروں کا اعلان کر کے سٹوڈیو نمبر ۱ اون کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ باہر نکل آیا۔ کملا ٹی روم میں صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی اور اس کی واقف کار لڑکیاں اس کے گیت کی تعریف کر رہی تھیں۔ انور کو اندر آتا دیکھ کر لڑکیوں کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔

کملا! مجھے بنگالی زبان نہیں آتی۔ لیکن آج کا سارا گیت میری سمجھ میں آگیا۔

"وہ کیسے؟ کملا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"گیت کے سُر لفظوں کے معنی بھی سمجھا رہے تھے!"

"تو آپ ہماری زبان سیکھ لیجئے ناں۔"

انور کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور چائے پینے لگا۔

"اگر تم اسی طرح گاتی رہیں تو بہت جلد سیکھ جاؤں گا۔"

کملا شرما گئی اور باقی لڑکیاں ہنسنے لگیں انور جلدی سے بولا۔

"اور وہ جو کرن صاحبہ ہیں ناں! ان کی آواز بہت ترش ہے۔ کیوں جناب آپ املی کھا کر تو نہیں آتیں؟"

کرن نے منہ چھپا لیا اور تمام لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"ہش! ہنسنے سے پہلے سوچ لیں کیا آپ کا ہنسنا ضروری ہے؟

ان کا ہنسنا واقعی ضروری تھا کیونکہ وہ جی کھول کر ہنس رہی تھیں۔ کملا انور کے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ کچھ لڑکیاں ساڑھیوں کے زرق برق پلو سنبھالتیں باہر نکل گئیں اور کچھ آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ انور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کملا سے کہا:۔

"تمہارے دُرگا پوجا کے تہوار نے رنگون میں ڈیوٹ مالا لگا رکھی ہے۔ بڑا رومانٹک تہوار ہے۔"

"لیکن میرا تو ناک میں دم آگیا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

"بس صبح سے جس سہیلی کے ہاں بھی گئی ہوں ناریل اور رس گلے زبردستی کھلائے گئے ہیں۔ آپ انکار کر رہے ہیں اور آپ کے منہ میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو ذرا میرا بھی ناک میں دم کروا دو۔"

کملا زور سے ہنس پڑی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں اس کا سامان بھی ساتھ لائی ہوں۔"

'یعنی'

"یعنی یہ کہ ذرا میرے ساتھ کار تک چلیئے۔"

دونوں ٹی روم سے نکل کر، برآمدے میں سے ہوتے ہوئے کار کے پاس آکر رک گئے۔ کملا نے کار کا دروازہ کھول کر سیٹ پر سے چینی کا زرد رنگ کا چھوٹا سا صندوقچہ اٹھا لیا۔

"یہ لیجیئے۔"

انور نے ڈھکنا اٹھا کر دیکھا کہ وہ سنہری گلاب جامنوں سے بھرا ہوا تھا وہ خوشی سے چیخ اٹھا۔

"اخاہ! گلاب جامن ہی گلاب جامن — یعنی جموں شاہ کالے راہ؟"

کملا نے ہنستے ہوئے چونک کر پوچھا

'کالرہ کیا —؟'

"وہ ہوتا ہے تم خاموش رہو اور دیکھتی جاؤ"

انور نے وہاں کھڑے آدھے سے زیادہ گلاب جامن خود اور باقی کملا کو کھلا دیئے۔ اگرچہ وہ کار کی پرلی طرف اندھیرے میں کھڑے تھے۔ لیکن چند ایک لوگوں نے ریڈیو سٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے ہوئے انہیں دیکھ لیا تھا۔ کملا

رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بولی۔

"آپ یہاں سے کب فارغ ہوں گے؟"

میں کوئی ساڑھے نو بجے — کیوں؟

"آج رات سٹی ہال میں درگا کنسرٹ ہو رہا ہے۔ میں بھی وہاں گا رہی ہوں آپ آئیں گے کیا؟"

میں کیوں نہ آؤں گا؟ تم بے شک انتظار کرنا۔ میں ٹھیک ساڑھے نو بجے پہنچ جاؤں گا۔

کملا نے موٹر کی اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انجن سٹارٹ کر دیا۔

"کہیں میں انتظار ہی نہ کرتی رہوں۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔"

کملا کار لیے فریزر سٹریٹ میں گھوم گئی اور انور ریڈیو سٹیشن میں داخل ہو گیا ٹھیک سوا نو بجے اردو میں خبریں ختم ہو جاتی تھیں اور اس کے ساتھ ہی ہندوستانی پروگرام بھی ختم ہو جاتا تھا۔ انور جب ریڈیو سٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا۔ تو اتفاق سے مسٹر ریاض ملک بھی اس کے ہمراہ تھے۔ انور کا خیال تھا۔ کہ وہ میکسم بار کے چور دروازے پر ہی رہ جائیں گے اور وہ گھوڑا گاڑی یا رکشے میں بیٹھ کر ٹھیک وقت پر سٹی ہال پہنچ جائے گا۔ لیکن اس روز مسٹر ملک بھی میکسم سے کنی کترا گئے۔ اب وہ دونوں روشنیوں اور مسرتوں سے جگمگاتی ہوئی فریزر سٹریٹ میں سے گزر رہے تھے۔ مسٹر ملک دفتر کے کام کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اور انور ہوں، ہاں، کہتے سوچ رہا تھا۔ کہ ان سے کس طرح پیچھا چھڑایا جائے

چوک میں پہنچ کر مسٹر ملک نے ایک گزرتی ہوئی خالی ٹیکسی کو روک لیا

"اچھا بھئی انور میاں خدا حافظ — مجھے ذرا میجر تیواڑی کے ہاں جانا ہے۔"

"خدا حافظ جناب"

ٹیکسی چلی گئی اور انور نے محسوس کیا۔ گویا ٹیکسی کا ڈرائیور کوئی فرشتۂ رحمت تھا۔

تہوار کی وجہ سے بازاروں میں کافی ریل پیل تھی اور خالی گھوڑا گاڑی یا رکھشے کا نشان تک نہ ملتا تھا۔ یا میر سکوئر تک پیدل چلنے کے بعد انور کو ایک خالی رکھشا مل گیا۔ پھر بھی جب وہ سٹی ہال کے باہر پہنچا تو اس کی پیشانی پر لگی گھڑی سوا دس بجا رہی تھی۔ سٹی ہال بڑا سج رہا تھا۔ اس کے گول ستونوں پر رنگین قمقموں کی چادریں چڑھی ہوئی تھیں اور دروازے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ ایک طرف سائیکلیں قطار اندر قطار لگی تھیں اور دوسری طرف بے شمار چمکیلی کاریں کھڑی تھیں انور بڑے دروازے میں سے ہال کے اندر داخل ہو گیا۔ ہال کے اندر کا حصہ باہر سے زیادہ سج رہا تھا۔ تقریباً تمام کرسیاں رُکی ہوئی تھی۔ لوگ کافی تعداد میں دیواروں کے ساتھ کھڑے تھے۔ انور بھی ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے اوپر بھی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے اور تازہ ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہال میں بالکل خاموشی تھی۔ ایک کم سن لڑکی اور لڑکا جل ترنگ اور طبلے پر کوئی گت بجا رہے تھے گت ختم ہوئی تو سامعین نے تالیاں بجا کر ان بچوں کی ہمت افزائی کی۔ اس کے بعد سٹیج سیکرٹری نے جو سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا، مائیکروفون پر کسی سنالینی درگاوتی کا اعلان کیا جو لوگوں کو ٹھمری راگ سے محفوظ کرنے والی تھیں۔ سٹیج کے مغربی کونے سے ایک تھل تھل پل پل موٹی تازی عورت مع سازندوں کے نمودار ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر سامعین کو پرنام کیا اور سٹیج کے وسط میں بیٹھ کر طنبورہ چھیڑ دیا۔ ٹھمری راگ ابھی اچھی طرح شروع بھی نہ ہوا تھا کہ سامعین نے محظوظ ہونا شروع کر دیا۔ اور انور کو یقین ہو گیا کہ لفظ محظوظ بور کا اردو ترجمہ ہے۔ جب لوگ کافی محفوظ ہو گئے اور یکے بعد دیگرے کئی سینکڑوں سگریٹ سلگ پڑے تو سنالینی درگاوتی صاحبہ طنبورہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لوگوں نے تالیاں بجا کر ان کی بھی ہمت افزائی کی سٹیج سکریٹری صاحب رومال سے پیشانی خشک کرتے

ہوئے سٹیج پر آئے اور انہوں نے اعلان کیا۔

شریمتی کملا ماتھر شری بنکم جی کا گیت گائیں گی ـــــ شریمتی کملا دیوی!

کھڑکی تلے، دیوار کے پاس کھڑے انور کا دل یوں دھڑکنے لگا۔ جیسے شریمتی کملا دیوی اسی کا نام ہو۔ اور اسے سٹیج پر گانے کے لیے بلایا گیا ہو۔ کملا، جنوبی ہند کے تاریک جنگلوں میں اگنے والی روہنی بیل کی مانند شرماتی لجاتی سٹیج پر نمودار ہوئی۔ سامعین کو نازک ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بھیگی بھیگی دل کش آواز میں شری بنکم جی کا گیت شروع کر دیا۔ کملا کی آواز اور گیت کی ہلکی میٹھی دُھن لوگوں کا دل موہ گئی۔ اور ہال میں سناٹا طاری ہو گیا۔ انور نے خدا کا شکر ادا کیا اسلئے کہ کملا ٹھمری راگ نہ جانتی تھی۔ ورنہ سامعین کو محظوظ ہوتے دیکھ کر اسے کتنا دُکھ ہوتا۔ کملا پانچ منٹ تک گاتی رہی۔ اس کے بعد وہ تالیوں کے شور میں کچھ مسکراتی۔ کچھ شرماتی اٹھی اور سٹیج کے عقب میں چلی گئی۔ انور نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کر اس پر جلدی سے ایک جملہ گھسیٹا اور قبل اس کے کہ سٹیج سیکرٹری صاحب اعلان کے بعد غائب ہو جائیں۔ وہ عورتوں، لڑکیوں، بچوں اور آدمیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا سٹیج کے قریب پہنچا اور کاغذ کا ٹکڑا ان کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے ناک اوپر چڑھا کر رقعہ پڑھا اور سٹیج کے عقب میں کملا ماتھر کو دے دیا۔ کملا بڑے کمرے میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی اور درگا ناچ پیش کرنے والی ایک لڑکی کے جُوڑے میں گجرے سجا رہی تھی۔ اس نے رقعہ کھول کر پڑھا۔ اس میں پنسل سے لکھا تھا۔

"کملا کی ماتا جی باہر انتظار کر رہی ہیں"

پہلے تو وہ بہت حیران ہوئی کہ اس کی ماتا جی کو گھر میں آئے ہوئے مہمانوں سے اتنی فرصت کیسے مل گئی۔ کہ وہ یہاں آ گئیں۔ اور اگر انہیں یہاں آنا ہوتا تو وہ کملا کے ساتھ ہی آتیں۔ پھر ایکا ایکی اسے انور کا خیال آ گیا۔ اور وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ وہ چپل پہن کر پچھلے دروازے سے نکل کر سٹی ہال کے مین گیٹ کی طرف آ گئی۔

انور ایک جگہ درخت سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔

"تو گویا یہاں کھڑی ہیں میری ماتا جی؟"

انور جلدی سے بوڑھی عورتوں کی سی آواز بنا کر بولا۔

کملا ـــــ اب میں بوڑھی ہو چلی ہوں۔ مجھے تمہاری سہائتا کی بڑی ضرورت ہے۔ مجھے گھر میں اکیلی چھوڑ کر نہ چلی جایا کرو۔

ارے ـــ آپ تو میری ماں کی نقل بھی اتارنے لگے، دیکھئے صاب! ہم اپنی ماں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہم آپ کو وارننگ دیتے ہیں۔ کہ ـــ؟

انور درخت سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

آگے بولو ـــ کہ ـــ؟

کملا تن کر کھڑی ہو گئی۔

کہ آپ ـــ؟

انور نے دونوں مُکّے تان لیے۔

ہاں ہاں کہ آپ ـــ؟

کملا ذرا پیچھے ہٹی اور پھر نہائت ملائم لہجے میں بولی

"کہ آپ کب آئے تھے؟"

وہ زور سے ہنس پڑی اور انور کے پاس آ گئی۔ انور نے سگریٹ منہ سے نکال کر درخت سے ٹیک لگالی۔

کہ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔

میرا گیت کیسا رہا؟ کملا نے اشتیاق سے پوچھا۔

کہ میں نہیں سن سکا۔

کملا نے منہ پھلا لیا۔

کیا ہو گیا ہے آپ کو؟

کہ مجھے وہی ہوا ہے جو فلم تاڑی کی بوتل میں بالا جی راؤ کھپریل کو ہوا تھا۔

جب وہ مس پانڈی چیری کے عشق میں چُوری کے کھیتوں میں بیٹھا گڑ کھا رہا تھا۔

کملا ناراض ہو کر ایک طرف چل پڑی

جائیے ہم آپ سے نہیں بولتے۔

انور نے آگے بڑھ کر اس کے گول گول شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور اسے آہستہ سے اپنی طرف گھما کر بولا۔

لیکن ہم آپ سے ضرور بولیں گے۔

کملا کے بدن میں سرسراہٹ دوڑ گئی۔ اور اسے جھیل کنارے ٹیلے پر پیش آیا حادثہ یاد آ گیا۔ وہ اندھیرے میں کھڑے تھے۔ کیونکہ ان کے سروں پر املی اور سال کے گھنے درخت چھپّر سا ڈالے ہوئے تھے۔ کملا کو انور کی چمکیلی نگاہیں اپنے اوپر جھکتی محسوس ہوئیں وہ شرما کر اس کے بازوؤں کی ہلکی گرفت سے الگ ہو گئی اسے ایک دم نائر کا خیال آ گیا جو ٹیگور کے گیتوں سے نا آشنا تھا لیکن جس کا دل ٹیگور کے گیتوں سے زیادہ گہرا اور درد مند تھا۔ اور جو بیمار بیمار جسم لیے میمیو کے پہاڑوں میں بھٹک رہا تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے سامنے انور نہیں نائر کھڑا ہے۔ اور اپنی سدا سلگنے والی خاموش، نگاہوں سے اسے تک رہا ہے۔ پھر اسے نائر کی بھاری اور غمزدہ آواز سنائی دی۔

کملا تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اپنے جذبات کے ساتھ بچوں کی طرح مت کھیلو۔

وہ کانپ گئی۔ لیکن وہ اپنے جذبات کے ساتھ نہیں کھیل رہی۔ وہ بچی نہیں ہے پھر نائر نے اسے بڑے بوڑھوں کی طرح کیوں نصیحت کی؟ اسے نائر کا یہ ناصحانہ انداز درگا پوجا کی اس سہانی رات کے دل کش سمے عجیب بے محل سا لگا اور وہ غیر ارادی طور پر انور کے اور قریب ہو گئی۔ وہ دونوں سٹی ہال کے پھواڑے خوبصورت باغ کی ایک سادہ روش پر ٹہل رہے تھے۔ دور بندر روڈ کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ باغ میں نسبتاً اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں سٹی ہال کی روشنیوں کی چمک کا عکس نیم روشن دھبوں کی صورت میں پڑ رہا تھا۔ آسمان بادلوں سے پاک تھا اور جا بجا

روپہلی ستارے چمک رہے تھے۔ انور کہہ رہا تھا۔

آج کی رات تمہارے سنگیت جیون میں تاج محل بن کر زندہ رہے گی۔
تم نے ریڈیو پر جو گیت گایا وہ راگ رس میں ڈوبا ہوا تھا۔ سٹی ہال والے
گیت کی دھن اس سے بھی دو قدم آگے تھی جیسے تلے بول، آواز
کا سوز، سروں کا آہنگ —— یہ سب کچھ کہاں سے آتا
ہے کملا؟

کملا کچھ نہ بولی وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ٹہلتی رہی۔ اس وقت وہ جس چیز پر غور کر رہی تھی۔ وہ انور اور نائر کے ذہنی رجحان کا حیرت انگیز فرق تھا۔ نائر اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ اس نے کملا کی سنگت میں زندگی کا سنہرا زمانہ گزارا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے کملا کے سامنے کبھی اس کی آواز کے سوز اور سُروں کے آہنگ کا ذکر نہ چھیڑا تھا۔ بلکہ اس موضوع پر کبھی گفتگو ہی نہ کی تھی۔ سنگیت کے معاملے میں وہ بالکل کورا تھا اور کملا کو اس بات کا ہمیشہ دُکھ رہا تھا۔ جو چیز اسے زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھی وہ اس کے سب سے قریبی ساتھی کے لیے مہمل اور بے معنی تھی۔ اس کے برعکس انور سے ملے اسے ایک سال کا عرصہ ہوا تھا۔ لیکن اس قلیل مدت میں ہی وہ اس کی آواز کے زیر و بم کو پہچان گیا تھا۔ اور اس موضوع پر کملا سے گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ کاش نائر بھی ایسا کر سکتا! کاش نائر انور ہوتا ——!

'کملا تمہیں شنکرہ راگ سے کوئی واقفیت ہے؟'

کملا نے اپنے گہرے خیالات سے چونک کر انور کو دیکھا۔

'تھوڑی بہت ہے تو —— کیوں؟'

'کچھ نہیں —— بڑا اچھا ہوا تم نے آج وہاں کوئی ایسا ویسا راگ نہیں گایا۔

کملا کو فوراً سنالینی درگا دتی کا خیال آگیا اور وہ ہنس پڑی۔

'نہیں مسٹر انور۔ وہ بہت اچھا گاتی ہیں۔ لوگ بس یونہی بیزار ہو جاتے ہیں'

اگر یہ بات تھی تو پھر تمہارے گیت پر لوگ بیزار کیوں نہیں ہوئے؟'

'اب یہ میں کیا جانوں؟'

'لیکن میں جانتا ہوں کہ شنکرہ راگ اور بنکم جی کے گیت میں کیا فرق ہے۔ دراصل کملا۔ لوگ یہاں ہلکے پھلکے گیت سننے آتے ہیں۔ اس قسم کے پکے گانے تو کچھ ریڈیو پر ہی اچھے لگتے ہیں۔ جہاں آدمی جب چاہے۔ بٹن دبا کر اسے بند کر سکتا ہے'

'آپ کو تو خواہ مخواہ پکے راگ سے بیر ہے'

'بیر نہیں کملا! البتہ اس کے بے محل استعمال پر غصہ ضرور آتا ہے'

ہاں میں تالیوں کی پرشور آواز گونجی۔ وہ ایک جگہ پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئے قریب ہی کہیں جوہی کی کلیاں کھل رہی تھیں۔ جن کی بھینی بھینی شیریں مہک ان تک پہنچ رہی تھی۔ ہوا بند ہو گئی تھی۔ اور جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ دونوں کو پُرسکون خاموشی نے گھیر لیا تھا۔ اور دونوں اس خموشی کو کسی بہت بڑے حادثہ کا پیش خیمہ سمجھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے جسم کی گرمی محسوس کر رہے تھے۔ کملا سوچ رہی تھی انور کہیں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ تھام لے۔ انور سوچ رہا تھا اگر اس نے ایسا کیا تو کملا کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ معاً انہیں یوں سنائی دیا جیسے ان میں سے کسی نے گہرا اور سرد سانس بھرا ہو۔ بیک وقت دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں اور انہوں نے اپنے اپنے خیالات پڑھ لیے۔ باغ سے اس پرسکون کنج کی دھیمی دھیمی روشنی میں ان کی جھکیلی نگاہیں آپس میں ملیں۔ اور ان کے لرزہ جسم ایک دوسرے کی طرف کھچ آئے۔ یہ آگ اور آگ کا ملاپ تھا۔ گیت اور سُر کا امتزاج تھا۔ آواز اور لَے کا آہنگ تھا —— کملا، سنگیت روپ سے ہم آغوش تھی اور انور اپنی اوّلین محبت سے بغل گیر تھا۔ جس نے شیوگاون سٹریٹ

کی دوسری منزل میں جنم لیا۔ اور وہیں گندی نالی میں گر کر دم توڑ دیا۔ اس کے ہونٹ درخشاں کی پیشانی پر تھے۔ ساتیں کی آنکھوں پر تھے۔ عنیزہ کے رخساروں پر تھے اور کملا کے ہونٹوں سے ملے ہوئے تھے۔ منزلوں پر منزلیں گزر رہی تھیں۔ اور قافلہ سرگرم سفر تھا۔ ہمالیہ کی نیلگوں برفوں سے نکلا ہوا دریا، پہاڑوں۔ وادیوں جنگلوں میں سے گزر کر میدانوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس سفر نصیب قافلے کا آخری پڑاؤ کہاں ہوگا؟ اس اچھلتی کودتی۔ کف اڑاتی بے قرار لہروں والے دریا کا سمندر کب آئے گا ——؟

اچانک سٹی ہال کی طرف سے موٹروں کے ہارن کی آواز گونجنے لگیں۔

وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ انور نے سگریٹ سلگایا۔ کملا نے جوڑے میں لگی ہوئی کلیوں کو ٹھیک کیا۔ اور دونوں اٹھ کر سٹی ہال کے صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔

۱۰

میمو میں ایک ہفتہ بیمار رہ کر عنیزہ چپ چاپ مر گئی۔

اسے شام کے مدھم ہوتے افسردہ سایوں میں دفنا دیا گیا اور دوسرے روز اس کی غمزدہ ماں خالی ہاتھ رنگون واپس آ گئی۔ اسحاق سیٹھ کے لیے پُرمحبت بیٹی کی جواں مرگ کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے دکان پر تالا ڈالا۔ گھر آ کر بستر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ اور بچوں کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگا۔ عنیزہ کی موت کا تار سب سے پہلے انور نے پڑھا۔ اسے بالکل یقین نہ آیا۔ کم از کم وہ ایسی بھیانک خبر پر اتنی جلدی اعتبار کر لینے سے قاصر تھا۔ اس نے تار پڑھ کر عنیزہ کے باپ کو سنایا۔ اور دونوں خاموشی سے قالین پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں سرد اور بے جان مایوسی کے سنگین پردے تن گئے اسحاق سیٹھ کو وہ دن یاد آ گئے۔ جب عنیزہ چھ سال کی بچی تھی۔ اور شہر سورت کے ایک کھلے آنگن والے پرانے مکان کی ڈیوڑھی میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ انور کی آنکھوں میں اس اداس شام کا منظر گھوم گیا۔ لیکن اتنی جلدی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ عنیزہ جوان، خوب صورت اور پُرامنگ تھی۔ شباب

نے اپنے ترکش سے ابھی پہلا سنہری تیر ہی پھینکا تھا۔ وہ تو زندگی کا دیباچہ ہی پڑھ پائی تھی۔ اور ابھی آرزوؤں اور کامرانیوں سے لبریز پورا ناول اسی طرح پڑا تھا۔

انور اس روز دفتر نہ جا سکا۔ دن بھر وہ سٹیشن، عجائب گھر، چڑیا گھر، سٹی گارڈنز ماؤنٹ بیچ، کرشنا کنال اور شہر کی بارونق سڑکوں اور ہوٹلوں میں گھومتا رہا۔ جب دن چھپ گیا اور گلی کوچوں کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ تو اس نے گرینڈ ہوٹل سے بس پکڑی اور میٹرو سینما کے قریب جا اترا۔ چوک میں ٹریفک کی سرخ بتی اور جگمگاتی ہوئی کاروں کی ایک قطار اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ وہ بجلی کے کھمبے کے پاس رک گیا۔ جب بتی کا رنگ سبز ہوا۔ تو وہ سڑک عبور کر کے سینما کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ فلم شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس نے ایک ٹکٹ خریدا اور ہال میں جا بیٹھا۔ انور کا خیال تھا۔ کہ لوگوں کے ہجوم مختلف چہروں، آوازوں اور فلم کے دلچسپ مناظر میں وہ اپنے افسردہ جذبات کا جی بہلا سکے گا۔ لیکن ہال میں بیٹھے بیٹھے اسے اور زیادہ وحشت نے آن گھیرا۔ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنی اپنی جگہوں پر بے جان بت بنے بیٹھے تھے۔ کسی وقت کوئی دبی دبی سرگوشی میں بات کرتا تو انور کو یوں محسوس ہوتا۔ گویا وہ اس کی تکلیف دہ حالت سے باخبر ہو۔ اور اپنے ساتھی کو اس کی حالت اور عنیزہ کی حسرت ناک موت سے مطلع کر رہا ہو۔ اچانک ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور اندھیرا چھا گیا۔ نیوز ریل شروع ہوئی سکرین پر ایک ہوائی جہاز کا دروازہ کھلا۔ اور کسی انگریز فوجی افسر کی لاش باہر نکالی جانے لگی۔ انور نے سگریٹ پاؤں تلے مسلا اور اٹھ کر ہال سے باہر آ گیا۔

وہ سینما کے باہر سڑک کنارے کھڑا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہاں جائے معاً سامنے، سڑک کی طرف فٹ پاتھ پر اسے یوں دکھائی دیا۔ جیسے

ساتیں گزر رہی ہو۔ اس نے غور سے دیکھا۔ ساتیں چھوٹے چھوٹے مخصوص قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہی بھاری بھرکم عورت سگار کا دھواں اڑاتے چل رہی تھی۔ جسے انور نے پہلے پہل سکاٹ مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ انور کے ذہن میں روشنی کا چکا چوند کر دینے والا ایک شعلہ سا چمکا۔ اور اس کے قدم خود بخود سڑک کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ چند ہی قدم چلا ہو گا۔ کہ کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور ایک دیو پیکر بس تیزی سے اس کے سامنے سے گزر گئی۔ انور جلدی سے سنبھل گیا۔ چوک میں ٹریفک کی بتی کی سرخ آنکھ چمک رہی تھی۔ وہ اسی جگہ رک گیا۔ اور بے تابی سے بتی کے سبز ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بار بار اضطراب آمیز انداز میں سر اٹھا اٹھا کر دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ لیکن موٹروں، کاروں، بسوں کے رش نے اس کی نظر سے دوسری جانب کا فٹ پاتھ چھپا دیا تھا۔ دو منٹ انور کو دو ہزار سال کے طویل عرصے سے کم معلوم نہ ہوئے۔ ٹریفک کی بتی نے سبز سگنل دیا اور انور بھاگ کر سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ گیا۔

لیکن وہاں ساتیں کا نشان تک نہ تھا۔

دیوانوں کی طرح انور سڑک کے اگلے چوک تک دوڑتا گیا۔ اس نے ہر دکان کے اندر جھانک کر دیکھا۔ مگر ساتیں کہیں ہو تو اسے دکھائی بھی دے اسے زمین کھا گئی تھی۔ یا آسمان نگل گیا تھا؟ انور کے بال بکھر گئے تھے اور چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ اور سوچنے لگا۔ قدرت اس سے کس گناہ کا بدلہ لے رہی ہے؟

رنگون فرنیچر مارٹ سے اس نے پھیکی اور مدہم آواز میں کملا ماتھر کے ہاں فون کیا۔ کملا گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ اپنے کسی رشتہ دار مہمان کے ساتھ گھومنے نکل گئی تھی۔ انور سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا وہاں سے بھی باہر نکل آیا۔ کوئی نہیں۔ کوئی نہیں ـــــ آج ہر شے اس کی ہستی سے انکار کر رہی ہے۔ اس کے سائے

سے دور بھاگ رہی ہے۔ پلیگ زدہ مریض سمجھ کر اس سے کنی کترا رہی ہے۔ عنیزہ پہاڑ کی ایک تاریک لحد میں سو رہی ہے ساتیں اسے اپنا کنول کے پھول ایسا مکھڑا دکھلا کر بازار کی بھیڑ میں گم ہو گئی اور کملا کسی مہمان کے ساتھ سیر کرنے نکل گئی ہے۔ اور وہ فٹ پاتھ پر تنہا و بے یار و مددگار کھڑا ہے ——— بالکل پہلے روز کی طرح جب وہ شنگھائی جہاز سے رنگون کی بندرگاہ پر اترا تھا۔ اور جیٹی سے باہر نکل کر سوٹ کیس ہاتھ میں لئے سڑک کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور لوگ اس سے بے خبر اپنے اپنے خیال میں چلے جا رہے تھے ——— کہاں جائے؟ وہ کہاں جائے؟ اس وقت وہ کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی ویران آنکھوں میں جھک کر دیکھے اور کہے۔

'دوست! میرے پیارے دوست!! زندگی کے دردناک لمحات بڑے مختصر ہوتے ہیں۔ یہ پانی سے لدے ہوئے بادلوں کی طرح آتے ہیں اور برس کر گزر جاتے ہیں'

اسے خود بخود ناٹر کا خیال آ گیا۔ وہ بھیگی بھیگی آنکھوں والا غم نصیب لڑکا ——— وہ کہاں ہو گا؟ الور کا سگریٹ والا ہاتھ اپنے آپ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھا اور اس نے کش لگانے کی بجائے سگریٹ کے کڑوے ہونٹ چوم لیے۔ اس تلخی نے اسے آسودگی اور تسکین بخشی جیسے وہ ان مہربان ساتھیوں کے ہونٹ ہوں۔ جو ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ الور کے جسم میں گویا پھر سے طاقت عود کر آئی۔ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں درست کیا اور آگے چل پڑا۔ کئی گھنٹے وہ رنگون کی کشادہ اور منور سڑکوں پر پیدل ہی گھومتا رہا۔ جس وقت وہ گھر پہنچا رات کا ایک بج رہا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں تھکن سے چور ہو رہی تھیں۔ پتلون اور بوٹ اتارے بغیر اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اور گہری نیند میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بوڑھا من کچن سے باہر نکلا۔ اس نے الور کے بوٹ اتار کر دیوار کے ساتھ لگائے۔ اس پر سفید چادر ڈالی، بتی بجھائی اور کچن میں جا کر سو رہا۔

اگلے روز ڈیڑھ بجے کے قریب الور دفتر پہنچا۔ تو میمیو سے آیا ہوا ایک خط اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میمیو میں اسے خط لکھنے والا کون ہو سکتا تھا؟ کہیں عنیزہ نے نہ بھیجا ہو؟ الور کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ کھولا۔

پیارے دوست!

اتنے لمبے عرصے بعد میرا خط دیکھ کر تم ضرور حیران ہو گے۔ لیکن میں تمہیں بھولا نہیں۔ ریڈیو پر تقریباً ہر روز تمہاری آواز سن لیتا تھا۔ برا ہو میری اس خط نہ لکھنے کی عادت کا جس نے مجھے تم سے اتنی دور رکھا۔ میں ایک سال سے یہاں صحت ٹھیک کر رہا ہوں۔ جو بہت کم ٹھیک ہوئی ہے نہ جانے ابھی کتنا عرصہ اور اس جگہ رہنا پڑے بہرحال میں دو ایک روز کے لئے رنگون آ رہا ہوں جس روز تمہیں میرا خط ملے گا۔ اسی رات میں رنگون پہنچ جاؤں گا۔

الور دعا کرو میری صحت ٹھیک ہو جائے۔ میں بہت جلد پنجاب جانا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسٹیشن پر آؤ گے؟

تمہارا

"ناٹر پنڈھارکر"

خط پڑھ کر الور کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اس کے دل کے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل انڈیل دیا ہو وہ روشن دل اور پرجوش جذبات کے ساتھ دفتر کے چھوٹے موٹے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ہو گیا۔ شام کو اس نے دو تین بار سٹیشن پر فون کیا۔ اور ہر بار گاڑی کی صحیح آمد کا وقت پوچھا۔ خبروں کا دھندا مسٹر ملک کے حوالے کر کے وہ بس میں سوار ہو کر سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچا۔ گاڑی آنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ وہ سگریٹ سلگائے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ ٹھیک وقت پر رنگون میل

شور مچاتی سٹیشن میں داخل ہو ئی۔ لوگ اپنے اپنے اسباب کے قریب آگئے۔ قلی ڈبوں کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔

نائر دوسرے درجے کے ڈبے میں کھڑکی کے ساتھ بیٹھا باہر جھانک رہا تھا۔ اس نے ایک جگہ انور کو دیکھا۔ وہ مسافروں کی دھکم پیل سے پرے ہٹ کر کھڑا تھا۔ اشتیاق بھری نگاہوں سے ہر ڈبے کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ نائر کا ڈبہ آگے گزر گیا۔ انور اسے نہ دیکھ سکا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رک گئی۔ اب انور نے ہر ڈبے میں جھانکنا شروع کر دیا۔ وہ بمشکل تین چار ڈبے ہی دیکھ پایا تھا۔ کہ کسی نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ انور نے پلٹ کر دیکھا۔

اس کے سامنے نائر کھڑا تھا۔

لیکن میرے خدا ——— وہ اس نائر سے کس قدر مختلف تھا۔ جو مجاہد اخبار میں اس کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ اور پھر سٹیشن سے باہر نکل آئے۔ اب انور نے اسے غور سے دیکھا۔ نائر میں سب سے اہم تبدیلی یہ آئی تھی۔ کہ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ دبلا پڑ گیا تھا۔ خدوخال میں ایک پرخلوص کرختگی پیدا ہو گئی تھی۔ اور سدا خموش رہنے والی آنکھیں اپنے بے معلوم سیاہ حلقوں کے درمیان زیادہ مرجھا گئی تھیں۔ وہ خاکستری رنگ کے شریفانہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ اور بڑے مسرور لہجے میں انور سے ہم کلام تھا۔

تم نے بڑا اچھا کیا۔ اخبار کی نوکری چھوڑ دی۔ یہ تمہاری لائن نہ تھی۔ ریڈیو کا کام تو کافی دلچسپ ہو گا؟

کسی روز دفتر آکر دیکھ لینا ——— دل چسپ اگر ہو گا۔ تو محض سننے والوں کے لیے۔ ہمارے لئے تو ایک عادت بن کر رہ گیا ہے۔

نائر نے چلتے ہوئے یونہی سامنے خلا میں دیکھ کر کہا۔

شاید اتنی فرصت نہ مل سکے۔ میں صرف تین دن کے لیے یہاں آیا ہوں بڑی بہن کی منگنی پر میری موجودگی ضروری تھی۔

لیکن تم دو ایک روز اور ٹھہر سکتے ہو۔

مشکل ہے۔ سینی ٹوریم میں کسی مریض کا بستر اتنی دیر خالی نہیں رہنا چاہیئے۔

نائر کے ہونٹوں پر پھیکا سا تبسم نمودار ہوا۔

یہ سینی ٹوریم کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ کبھی موقعہ ملا۔ تو تمہیں وہاں کی دل چسپیوں کی داستانیں سناؤں گا۔

لیکن نائر تمہیں سینی ٹوریم چھوڑ دینا چاہیئے۔ میرے خیال میں تمہاری صحت اتنی خراب نہیں۔ کہ رنگون میں تم اسے دوبارہ بحال نہ کر سکو۔

نائر یدستور ہنستے ہوئے بولا۔

تم اس طرح میرا جی نہیں بہلا سکتے انور بھائی ——— میں جانتا ہوں۔ میری صحت کس مقام پر ہے۔ اور ابھی مجھے سینی ٹوریم کی کتنی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کے ہنگامے اور شور و غل مجھے اور زیادہ پریشان کرتے ہیں۔

انور خاموش ہو گیا۔ اسے نائر سے محبت تھی۔ اور وہ اس بات سے از حد غمگین تھا۔ کہ ایک خوفناک بیماری اندر ہی اندر اس کے دوست کی قوت حیات کو روز بروز کم کرتی جا رہی ہے۔ وہ نائر کو اس بھیانک بیماری سے نجات دلانے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا۔ کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا اور مجبور و بے بس ہے۔

تھوڑی دور چل کر دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کافی پی۔ سگریٹ سلگائے۔ اور دیر تک اپنی پُر محبت گفتگو سے ایک سال کی لمبی جدائی کا خلا پُر کرتے رہے۔ اس کے بعد وہ باہر نکل آئے اور دوسرے دن رات کو ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

دوسرے دن کا آسمان صاف۔ گہرا، کشادہ اور نیلگوں تھا اور شام ہی سے

ٹھنڈی ہوا کے نرم جھونکے چل نکلے تھے۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے نائر ریذیڈنسی پہنچ گیا۔ انور اس کا منتظر تھا۔ گرینڈ ہوٹل میں بیٹھ کر انہوں نے سنہری اور خوشبودار چائے پی۔ پھر وہ اٹھے اور جھیلوں والے باغ کی جانب چل دیئے باغ میں مدھم اندھیرا تھا اور املی، سال، آم اور بانس کے جھنڈوں تلے تاریک سائے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ناریل اور تاڑ کی دھندلی چھتریوں کے اوپر کھلے اور گہرے نیلے آسمان پر سیمیں ستارے چمک رہے تھے۔ باغ کی پتھریلی اونچی نیچی روشیں راہ گیروں سے خالی تھیں۔ اور ستاروں کی پراسرار دھیمی چمک میں زیادہ تنہا اور ویران دکھائی دے رہی تھی۔ فضا مختلف قسم کے پھولوں کی خوشبوؤں سے لبریز تھی۔ رات قدرے خنک تھی۔ نائر دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں دیئے ذرا آگے کو جھک کر چل رہا تھا۔ انور اس کے ساتھ قدم بقدم رواں تھا۔ رات کی رازبھری خاموشیوں میں باغ کی ہر شے انہیں حیرت سے تک رہی تھی۔ جیسے وہ ان کی پیار بھری بے زبان گفتگو میں مخل ہوئے ہوں۔ دونوں دوست خاموش تھے۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی خاموشی کو بڑے غور سے سن رہے تھے اور اس سے لطف اٹھا رہے تھے۔ اچانک نائر پتلی سی آواز میں بولا۔

"تمہارے ہاں بنگالی سنگیت کا پروگرام بہترین ہوتا ہے؛"

انور خاموش رہا۔

تم نے اچھی اچھی آوازیں جمع کر لی ہیں۔ خاص طور سے کملا ماتھر کی آواز مجھے بہت پسند ہے۔

انور کے جسم میں میٹھی میٹھی لہریں سی دوڑ گئیں۔ اور چہرے پر ہلکی سی چمک آگئی۔

ہاں وہ ہماری بہترین آرٹسٹ ہے اور ویسے لڑکی بھی اچھی ہے۔

نائر نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کافی اچھی ہے؛"

"تم اسے جانتے ہو؟"

نائر کی آنکھیں قدرے سکڑ گئیں۔ وہ جھاڑیوں میں چمکتے ہوئے جگنوؤں کو دیکھ کر بولا۔

ہاں — ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ ان دنوں وہ بڑی شریر ہوا کرتی تھی۔ اور میں بھی — میں اسے بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر بھی آس پاس ہی تھے۔ پھر یہ دونوں خاندان ایک ساتھ رنگون اٹھ آئے کملا بڑی ذہین لڑکی تھی۔ کچھ کچھ غم خور بھی ہے۔

نائر بڑے مزے لے لے کر بول رہا تھا۔ اور انور حیرانگی کے عالم میں اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے دل کے ایک تاریک کونے میں حسد کا ننھا سا جذبہ نومولود بچے کی طرح ہوا میں ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔ کیا نائر کملا سے محبت کرتا ہے؟ بھلا کملا سے کون محبت نہیں کرے گا؟ اور پھر نائر تو اس کا بچپن کا ساتھی ہے — انور کے دل میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات چکر لگانے لگے۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ عجیب احمقانہ طریقے سے سوال کر بیٹھا۔

پھر تم یقیناً کملا کو چاہتے ہو گے۔

نائر ہنسنے لگا۔ انور کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ ٹھیک ہے وہ کملا سے محبت کرتا ہے۔ بھرپور محبت پھر اس معنی خیز ہنسی کا کیا مطلب؟ اب وہ ایک جھیل کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ نائر آہستہ سے کھانسا اور منہ پر رومال پھیرتے ہوئے بولا۔

تم نے ایک عجیب سوال کیا ہے۔ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کملا ایسی لڑکی کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا۔ اس کے رہن سہن کا معیار اسے ایسی تمام باتوں سے اوپر اٹھائے ہوئے ہے ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے والی لڑکیوں کے لئے محبت کرنے سے صبح اٹھ کر ٹوتھ برش کرنا زیادہ

ضروری ہوتا ہے۔"

انور کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ نائر کے منہ سے کچھ اور نکلوانے کے لئے بیتاب تھا۔ چنانچہ وہ بالکل ایک ضدی بچہ بن گیا۔

تم نے کملا کا غلط تجزیہ کیا ہے۔ وہ غالباً ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

نائر تھوڑی دیر رک کر بولا۔

"ہر لڑکی ایک مخصوص طبقے کو پیش کرتی ہے اور ہر طبقے کی لڑکیاں ایک دوسری کی نقل اتارتی ہیں۔ کملا کا تجزیہ کرتے وقت میں نے کسی نفسیاتی کتاب سے مدد نہیں لی۔ بلکہ اس کی روزمرہ زندگی میں جھانک کر دیکھا ہے۔ وہ بڑی اچھی لڑکی ہے شریف ہے خوش خلق ہے۔ لیکن محبت کے معاملے میں وہی ہے جو اس طبقے کی کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ ہر پہلے آدمی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی سے عشق کر سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اسکاٹ مارکیٹ میں گھومتے ہوئے اسے ایک دکان پر سینڈل پسند نہ آئے اور وہ دوسری دکان میں گھس جائے ان کے یہاں باٹا کے سینڈل اور عشق میں کوئی فرق نہیں۔ اور یہ ان کے ماحول کا قدرتی تقاضا ہے:

انور کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ اصل مقصد کی طرف نائر کو کس طرح لائے اس نے پھر ایک اوچھا وار کیا۔

"کملا نے بھی ایک آدھ بار تمہارا ذکر کیا تھا۔ لیکن یہ دیر کی بات ہے۔ ٹھیک یاد نہیں ـــــ مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ذکر اچھے الفاظ میں تھا۔

نائر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جیب سے کاغذ اور تمباکو نکال کر سگریٹ بنانے لگا۔ ڈبے کا منہ کھلتے ہی فضا میں تمباکو کی مرطوب اور خوش گوار مہک سی پھیل گئی۔ اور انور کو جھینک آتے آتے رہ گئی۔ نائر نے دو سگریٹ بنائے ایک انور کو دیا اور دوسرا خود سلگا لیا۔ سگریٹ کا پہلا کش لگاتے ہی نائر کھانسنے لگا۔ اور اس نے سفید رومال نکال کر آگے رکھ لیا۔

"ڈاکٹر نے یہ تمباکو پینے سے منع کیا ہے۔ پر کیا کروں۔ اس میں خاص لطف ہے۔

پھر وہ اپنے آپ ہی انور کے اصل موضوع کی طرف آگیا۔

ایک زمانہ تھا۔ کہ ہمارا آپس میں بڑا پیار تھا ہم پل بھر کی جدائی گوارا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ گزر گیا۔ پھر وہ دور شروع ہوا۔ جب میرے دل میں ان آرزوؤں نے جنم لیا۔ جن کی تکمیل میری تکمیل تھی۔ اور جو کملا سے محبت کرنے کی آرزو سے زیادہ پرجوش اور عظیم تھیں۔ کملا اس فرق کو محسوس نہ کر سکی۔ اور مجھ سے چڑ گئی۔ کوئی بھی عورت اس سرحد سے آگے نہیں جاتی۔ جہاں پہنچ کر مرد عورت کی محبت کا لبادہ اتار کر نیا لباس پہنتا ہے۔ اور نئے ساز و سامان کے ساتھ زندگی کی ابتدا کرتا ہے۔ ہر عورت وہاں پہنچ کر مرد کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور بچوں سے جی لگا لیتی ہے۔ کملا کو بھی میرا ساتھ چھوڑنا پڑا۔ لیکن ابھی اس کے بچے نہیں ہیں چنانچہ ابھی اسے کئی بار اس سرحد پر اپنے ساتھیوں کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ تا آنکہ اس کے ہاں بچے نہیں ہوتے۔ یعنی وہ ماں نہیں بنتی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کو سوائے محبت کرنے کے اور کوئی کام نہیں، کم از کم ہمارے ملک میں تو وہ ابھی تک یہی ایک کام کر رہی ہے۔ اور یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ کہ یہاں کے مردوں کو بھی اور کوئی کام نہیں آتا۔"

نائر چپ ہو گیا۔ اور سگریٹ کے ہلکے کش لگانے لگا۔ انور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ نائر کملا سے محبت کرتا ہے۔ اب صرف ایک پھانس باقی تھی۔ کیا کملا بھی نائر کو چاہتی ہے؟ اور اس سوال کا جواب حاصل کرنا فی الحال مشکل تھا۔ نائر مزید اس موضوع پر گفتگو کرنے کو تیار نہ تھا۔ اور انور کے سامنے گفتگو کرنے کے لئے اس سے زیادہ اہم موضوع اور کوئی نہ تھا چنانچہ وہاں

تھوڑی دیر کے لئے گہری خموشی چھاگئی۔

اب ستارے تاریک رات کے اس مقام پر سے گزر رہے تھے۔ جب مشرقی درختوں کے عقب سے زرد زرد چاند کو طلوع ہونا تھا۔ گول گول۔ نیم زرد، نیم سرخ، خاموش اور پراسرار چاند دبے پاؤں اوپر آگیا۔ اور املی کے گنجان درختوں سے نیچے جھیل میں جھانکنے لگا۔ جھیل کی پرسکون سطح پر سوئے ہوئے کنول اس کی ملائم اور پھیکی کرنوں میں ڈوب گئے۔ نائر اور انور کے قدموں پر رتنا کلی کی بیل کے سائے کانپنے لگے۔ نائر نے گہرا سانس بھرا اور اس سے بھی زیادہ گہری آواز میں بولا۔

"میرے لیے یہ سب دوراز کار باتیں ہیں۔ محبت ترقی پسند جذبہ ہے یا رجعت پسند؟ میں نہیں جانتا۔ میں صرف اس قدر جانتا ہوں۔ کہ اس کا انجام دونوں حالتوں میں ایک کلبلاتا ہوا مریل سا قانونی یا غیر قانونی بچہ ہے اور بس ـــــ اس سے آگے محبت جو کچھ دیتی یا لیتی ہے۔ میرے نزدیک وہ مہمل اور ہوائی معاملات ہیں۔ اور ان کا زمین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

ٹھیک ہے بچہ ہونا قانونی یا غیر قانونی بات ہو سکتی ہے لیکن تم اسے غیر قدرتی نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر یہ قدرتی بات ہے۔ تو پھر اس کے متعلق فلسفیانہ استدلال کیوں؟

تم نے میرے ہی دعوے کی تائید کی۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے بس پھر اسے سیدھے سادے قدرتی طریقے سے کیوں نہیں نپٹایا جاتا؟ محبت کو گھنے درختوں کی چھاؤں کی مانند ہونا چاہیئے۔ جو آنے والے مسافروں سے بغل گیر ہو کر انہیں اپنی آغوش میں آسودگی بخشتی ہے۔ اور جانے والوں کی پیشانی چوم کر انہیں ہنسی خوشی رخصت کرتی ہے۔ جس کی گود میں ہم صرف اس لئے جاتے ہیں کہ تازہ دم ہو کر پھر سفر پر روانہ ہو سکیں۔ لیکن ہمارے ہاں ہر بات

الٹی ہے۔ یہاں محبت جھاڑ جھنکار میں چھپا ہوا اندھیرا کنواں ہے جس میں گر کر آدمی کے سامنے صرف دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں یا تو وہ مر جائے۔ اور یا پھر مینڈک بن کر عمر بھر وہیں ٹراتا رہے۔"

قریب ہی جھیل میں شڑاپ کی آواز پیدا ہوئی۔ انور نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ چاند کی روشنی زرد دھند بن کر جھیل پر چھائی ہوئی تھی اسے اس دھند میں سوائے کنول کے سوئے ہوئے پھولوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ نائر کا سگریٹ بجھ گیا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی۔ ننھا سا شعلہ بھڑکا جس کی چمک میں اس کے چہرے کے کمزور خدوخال روشن ہو کر پھر بجھ گئے۔ اس قدر حسین رات میں انور کو یہ خیال از حد بھیانک محسوس ہوا، کہ اس کا دوست ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا۔ جو ایک نہ ایک دن اسے حسین چاند خوبصورت جھیل اور پراسرار زرد دھند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم کرنے والی تھی۔ وہ اپنے اس خیال سے ڈر گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

"تم باہر کب جا رہے ہو؟"

نائر نے جھیل کنارے اگی ہوئی لانبی گھاس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت کا بے صبری سے انتظار کر رہا ہوں۔ جب ڈاکٹر مجھے جہاز کے سفر کی اجازت دے دے گا۔ اور میں رنگون سے کلکتہ جانے والے جہاز میں سوار ہو جاؤں گا۔ پھر میں وہاں سے پنجاب جاؤں گا۔ اور جرنلزم کا عملی تجربہ کر کے ایران پہنچ کر تہران یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کر سکوں گا۔ وہاں سے مصر، شام اور عراق سے ہوتا ہوا یوروپ کی طرف نکل جاؤں گا ـــــ میرے خدا! کیا میں یہ امیدیں پوری ہوتے دیکھ سکوں گا؟"

اگر تم سخت جان ہو تو تم ضرور یہ سفر کرو گے۔

نائر قدرے رک کر آہستہ سے بولا۔

میں سخت جان بھی ہوں۔ اور مجھ میں تکلیفیں سہہ جانے کا مادہ بھی ہے۔ لیکن پھر بھی ——— کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے۔ جیسے میرے یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوں گے۔ جیسے میں بہت جلد سردزمین میں دفن ہوجاؤں گا۔ اور یا کسی جگہ جلا دیا جاؤں گا۔ اور میری ہڈیاں ابرادتی میں بہادی جائیں گی۔ پھر میرے لئے سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ نہ میری ماں ہوگی، نہ باپ اور نہ محبت کرنے والی بہن کیسر اور ——— نہ ہی کملا اور نہ ہی النور ہوگا۔ شعلہ بجھ جائے گا۔ اور دھواں فضا میں تحلیل ہوجائے گا۔ تم اپنے دیس چلے جاؤ گے۔ میرے ماں باپ تھوڑا بہت سوگ منا کر مجھے بھول جائیں گے۔ کملا کا بیاہ ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے بچوں کی نگہداشت میں لگ جائے گی۔ اور کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ اور پہلے ڈراپ سین کے بعد دوسرا منظر نئی دل چسپیوں کے ساتھ طلوع ہوگا۔ تب خیال آتا ہے کہ یہ ساری جدوجہد کس کام کی؟ کیوں نہ اپنے تئیں کسی اندھیرے کنوئیں میں گرادوں۔ اور چھوٹے سے آسمان تلے ساری زندگی گزار دوں ——— پھر ایکا ایکی اندھیرے میں امید کی کرن چمکتی دکھائی دیتی ہے اور کوئی خفیہ طاقت اندر ہی اندر میرے مضمحل خیالات کو توانائی بخشتی ہے۔ اور مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ موت ان آدمیوں کو فنا نہیں کرسکتی۔ جو اپنے سے بڑھ چڑھ کر کسی شے کی تخلیق کرتے ہیں۔ جو زندگی کے ایک اعلیٰ اور رفیع مقصد کے لئے اپنی زندگی قربان کردیتے ہیں۔ اور جو موت کے پہلو بہ پہلو اپنا سفر جاری رکھتے ہیں ———،

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو"

نائر نے گہرا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"شاید ———،

وہاں پھر خاموشی چھا گئی۔ جھیل کے پرلے کنارے والی اندھیری جھاڑیوں

میں جگنو چمک رہے تھے۔ چاند اب کافی اوپر آچکا تھا۔ اور اس کی روشنی میں نیلاہٹ کی جھلک آگئی تھی۔ جھیل میں اس کا عکس پڑنے سے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بھی مدھم روشنی ہورہی تھی۔

میں جانتا ہوں دنیا کا تین چوتھائی حصہ دوسری جنگ عظیم کا ایندھن بن چکا ہے۔ اور مشرقِ بعید میں بھی یہ شعلہ بھڑکنے ہی والا ہے۔ پھر بھی میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے کوچ کا سامان کرلوں گا۔

النور نے کہا۔

جاپان ابھی اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔

نائر نے اسے تعجب سے دیکھا۔

یہ تم کہہ رہے ہو؟ ——— جاپان اسی سال اعلانِ جنگ کردے گا۔ اگرچہ برما میں اتحادی فوجوں کے امریکی اور ہندوستانی ڈویژن پہنچ چکے ہیں۔ اور انہوں نے پہلے ہی سے مورچے سنبھال لئے ہیں۔ لیکن میں جاپانیوں کو فاتح کی حیثیت سے رنگون کے بازاروں میں گھومتے دیکھ رہا ہوں؛

جاپانی ہو یا امریکی ——— بہرحال برما کو نقصان ہی ہوگا۔

فائدہ ابھی بڑی دور کی بات ہے۔ مگر ہوگا ضرور ——— اس دریا کا چشمہ اراکان اور پیگو یوما کی پہاڑیوں میں پھوٹے گا۔

النور نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھے اور باغ کے بڑے دروازے کی طرف چل پڑے۔ روپہلی چاندنی میں گھاس کے خطے۔ پھولوں کے تختے، بجلی کے کھمبے، درخت، ٹیلے اور ان کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی پتلی دُبلی پیچ دار سڑکیں چمک رہی تھیں۔

بستر پر لیٹتے ہی النور کو جو خیال آیا وہ کملا ماتھر کا تھا۔ اسے نائر سے محبت تھی اور وہ اس کے خلاف حسد کا جذبہ پیدا ہوجانے پر دل ہی دل میں شرمندہ ہورہا تھا۔ النور کو معلوم تھا۔ کہ نائر ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہے اور وہ کملا کو چاہتا ہے

انور کو پریشان کرنے کے لئے کافی اہم تھا۔ اس نے بایاں پہلو بدلا۔ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں میں سلگ رہی تھی۔ اسے عنیزہ کا خیال آگیا۔ تصور ہی تصور میں وہ اس کی قبر پر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ کہی اور سنگِ مزار کو بوسہ دے کر واپس اپنے بستر پر آگیا۔ وہ پھر نائرا و رکملا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے وہ حسین رات یاد آگئی۔ جب سٹی ہال کے عقب میں اس نے کملا کے شبنمی ہونٹوں کی موسیقی کو چھوا تھا۔ یقیناً کملا اسے چاہتی ہے نائرا اس کا بچپن کا ساتھی ضرور ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ کملا کے دل کا بھی مالک ہو۔ لیکن یہ نیا رشتے دار مہمان کون ہے۔ جس کے ہمراہ کملا کل گھومنے گئی تھی ـــــ ؟ شاید رشتے میں کوئی بھائی ہو! انور کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے۔ اور وہ ایک ایک کر کے انہیں دبانے لگا۔ اور آخر کار وہ اس اکتا دینے والے کام سے اس قدر تھک گیا۔ کہ اسے نیند آگئی۔

۱۱

اپنی بہن کی منگنی کے بعد نائر واپس میسور چلا گیا۔ انورا سے رخصت کرنے سٹیشن تک گیا۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو الوداع کہتے ہوئے اداس ہو رہے تھے۔ نائر کا چہرہ پہلے سے زیادہ کمزور ہونا دکھائی دے رہا تھا۔ اور آنکھوں میں سمٹی ہوئی خاموشی گہری ہو گئی تھی۔ انجن نے وِسل دیا۔ تو اس نے انور کا ہاتھ اپنی ٹھنڈی ہتھیلی میں تھام لیا۔ گرم ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے نائر سوگوار لہجے میں بولا:۔

شاید اس کے بعد ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ خوشی اور دکھ کی گھڑیوں میں مجھے بھی یاد کر لینا۔ یہ بات مجھے تسکین دے گی۔

انور جلدی سے بولا:۔

کیسی باتیں کرتے ہو نائر، ہمیں دیر تک زندہ رہنا ہے۔

نائر ناخن سے کھڑکی کا روغن کریدنے لگا۔ پھر وہ آہستہ سے کھانسا اور ہونٹوں پر رومال پھیرتے ہوئے بولا:۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں انور ـــــ لیکن ـــــ لیکن نہ جانے مجھے ایسا

کیوں محسوس ہو رہا ہے۔ گویا میں تمہیں اور اس سٹیشن کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔

انور سوائے نائر کا ہاتھ پیار سے دبانے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ انجن نے آخری وسل کے بعد سفید بھاپ کے پُرشور بادل چھوڑے اور گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔ دونوں دوستوں نے افسردگی سے مسکراتے ہوتے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہاتھ الوداع کہنے کے لئے اوپر اٹھے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا یہاں تک کہ ریل پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ اور انور سٹیشن سے باہر آ گیا

اسی رات کملا ماتھر کا ریڈیو پر پروگرام تھا۔ لیکن وہ نہ آئی۔ انور نے ٹیلیفون پر دریافت کیا تو پتہ چلا اس کی طبیعت ناساز ہے۔ دوسرے روز انور تین بجے کے قریب کملا کے ہاں جا پہنچا۔ آسمان ابر آلود تھا اور ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ وہ کوٹھی کے باہر ہی رُک گیا۔ اس سے پیشتر وہ کبھی وہاں نہ آیا تھا۔ اور یوں بے تکلفی سے اندر جاتے ہوتے کچھ جھجک محسوس کر رہا تھا۔ لکڑی کے پھاٹک کا ایک پٹ بند تھا اور قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی کالی تختی لٹک رہی تھی جس پر سفید حروف میں "سانیال چندر ماتھر — بار ایٹ لاء" لکھا ہوا تھا۔ کوٹھی اک منزلہ تھی اور اس کی تعمیر میں لکڑی زیادہ استعمال کی گئی تھی۔ ڈھلوانی چھتوں پر چینی مندروں کے میناروں کا گمان ہو رہا تھا۔ برآمدے میں گدے دار کرسیاں خالی پڑی تھیں اور کہیں سے لڑکیوں کے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے کی آوازیں آ رہی تھیں انور کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔ احاطے کی دیوار پر اندر کی طرف سبز بیل چڑھی ہوئی تھی اور گھاس کے لمبے چوڑے تختے میں ترشی ہوئی گھاس کا رنگ ہلکا سبز ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے پرلی طرف سے اچانک دو بچیاں بھاگتی ہوئی نکلیں اور ان کے ساتھ ہی شیلا بھی سامنے آ گئی۔ انور کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی اور پھر بڑے پرجوش لہجے میں بولی:-

انور بابو آپ ہیں؟ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ ٹھہریئے میں دیدی کو خبر کرتی ہوں

وہ بھاگ کر کوٹھی کے اندر داخل ہو گئی تھوڑی دیر بعد وہ پھر نمودار ہوئی

دیدی آپ کو اندر بلاتی ہیں

جس کمرے میں کملا اپنے والد اور نئے رشتہ دار کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ کوٹھیوں کے عام ڈرائنگ کمروں کی طرح سجا ہوا تھا۔ کملا نے انور کا تعارف کرایا۔

"میرے پتاجی اور آپ ہیں جے چندر ماتھر — میرے کزن، یہاں رنگون میں آپ تمام فوجی کنٹینوں کے ٹھیکیدار ہیں اور مانڈلے، مولمین اور میکٹیلا میں ملٹری بیریکس بنوا رہے ہیں

مسٹر جے چندر کا چہرہ گول مول، جسم بوجھل اور سر چھوٹا تھا۔ پھیکے زرد رنگ کے سلکی کرتے اور سفید ریشمی دھوتی میں ملبوس وہ کرسی میں پھنس کر بیٹھے ہوتے تھے اور بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر تھری نائن کا ڈبہ کھلا تھا اور وہ سگریٹ پی بھی رہے تھے اور اس کے ساتھ کھیل بھی رہے تھے تعارف کے بعد انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے انور کو سگریٹ پیش کئے۔ جنہیں انور نے نہایت خندہ پیشانی سے واپس کر دیا۔ اور جیب سے کیپسٹن کا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ مسٹر جے چندر نے ڈبہ واپس میز پر رکھ دیا اور انگلیوں میں سگریٹ گھمانے لگے۔ کملا کا باپ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے سگار پیتے ہوتے کسی موٹی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس کے سر کے بال تقریباً سفید تھے اور آنکھوں پر سنہری فریم والی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ پتلے چہرے پر جھریوں کے بے معلوم نشان ابھر رہے تھے اور کتاب کا ورق الٹتے وقت ان کی کمزور انگلیاں کانپنے لگتیں تھیں۔ سفید ساڑھی میں ملبوس کملا ماتھر کا خوبصورت چہرہ کچھ کملایا ہوا تھا اور اس میں سادگی اور معصومیت کی جھلک تھی۔ اس کا شاندار سر ننگا تھا اور لمبے بال دو لٹوں میں گندھے ہوتے تھے۔ انور نے سگریٹ سلگا کر اس کا مزاج پوچھا۔ کملا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"سر میں ہلکا ہلکا درد تھا، اب بالکل ٹھیک ہوں۔

اور وہ نگاہیں جھکا کر نیلے میز پوش پر پھولوں کی سپید پتیاں کاڑھنے میں مشغول ہو گئی

آپ کو میرے نہ پہنچنے سے تو کافی پریشانی ہوئی ہو گی؟

جی نہیں۔ ہم نے جو تھیکا راتے کے دو ریکارڈ سنوا دیئے تھے

مسٹر جے چندر سگریٹ کا گیلا سرا منہ سے نکالتے ہوئے بولے:۔

جو تھیکا راتے کے ریکارڈ کلکتہ ریڈیو بھی بہت بجاتا ہے۔ خوب گاتی ہے کملا شاید تمہیں یاد نہ ہو موسی کے ہاں اس کا آنا جانا تھا۔ اور ایک مرتبہ تو ہمارے ساتھ پک نک پر بھی گئی تھی۔

کملا نے دانتوں سے سپید دھاگہ کاٹتے ہوئے کہا۔

اچھی طرح یاد نہیں

مسٹر جے چندر انگلیوں کی اضطراری حرکت سے کرسی کے بازو پر طبلہ سا بجاتے ہوئے انور کی طرف متوجہ ہوئے۔

سنایئے صاحب! جنگ ابھی کتنی دیر رہے گی؟ جاپان کب لڑ رہا ہے!

انور کو ایک پڑھے لکھے شخص کی زبانی یہ سوال نہایت احمقانہ معلوم ہوا پھر بھی وہاں کچھ نہ کچھ جواب دیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

جنگ کی صحیح مدت سے تو شاید ہٹلر۔ چرچل اور سٹالین بھی واقف نہیں۔ البتہ جاپان کے متعلق قیاس ہے کہ وہ بہت جلد لڑائی میں کود پڑے گا۔

کیا وہ انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گا مسٹر انور؟

مسٹر انور اس سوال پر بھونچکا رہ گیا۔

جی ہاں ظاہر ہے۔ وگرنہ وہ انڈو چائنا میں ہوائی اڈے کیوں مانگتا۔ اور تھائی لینڈ کی سرحدوں پر اس کی فوجیں اپنی چھاؤنیاں کیوں ڈالتیں۔ بلکہ ہمیں تو حیرت ہے۔ اتحادیوں نے ابھی تک جاپان پر حملہ کیوں نہیں کیا۔

مسٹر جے چندر نے پہلا سگریٹ راکھ دان میں مسل کر دوسرا سلگا لیا۔ وہ انور کی

گفتگو میں ایک دم دلچسپی لینے لگے

لیکن انور صاحب! جاپان کو اس لڑائی میں نقصان ہی ہو گا۔

کملا کے پتا جی نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ اور سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولے:۔

کیوں صاحب! اسے کیا نقصان ہو گا؟

اس کے بعد مسٹر جے چندر ذہن پر زور دے کر جاپان کے نقصان اور کملا کے پتا جی اس کے فائدے کی وجوہات دریافت کرتے رہے اور آدھ گھنٹہ تک انتہائی غیر دلچسپ اور بے معنی گفتگو جاری رہی۔ انور خاموشی سے سگریٹ سلگاتے بیٹھا کملا کو پھول کاڑھتے دیکھتا رہا۔ اس کے لئے یہ ہزار نظاروں کا ایک نظارہ تھا۔ کملا بھی درمیان میں کبھی سر اٹھا کر اس کی طرف نیم متبسم نگاہوں سے دیکھ لیتی۔ اور انور کو محسوس ہوتا کہ جاپان کو لڑائی میں فائدہ ہو یا نہ ہو۔ لیکن اسے وہاں بیٹھنے میں یقیناً فائدہ پہنچ رہا ہے۔ پھر چائے آگئی اور وہ لوگ کرسیاں چھوڑ کر نیچے قالین پر بیٹھ گئے۔ سرخ قالین کے وسط میں زرد پھولدار رومال پر چائے کے نازک برتن چن دیئے گئے تھے۔ جو عورت چائے کا سامان لگا رہی تھی۔ انور اسے دیکھ کر اچانک کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس عورت کو پہلے بھی اس نے کہیں دیکھا ہو۔ وہ بھاری بھرکم بڑی عورت کملا کے ہاں ملازمہ تھی۔ انور کو گمان ہو رہا تھا۔ کہ یہ عورت اس رات تانگے کے ساتھ تھی۔ جب وہ چوک کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ہر بڑی عورت تقریباً ہم شکل ہوتی ہے۔ وہ پیالے میں چمچ ہلانے لگا۔ کملا نے سنہری بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ مسٹر جے چندر کی طرف بڑھا دی۔ جے چندر ہنسنے لگا اور اس کا چہرہ زیادہ گول ہو گیا۔ پھر وہ انور کی طرف متوجہ ہوئی

انور بابو — آپ بھی کھایئے ناں۔

کملا کے پتا جی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے بولے۔

اور یہ مجھ سے لکھوا لیجیے۔ جاپان نے جب بھی برما پر حملہ کیا۔ برمی عوام اس کی مدد کریں گے

وہ کیوں؟ مسٹر جے چندر کا منہ کھل گیا۔

محض اس لیے کہ برمی لوگ انگریزوں۔ امریکیوں اور کسی حد تک ہندوستانیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہمیں ڈاکو سمجھتے ہیں۔ جو ان کے گھر میں آکر ان کی دولت لوٹ رہے ہیں

لیکن میرے برمی ملازم تو مجھ سے بڑے خوش ہیں۔

بہر حال وہ تمہاری جگہ کسی اپنے بھائی بند کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تمہیں شاید علم نہیں۔ برما میں برما آئیل کمپنی سے لے کر ماتری بھنڈار تک ہر ایک کاروبار پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے۔ ان میں امریکی ہیں۔ انگریز ہیں۔ مدراسی ہیں۔ بنگالی ہیں۔ پنجابی ہیں۔ مادر برمی یا تو سائیکل رکھشا چلاتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیوری کرتے ہیں۔ اور یا سوکھی مچھلی اور مینڈک بیچتے ہیں

لیکن اس کی وجہ؟

انور چائے کی پیالی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بولا۔

کسی ملک کو لوٹتے وقت یہی وجہ کافی ہوتی ہے کہ وہ کمزور ہے اور مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برما تعلیمی اور صنعتی اعتبار سے بہت پیچھے ہے۔ اور رنگون کی فلم کمپنیاں ابھی تک جنوں پریوں کے قصے فلما رہی ہیں۔ لیکن اس تعلیمی بدحالی اور معاشی بحران میں غیر ملکی سرمائے کا بھی گہرا دخل ہے۔ یہ سرمایہ جونک کی طرح برما کا خون چوس رہا ہے۔ رنگون جیٹی سے پٹرول لوہا سلور۔ چاول اور گندھک سے لدے ہوئے جہاز یورپ اور امریکہ کو روانہ ہوتے ہیں۔ اور اس کے بدل میں مکھیاں مارنے والی جھانپلوں اور پونڈز کریم کی ڈبیوں سے بھرے ہوئے جہاز رنگون پہنچ جاتے ہیں۔ بڑی سیدھی سادی بات ہے۔ کسی ملک کو بھی اتنا حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے یہاں آکر چائے کے باغات خریدے۔ اور اس

ملک کی دولت کا رخ اپنے ملک کی طرف موڑ دے۔

لیکن مسٹر انور! یہ تو مشرق بعید کے ہر ملک میں ہو رہا ہے

جی ہاں!! اور یہ مشرق بعید کے ہر ملک میں ختم ہو کے رہے گا۔ کیونکہ لوگ بہت آگے نکل آتے ہیں۔ اور یہ دور (EXPLOITATION) کا دور نہیں ہے

بیرسٹر صاحب چائے کی بھاپ پر عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولے:۔

تو پھر انور بابو ــــ یہ دور کس کا ہے؟

اس وقت بھدے جسم والی ملازمہ چائے کا پانی لیے اندر داخل ہوئی۔ انور نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس عورت کا دور ہے:۔

مسٹر جے چندر فوجی ٹھیکیدار بے اختیار ہنس پڑے۔ اور ان کی بوجھل توند ہلنے لگی۔ کملا بھی ہنس پڑی۔ اس کے پتا جی بھی مسکراتے۔ اور پھر انور بھی ہنس پڑا۔ انور نے سگریٹ سلگاتے ہوئے دیکھا۔ موٹی ملازمہ بھی ہنس رہی تھی۔

چائے کے بعد کملا نے سینما کا پروگرام پیش کر دیا۔ جسے مسٹر جے چندر نے باچھیں پھیلاتے ہوئے فوراً قبول کر لیا۔ کملا نے انور کو بھی دعوت دی۔

آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے انور بابو۔ گلوب میں ایلسٹر ولیمز کی فلم لگی ہے

جی نہیں مجھے دفتر پہنچنا ہے۔

دفتر فون کر دیجئے

ذرا مشکل بات ہے

کملا، مسٹر جے چندر کے ساتھ کار میں بیٹھ کر سینما چلی گئی۔ اور انور بس میں سوار ہو کر دفتر آگیا۔ راستہ بھر وہ کملا کے بدلے ہوئے رویے پر غور کرتا رہا۔ اسے ناتر کی اس رات والی باتوں کا خیال آرہا تھا۔ لیکن وہ یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا کہ کملا کا عشق باٹا کا سینڈل ہے۔ جسے وہ ہر تیسری دکان سے خرید سکتی ہے۔

انہی خیالات میں الجھا ہوا وہ دفتر پہنچ کر اپنے روزمرّہ کے کام میں مصروف ہو گیا۔

اگلے پروگرام پر کملا ریڈیو سٹیشن آئی تو مسٹر جے چندر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مسٹر جے چندر نے سٹوڈیو اور کنٹرول روم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ انور بے حد مصروف تھا۔ اس نے انہیں مسٹر ڈی کوٹ کے حوالے کر دیا۔ انور کملا کے ساتھ سٹوڈیو میں آگیا۔ اس نے پروگرام چارٹ دیوار سے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

ایستھر ولیز کی فلم کیسی رہی کملا؟

او بہت خوبصورت ـــــ ایستھر بہترین اداکارہ ہے۔

انور دیوار میں پن گھیرتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

مسٹر جے چندر بھی بہترین ہیں

کملا جوڑے کے پھول ٹھیک کر رہی تھی

ہاں انور بابو ـــــ وہ بڑے اچھے ہیں۔ بڑے بھولے ہیں

اور بڑے امیر ہیں۔

انور اتنا کہہ کر سٹوڈیو سے باہر نکل گیا۔ کملا نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سازندوں کے درمیان جا کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر جے چندر بھی وہاں آگئے۔ اور دیوار کے ساتھ لگ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اگرچہ ان کا پروگرام کے وقت اس جگہ بیٹھنا خلاف قانون تھا۔ لیکن انور نے مسٹر ملک سے اجازت طلب کر لی تھی۔ اور مسٹر جے چندر کو ہدایت کر دی تھی۔ کہ وہ خاموشی سے بیٹھے رہیں۔ گانا شروع ہوا تو طبلچی کے ساتھ مسٹر جے چندر کا سر بھی ہلنے لگا۔ جتنی دیر تک کملا گاتی رہی۔ مسٹر جے چندر وجد میں آکر جھومتے رہے۔ اور انور نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ انہوں نے اس دوران میں کوئی چھینک نہیں ماری

ٹی روم میں مسٹر جے چندر کملا کے گانے کی تعریف کرتے رہے کملا خوشی سے مسکراتے ہوئے انہیں ریڈیو پر سازوں کی کمی اور اس کی وجہ سے پیدا ہو جانے والی خامیوں کا حال بتاتی رہی۔ اور انور خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا۔ شاید اس کے پاس اب کہنے کو کچھ رہا تھا۔ چائے ختم کر کے اس نے دونوں سے کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر اجازت چاہی۔ اور باہر نکل گیا۔

مسٹر جے چندر نے کملا کی طرف جھک کر کہا۔

انور بابو۔ بڑے عمدہ آدمی ہیں۔

کملا ذرا مسکرا کر بولی۔

ہیں تو واقعی بڑے عمدہ لیکن کبھی کبھی ان پر خوشی کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ بس پورے بور بن جاتے ہیں

اس پر دونوں ہنس پڑے اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کملا ماتھر نے اب رنگون ریڈیو پر آنا بہت ہی کم کر دیا۔ مہینے میں وہ اگر ایک پروگرام کرتی تو باقی دو پروگرام خالی جاتے۔ وہ فون پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی۔ اور انور کو عین وقت پر کافی پریشانی اٹھانا پڑتی۔ ناچار رنگون ریڈیو کو اس کا کنٹریکٹ منسوخ کر دینا پڑا۔ انور نے معاملہ دبانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مسٹر ملک کو کملا کے بارے میں زیادہ مجبور نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ ان دونوں کے تعلقات پر پہلے ہی سے دفتر میں چہ میگوئیاں شروع تھیں۔ کملا کو تنسیخ معاہدہ کی اطلاع کر دی گئی جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا ایک ماہ گزر گیا نہ کملا دفتر آئی نہ انور نے اسے خواہ مخواہ فون کرنا گوارا کیا۔ وقت گزرتے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ بیتے دنوں کی غم نصیب یادوں کے قافلے بھی گزرنے لگے

ایک روز اچانک اسے نائر کا تار ملا۔ اس نے انور کو بہت جلد میمیو بلایا تھا۔ اس نے اسی وقت تین یوم کی رخصت کی درخواست دے دی۔ تیسرے روز اس کی چھٹی منظور ہوئی اور وہ گاڑی میں سوار ہو کر میمیو پہنچ گیا۔

میمیو سنی ٹوریم شہر سے باہر ایک چھوٹی سی پہاڑی کی ٹریٹ پر واقع تھا۔ دو منزلہ سرخ

عمارت ساگوان اور چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی اپنا اٹیچی کیس ہوٹل میں رکھ کر انور رکھشا میں بیٹھ سیدھا سینی ٹوریم پہنچا۔ ہسپتال کے برآمدے میں اسے ایک برمی لڑکا ملا۔ جس نے سبز تہمد کے اوپر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ انور نے اس لڑکے سے وکٹوریہ وارڈ دریافت کیا۔

اوپر ـــ دوسری منزل میں جناب

دوسری منزل کے ٹھنڈے برآمدے میں سے گزرتے ہوتے اس نے ایک کمرے کے باہر ۷ ـ 13 لکھا ہوا پڑھا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

نائر بستر مرگ پر تھا اور اس کی ماں اور ادھیڑ عمر کا باپ اس پر جھکے ہوئے تھے۔

ایک پتلا لمبا مدراسی ڈاکٹر ٹمپریچر لے رہا تھا۔ اور سفید لباس والی نرس چارٹ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ نائر کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے نیلے حلقوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کے گرد سفید تولیہ لپیٹا ہوا تھا۔ اور کمزور جسم کو سرخ کمبل سینے تک ڈھانپے ہوئے تھا۔ انور بائنتی کی طرف ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا ڈاکٹر نے تھرمامیٹر باہر نکالا تو نائر نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ اپنے سامنے انور کو دیکھ کر اس کے مردہ چہرے پر بے معلوم سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اس نے ہلکی سی کراہ نما آواز کے ساتھ آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اور ہونٹوں کو یوں بھینچ لیا۔ گویا ناقابلِ برداشت درد سے نجات حاصل کر رہا ہو۔ نائر کی بوڑھی ماں اور باپ نے چونک کر اپنے بدنصیب بیٹے کی طرف بے کسی سے دیکھا اور ان کے چہرے از حد غمزدہ دکھائی دینے لگے۔ کمرہ چھوٹا اور خالی خالی سا تھا۔ چھت کے وسط میں بجلی کا بلب لٹک رہا تھا۔ دیواروں کا رنگ سفید تھا۔ اور کھلی کھڑکیوں میں جالی دار سفید پردے جھول رہے تھے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ فضا میں کسی دوا کی غیر خوش گوار بو رچی ہوئی تھی۔ جو ذہن پر بیمار قسم کے خیالات مسلط کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے باہر نکلتے ہوئے نائر کے باپ سے دھیمے لہجے میں کہا۔

گھبرائیں نہیں ذرا ٹمپریچر بڑھ گیا ہے۔ میں نے دوائی پلا دی ہے۔ ابھی

ہوش آجائے گا۔

ڈاکٹر کے ساتھ ہی برمی نرس بھی باہر چلی گئی۔ اور کمرے کی خموشی زیادہ گہری ہو گئی۔

انور نے ذرا جھک کر نائر کے غمزدہ باپ سے اپنا تعارف کرایا اور پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ نائر کی ماں نے اپنے بیٹے کے دوست کو ماتا بھری اداس نظروں سے دیکھا اور پھر نائر پر ڈالا ہوا کمبل درست کرنے لگی۔

رات دس بجے تک نائر نے پوری طرح ہوش نہ سنبھالا اور ٹمپریچر کسی طرح کم نہ ہوا۔ ڈاکٹر ہر آدھ گھنٹے بعد ٹمپریچر دیکھ جاتا۔ اور نرس چارٹ پر کچھ لکھ جاتی نصف شب کے قریب انور نے آہستہ سے اٹھ کر نائر کے باپ سے اجازت لی اور واپس ہوٹل آگیا۔

دوسرے روز ابھی دن نکلا ہی تھا۔ کہ انور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر سینی ٹوریم پہنچ گیا۔ دوسری منزل پر نائر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بستر خالی تھا اور ایک موٹی موٹی بھدی پنڈلیوں والی برمی نرس بستر کی چادر بدل رہی تھی۔ انور کچھ پوچھتے ہوئے ڈرنے لگا۔ وہ دروازے میں بت بنا کھڑا رہا۔ نرس نے انور کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر کہا:۔

کیا آپ بیڈ نمبر ۷ ـ 13 سے ملنے آئے ہیں؟

انور کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

'ہاں ـــ'

نرس نے افسوس ناک انداز میں سر ہلایا۔

وہ رات مر گیا ـــ اس کی ماں کی بھی حالت خراب تھی۔ وہ لوگ لاش رنگون لے گئے ہیں۔

انور کو ایکا ایکی محسوس ہوا کہ وہ غلط کمرے میں آگیا ہے۔ اس نے جلدی سے باہر نکل کر کمرے کی پیشانی پر نگاہ ڈالی۔ نہیں وہ غلط کمرے میں نہیں تھا۔

یہ نائر ہی کا کمرہ تھا۔ پھر نائر کہاں ہے؟ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا سینی ٹوریم سے باہر نکلا۔ اور ٹیکسی میں بیٹھ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ رنگون جانے والی گاڑی چار گھنٹہ پہلے روانہ ہو چکی تھی۔

وہ سٹیشن سے نکل کر پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گیا۔ نائر کی موت کا خیال سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ لیکن اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ مر چکا ہے وہ اس کی موت ـــ اتنی قبل از وقت خوفناک موت پر یقین لانے کو تیار نہ تھا۔ مگر راہ چلتے ہر آدمی کا چہرہ اور نگاہیں اسے نائر کی موت کی خبر سنا رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دیئے وہ شہر سے کافی دور نکل آیا تھا اور اب ایک ایسی پتھریلی سڑک پر جا رہا تھا جس کے دونوں جانب گھاس کے ڈھلوانی میدان اور چیڑھ کے درخت تھے۔ انور کو اپنی زندگی کوٹ کی جیبوں کی مانند بالکل خالی خالی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یوں چلا جا رہا تھا۔ گویا کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ چلتے چلتے وہ اچانک ایک طرف مڑا۔ اور تن آور درخت کے تلے لمبی گھاس میں گر کر اپنا چہرہ زمین پر ملنے لگا۔ اس کی آنکھیں خون کے آنسو رونے لگیں اور وہ سسکیوں کے درمیان نائر کو پکارنے لگا۔

دوست ـــ میرے پیارے دوست! .....

انسان کی زندگی کی شاید سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ اس کے دوست اسے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں اور وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ ہمیں ہر دوسرا آدمی اپنی دوستی کا یقین دلاتا ہے اور اس کے باوجود ہم اکیلے ہوتے ہیں اور ہمارا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ حقیقی دوست ملنا بہت مشکل ہے۔ جب کبھی ہمیں ایسے دوست کا ساتھ نصیب ہوتا ہے تو ہم اپنی زندگی کی تمام آرزوؤں کے غنچے اس کے قدموں پر نچھاور کر دیتے ہیں اور جب وہ ہم سے جدا ہوتا ہے تو ہمارے پاس کچھ باقی نہیں رہتا اور ہم اپنے آپ کو ویران سینما ہال میں تنہا بیٹھے محسوس کرتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا وہ بہت جلد کسی نہ کسی

کام میں مصروف ہو جاتی ہیں جو اس بھیانک خلاء کا بہترین علاج ہے۔ مگر مرد اس خلا میں غیر مکمل لے کی طرح بھٹکنے لگتا ہے۔ وہ ہر جذبے کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اس کی پستی میں بھی اس کی بلندی کی عظمت ہوتی ہے کاش زندگی اتنی مختصر ہوتی پر آرزو نہ ہوتی۔

انور گھاس پر سے اٹھا اور آگے چل پڑا۔ اسے اپنے قدم زمین میں جکڑے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اور وہ انہیں مردہ لاش کی طرح گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ اور گہری نیند میں کھو گیا۔ خواب میں اس نے دیکھا۔ کہ وہ اور نائر جھیلوں والے باغ میں گھاس پر بیٹھے ہیں اور نائر اپنے مخصوص سوگوار انداز میں اس سے باتیں کر رہا ہے۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ انور کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ تکیئے کے نیچے منہ دے کر سسکیاں بھرنے لگا۔

دوست ـــ میرے دوست! تم کہاں ہو؟

سسکیوں کے درمیان اسے پھر نیند آ گئی اور اب کی دفعہ اس نے عنیزہ کو دیکھا۔ اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ انور کا ہاتھ تھامے کسی ٹیلے پر چڑھ رہی تھی۔ ایکا ایکی انور کا ہاتھ چھوٹا اور وہ گہری کھڈ میں لڑھک گیا۔ لیٹے لیٹے انور ایک دم اکٹھا ہو گیا اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"عنیزہ ـــ؟"

کمرہ بالکل خالی تھا۔ اور کھڑکی میں سے اندر آتا ہوا شام کا اندھیرا اسے اور زیادہ ویرانی بخش رہا تھا۔ فضا میں خنکی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ کمبل اوپر کھینچ کر انور نے سگریٹ سلگایا اور اندھیرے میں پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور کھلی کھڑکی میں مدھم ہوتے ہوئے درختوں کے خاکے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور پریشان ذہن میں ان لوگوں کی پیاری پیاری صورتیں گھوم رہی تھیں۔ جو ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اسے گمان ہونے

لگا۔ جیسے ہوٹل کے اس نیم روشن تنہا کمرے میں درخشاں۔ سائمیں۔ عنیزہ اور کملا اس کے قریب بیٹھی ہیں اور اس کے عظیم دکھ میں برابر کی شریک ہیں اس خیال کے ساتھ ہی تنہائی اور درد کا احساس زیادہ گہرا ہو گیا اور وہ سگریٹ پھینک کر نیچے آگیا۔ اس نے صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ اور اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ دروازہ اندر سے بند کر کے وہ بستر میں گھس گیا۔ اس رات اسے گہری نیند آئی اور کوئی افسردہ خواب پریشان نہ کر سکا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کھڑکی کے شیشوں پر چمک رہی تھی۔ اور دہلیز پر ایک چھوٹی سی رنگین چڑیا خوشی سے ادھر ادھر پھدک رہی تھی۔ انور کو یوں محسوس ہونے لگا۔ گویا اس نے ابھی ابھی کوئی طویل اور افسردہ خواب دیکھا ہے۔ خوش رنگ چہکتی چڑیا زندگی، مسرت اور روشنی کی پیامی بن کر اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ انور آہستہ سے اٹھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور اترا ہوا چہرہ دیکھا۔ اور جلدی سے گرم پانی منگوا کر شیو بنانا شروع کر دی۔ تپائی پر رکھی ہوئی رسٹ واچ دن کے دس بجا رہی تھی۔ رنگون والی گاڑی میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ نہا دھو کر اس نے ناشتہ کیا۔ نیچے پہنچ کر ہوٹل کا بل ادا کیا۔ اور اٹیچی کیس سنبھال کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سٹیشن پر رنگون جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی۔

۱۲

۲ دسمبر ۱۹۴۱ء کی صبح کو جاپان نے اتحادی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

ابھی دن اچھی طرح نہ چڑھا تھا۔ کہ انور کو دفتر سے بلاوا آگیا۔ دفتر میں ہر آدمی پہلے سے زیادہ مستعد اور ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔ ریڈیو سٹیشن کے باہر درجن کے قریب امریکی سپاہی مختلف مقامات پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے۔ مسٹر میکائے کے کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی۔ تقریباً سارا سٹاف جمع تھا۔ اس سے پیشتر دو بار ریڈیو پر جاپان کے اعلانِ جنگ کا پیغام نشر کیا جا چکا تھا۔ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا۔ کہ اردو پروگرام میں صبح کی دو نشستوں کا اضافہ کر دیا جائے۔ ریڈیو کے تمام ملازمین میں شناختی کارڈ بانٹ دیئے گئے۔ تینوں سٹوڈیوز اون تھے اور ہر دس منٹ کے وقفے کے بعد اردو۔ بنگالی، برمی سنہالی گجراتی اور انگریزی زبان میں جاپان کا اعلانِ جنگ دہرایا جا رہا تھا۔ اور لوگوں کو ہوائی حملے سے بچنے کی تدابیر بتائی جا رہی تھیں۔

سارے شہر میں جنگ کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی اور لوگ گھروں سے باہر

نکل آئے تھے۔ اور بازاروں، گلیوں اور دوکانوں کے باہر ٹولیوں کی شکل میں کھڑے جاپان، امریکہ اور برطانیہ کی فوجی طاقت پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ اخبار بیچنے والے چیخ چیخ کر خاص ضمیمے ہوا میں لہراتے ہوئے بازاروں میں دوڑ رہے تھے اور لوگ دھڑا دھڑ خرید رہے تھے۔ دوپہر کے خبرنامے میں حوائی، مینسلا اور پرل ہاربر پر جاپان کی اندھا دھند بم باری کی خبر آئی تو شہر کے لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ریڈیو سٹیشن پر فون کے ذریعہ اس قسم کے سوالات کیے جانے لگے:۔

"ہیلو — کیا مولمین پر حملے کی خبر درست ہے؟

رنگون اور ٹوکیو میں کتنا فاصلہ ہے؟

برما میں ہماری کل فوج کتنی ہے؟

کیا رنگون پر بھی بم باری ہو گی ہے؟"

انور دوپہر کے کھانے کے لیئے گھر گیا تو اس نے لیوس سٹریٹ میں وہ منظر دیکھا جس کے متعلق اسے پہلے ہی سے یقین تھا۔ برمی پولیس کے آدمی سنگینوں سے لیس جاپانی لانڈری والے کی دکان کے باہر کھڑے تھے اور تماش بینوں کے مجمع کو پرے ہٹا رہے تھے۔ بوڑھا جاپانی گاہکوں کے میلے اور دھلے ہوئے کپڑے تقسیم کر رہا تھا اس کی بوڑھی بیوی اور بچی اوٹاشا پولیس کی نگرانی میں کھڑی تھی۔ اوٹاشا کے چہرے پر پریشانی کی ایک بھی لکیر نہ تھی۔ وہ ہونٹوں میں ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ لیئے پولیس کے سپاہیوں کو تک رہی تھی۔ لیکن اس کی ماں کی باریک آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ خوف زدہ تھی بوڑھا جاپانی جب لوگوں میں کپڑے تقسیم کر چکا۔ تو پولیس نے باقی بچے ہوئے کپڑے ایک جگہ ڈھیر کیئے۔ دکان بند کر کے اس پر مہر لگائی اور ان تینوں کو موٹر میں بٹھلا کر لے گئی۔ شہر میں جتنے بھی جاپانی تھے۔ پولیس نے ان سبھوں کو گرفتار کر لیا۔

آدھ گھنٹے بعد انور پھر دفتر میں تھا۔ پروگرام کی دوسری نشست ختم ہوئی تو انور

اور مسٹر ملک ریڈیو وین میں بیٹھ کر شہر کی گشت کو نکل پڑے۔ کار پر لاؤڈ سپیکر لگے ہوئے تھے۔ تین گھنٹے تک وہ شہر کے خاص بازاروں کا چکر کاٹتے رہے۔ ہر بڑے چوک میں رک کر انہوں نے لوگوں کو بتایا۔ کہ ہوائی حملے کی صورت میں انہیں کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ وہ جہاں بھی ٹھہرتے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ان پر احمقانہ سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے۔

ایک ہی دن میں جاپانی مال کی قیمتیں دوگنی ہو گئیں۔ اسکاٹ مارکیٹ میں بازار مندا پڑ گیا۔ اجناس کی منڈیوں میں بیوپاری مال اٹھاتے ہوئے ہچکچانے لگے۔ بڑے بڑے دکان داروں نے دوکانوں سے مال نکال نکال کر گوداموں میں بھرنا شروع کر دیا۔ امریکی، برطانوی، ہندوستانی اور آسٹریلوی سپاہی بازاروں میں عام نظر آنے لگے۔ ٹیکسی ڈرائیور۔ رکشا ڈرائیور اور کوچوانوں نے کرائے کے نرخ تین گنا بڑھا دیئے چنانچہ شہری لوگ پیدل چلنے لگے۔ روپیہ لوگوں کی جیبوں سے نکل کر جنگی ضروریات پر صرف ہونے لگا اور انا پورنا سٹریٹ کی طوائفیں رات بھر ناچتی گاتی رہتیں۔

دیکھتے دیکھتے رنگون شہر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ ہر سرکاری اور نیم سرکاری دفتر کے باہر مسلح پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا۔ سول سیکرٹریٹ کے گرد اگرد خاردار آہنی تار کا جال پھیل گیا۔ اور دروازوں کے باہر بلوچی اور جہلمی سپاہی سینہ تانے کھڑے ہو گئے۔ رات کو مکمل بلیک آؤٹ ہوتا۔ سر شام گلیوں اور بازاروں میں گھپ اندھیرا چھا جاتا اور لوگ کاروبار ختم کر کے اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے۔ دن بھر مصنوعی سائرن بجا کر لوگوں کو دشمن کے جہازوں کی آمد اور پھر سب ٹھیک ہے کا فرق سمجھایا جاتے لگا۔ سڑک کنارے ہر بیس قدم کے فاصلے پر کھدی ہوئی خندقیں صاف کرا دی گئیں اور شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہوائی حملے سے بچاؤ کی خندقیں کھودی جانے لگیں۔ بنکوں کے سامنے سارا دن بھیڑ رہنے لگی۔ لوگ اپنا اپنا روپیہ چھوٹے بنکوں سے نکلوا کر بڑے بڑے غیر ملکی بنکوں میں جمع کروا رہے تھے۔ مسلمان چائے خانوں میں فلمی ریکارڈ کم ہو گئے اور نغمیہ رکارڈ

زیادہ بچنے لگے۔ ہندو ہوٹل والوں نے بھجنوں کا زور ڈال دیا۔ سورتی بڑی مسجد میں ہر نماز کے بعد خدا سے دعا کی جاتی۔ کہ وہ رنگون کے امن پسند شہریوں کو جنگ کے خوفناک شعلوں سے محفوظ رکھے۔

جاپانی اعلانِ جنگ کے بعد صرف ایک بحری جہاز مسافروں کو لے کر کلکتہ روانہ ہو سکا۔ اور وہ جہاز لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس کے بعد وزارتِ دفاع کی جانب سے تمام بحری کمپنیوں کو اطلاع کر دی گئی کہ خلیج بنگال کا سفر خطرے سے خالی نہیں رہا۔ آئندہ کوئی جہاز رنگون کی جیٹی سے کلکتہ روانہ نہ ہو۔ ہوائی جہاز کا سفر صرف یورپین کے لیئے وقف تھا۔ تمام کمپنیوں کے جہاز ان انگریز، امریکی، اسٹریلوی اور ڈچ عورتوں، مردوں اور بچوں اور بوڑھوں کو کلکتے پہنچانے کے لیے وقف تھے۔ جو رنگون، مانڈلے، اکیاب اور سین میں رہائش پذیر تھے۔ کوئی بھی ہندوستانی کسی قیمت پر بھی جہاز میں سوار نہ ہو سکتا تھا۔ شروع شروع میں کچھ ہوائی جہاز انہیں لے کر بنگال کی طرف اڑے تھے لیکن بعد میں کوئی بھی کالا آدمی ہوائی اڈے کا رُخ نہ کر سکا تھا۔

رات کے سے جب شہر پر گہرا اندھیرا اور سناٹا چھا جاتا تو ویران سڑکوں پر کتے آسمان کی جانب منہ اٹھا کر رونا شروع کر دیتے۔ ان کی دہشت ناک آوازیں گھروں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں پر خوف و ہراس طاری کر دیتیں۔ اور انہیں محسوس ہوتا کہ شہر پر کوئی انتہائی بھیانک بلا نازل ہونے والی ہے۔ بحرِ اوقیانوس میں جاپان کی جنگی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی تھیں اور اخبار ہیرالڈ ٹریبیون کے مالک وائیڈیٹر بہت خوش ہو رہے تھے۔ وہ بغلیں بجا بجا کر کہتے:۔

اب چٹی چمڑی والوں کا یہاں سے بستر اگول سمجھو۔ بڑی کروندا[1] قوم سے واسطہ پڑا ہے انہیں

---

[1] کروندا پنجاب میں کالے کے سانپ کو کہتے ہیں۔ جو ڈسنے کے بعد آدمی کو گرنے کی بھی مہلت نہیں دیتا۔

لیکن ماتری بھنڈار کے باہر بیٹھنے والے موچی پر ان ہنگامی حالات کا بے حد معمولی اثر ہوا تھا۔ اب وہ ہوٹل میں لگے ہوئے ریڈیو پر خبریں توجہ سے سنتا اور اس کے بعد کوئی نہ کوئی جُوتا مرمت کرتے ہوئے اس سے باتیں شروع کر دیتا۔

سناؤ میرے مزدور بھائی ـــــ کتنا بوجھ ڈھو چکے ہو؟

۷ دسمبر کو جاپانی فوجیں ملایا میں اتر پڑیں۔ ۸ دسمبر کو ملایا کے سمندروں میں جاپانی آبدوز نے 'ایپلس اور پرنس آف ویلز' کو تارپیڈو مار کر غرق کر دیا۔ ۹ دسمبر کو جاپانی جزائر فلپائن میں گھس گئے۔ اور وہاں اپنے مکمل قبضے کا اعلان کر دیا۔ ۱۰ دسمبر کو پی تانگ پر جاپانی بم برسے۔ اور ۱۱ دسمبر کے روز ان کے بموں سے لدے ہوئے ہوائی جہاز رنگون کی طرف پرواز کرنے لگے

اس روز صبح نہایت چمکیلی اور خوش گوار تھی۔ اور عیسائی گھرانوں میں کرسمس کے تہوار کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تین روز پہلے ریڈیو پر اعلان ہو چکا تھا کہ اب اگر ہوائی حملے کا سائرن بجے تو اسے مصنوعی نہ سمجھا جائے۔ نو بج کر اکیس منٹ پر ہوائی حملے کی خبر دینے والے تمام سائرن ایکدم چیخ اٹھے اور ان کی بھیانک اور منحوس آوازوں نے شہر پر لرزہ طاری کر دیا۔ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا ہر آدمی سہم کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر سڑک پر نکل آیا۔

انور پروگرام ختم کرنے کے بعد ٹی روم میں آرام کر رہا تھا۔ سائرن کی آواز سنتے ہی وہ ٹی روم سے نکل کر باہر آ گیا۔ سامنے کمپاؤنڈ میں ایک طرف بڑی سی خندق کھدی تھی۔ تقریباً دفتر کا سارا اسٹاف جلدی جلدی اس خندق میں اتر گیا۔ خندق کے اندر لحد میں ایک چھوٹی سی تاریک گلی دور تک چلی گئی تھی دیوار کے ساتھ ساتھ اینٹوں کا چبوترا تھا۔ سب لوگ اس چبوترے پر بیٹھ گئے۔ ہر آدمی کا چہرہ ایک دم اتر گیا تھا اور وہ اپنے بال بچوں، بہن بھائیوں کے خیال سے از حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ خندق میں اندھیرا سلین تھی اور فضا میں

گیلی مٹی کی بو پھیلی ہوئی تھی ۔ سب لوگ خموش اور اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے

باہر اب سائرن کی آواز رک گئی تھی۔ اور اس کی جگہ ہوائی جہاز کی دور سے آتی ہوئی ہم آہنگ گونج نے لے لی تھی۔ بہت جلد یہ آوازیں صاف ہو گئیں اور معلوم ہونے لگا۔ جیسے دشمن کے جہاز ہمارے سروں پر چکر لگا رہے ہیں۔ معاً خلا میں ہیبت ناک شور پیدا ہوا۔ گویا کئی ایک ریل گاڑیاں بیک وقت قریب سے گزر رہی ہوں۔ یہ چیخ نما آوازیں ایک تباہ کن اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے دھماکے میں مدغم ہو گئیں۔ یہ دھماکے سے پھٹنے والا پہلا جاپانی بم تھا۔ جو رنگون کی بندرگاہ پر پھینکا گیا۔ بدقسمتی سے گولہ بارود سے لدا ہوا ایک جہاز ابھی ابھی وہاں آن رکا تھا۔ پہلا بم کسٹم آفس اور سٹور روم کو ملبے کا ڈھیر بنا گیا۔ دوسرا بم عین جہاز کے اوپر آکر گرا اس کا پھٹنا تھا۔ کہ ایک قیامت برپا ہو گئی۔ گولہ بارود کو آگ لگتے ہی ایک دھماکہ ہوا اور بندرگاہ کے اردگرد کا سارا علاقہ دیکھتے دیکھتے آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ شہر پر گہرے سیاہ دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ اور گلی کوچوں میں دن کے وقت اندھیرا پھیل گیا۔ خندق میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل ڈوب گئے۔ مہیب آوازوں والے جاپانی جہاز غوطہ مار کر شہر پر بم برسا رہے تھے۔ اور بھاگتے ہوئے شہریوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ بم اگر سڑک پر گرتا تو وہاں سے چشمے کی طرح پانی ابلنے لگتا۔ اور اگر کسی عمارت پر گرتا تو اس کی اینٹیں اور چھتوں کے آہنی گارڈز ہوا میں اڑاتے ہوئے دوسری عمارتوں پر جا گرتے اور آگ کے جہنمی شعلے آسمان کی طرف لپکنے لگتے۔ لیارہ شکن توپوں کی آواز برابر آرہی تھی۔ بایل ایر فورس کے لڑاکا طیارے عقابوں کی طرح جاپانی طیاروں پر جھپٹ رہے تھے۔ پانچ منٹ کی لگاتار بم باری کے بعد اپنے دو طیارے گرا کر جاپانی ہوا باز واپس چلے گئے۔ اور شہر میں

"سب ٹھیک ہے" کا سائرن بجنے لگا۔

خندق سے باہر نکل کر انور کملا کو فون کرنے سیدھا ٹرانسمیشن روم میں گیا۔ لیکن ریسیور اٹھاتے ہی اسے معلوم ہوا کہ شہر میں ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ وہ دفتر سے باہر نکل آیا۔ فریئر سٹریٹ اور مرچنٹس سٹریٹ پر کوئی بم نہیں گرا تھا۔ مگر سڑک پر جا بجا لوگوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ الٹی۔ سیدھی لاشیں خون آلود تھیں۔ اور لوگ ان کو دھیان میں لائے بغیر اپنا اپنا سامان ریڑوں اور رکشوں میں لادے بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے۔ یہ ان لوگوں کے مردہ جسم تھے جو بم باری کے وقت خوف زدہ ہو کر سڑک پر بھاگ نکلے تھے اور یوں گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آگئے تھے۔ انور تیز تیز قدم اٹھاتا یوس سٹریٹ میں آگیا۔ یہاں موٹروں، گھوڑا گاڑیوں، رکشوں اور ریڑوں کا بے حد رش تھا۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں سے دھڑا دھڑ سامان نکال رہے تھے۔ اور ریڑوں پر لاد رہے تھے عورتیں پریشانی کے عالم میں کھڑی تھیں اور بچے ان کے ساتھ رو رہے تھے۔ آسمان پر دھواں ہی دھواں تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی عمارت کے کڑکڑا کر گرنے کی آواز آجاتی تھی۔ یوس سٹریٹ محفوظ تھی۔ انور کا بوڑھا ملازم محسن سیڑھیوں پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا یہاں سے انور مغل سٹریٹ کی طرف نکل گیا مغل سٹریٹ کے چوراہے میں کلوب سینما کی عظیم الشان عمارت شعلوں میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اونچے لمبے سنگین ستونوں کو آگ کی آتشیں زبانیں چاٹ رہی تھیں۔ فائر بریگیڈ آگ بجھانے میں مصروف تھا۔ دھوئیں کے تاریک مرغولوں میں شعلوں کی بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ سڑک پر پانی ہی پانی تھا۔ اور لوگ ٹخنوں تک پانی میں ڈوبے شڑاپ شڑاپ کرتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ سولی پیگوڈا ڈرڈ بالکل بند تھی۔ وائٹ وے کمپنی کی بلند و بالا عمارت کا آدھا حصہ سڑک کے بیچ میں ملبے کے بہت بڑے ٹیلے کی شکل میں پڑا تھا اور بقیہ آدھا جل رہا تھا

کڑکڑاتی آگ میں چٹختے ہوئے لکڑی کے تختے اور کھپچیاں فضا میں اڑ رہی تھیں فضا میں گندھک اور گندہ بیروزہ کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ انور رنگون کالج کی طرف سے ہو کر دوسری طرف جا نکلا۔ بسین سکوائر میں ایک بس سڑک کے عین وسط میں الٹی ہوئی تھی اور پاس ہی گڑھے میں سے پانی فوارے کی طرح اچھل رہا تھا ایک آدمی بس کے نیچے آ کر کچلا گیا تھا اس کی صرف ٹانگیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ جن پر سے چڑا اوھڑ گیا تھا۔ ملٹری ٹرک تیزی سے پرے چوک کی طرف جا رہے تھے۔ وہ چوک بندرگاہ کے سامنے تھا۔ اور شہریوں کو ادھر جانے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ جہاز کی آگ اردگرد کی کئی عمارتوں کو راکھ کا ڈھیر بنا چکی تھی اور ابھی تک اس کے شعلے دور سے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔

ہارڈنگ کراس عبور کرتے ہوئے انور نے دیکھا کہ سامنے ایک گلی کے کونے میں ملٹری کا ٹرک کھڑا تھا۔ اچانک دو سکھ فوجیوں نے مکان کی ڈیوڑھی میں سے کسی لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے باہر کھینچا۔ اس کے منہ پر رومال ٹھونسا، اور ٹرک میں بیٹھ کر خود بھی جلدی سے سوار ہو گئے۔ اور ٹرک بجلی ایسی تیزی کے ساتھ گلی میں سے گزر کر غائب ہو گیا۔ انور یہ تماشا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے فوراً چوک میں ایک طرف کھڑے امریکی سپاہی کو اس حادثے کی خبر کی۔ لیکن وہ کوئی ثبوت مہیا نہ کر سکا۔ کیونکہ گلی بالکل ویران پڑی تھی اور اب وہاں اس انسانیت سوز حادثے کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ بڑی دور کا چکر کاٹ کر انور، کملا کے بنگلے کے باہر پہنچ گیا بنگلے کا چوبی پھاٹک بند تھا اور باغ میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہاں وہاں زندگی کا بالکل نشان نہ تھا۔ برآمدے کا فرش گرد آلود تھا۔ اور دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے انور کوٹھی کے عقب کی طرف آ گیا۔ یہاں ایک بوڑھا تین کے چھپر کے نیچے چارپائی پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ انور کے دو بار بلانے پر بوڑھے نے آہستہ سے اٹھ کر پھٹی پھٹی بوڑھی آنکھوں سے انور کو دیکھا۔

"بیرسٹر صاحب کہاں ہوں گے"؟

بوڑھے نے پھر سر جھکا لیا اور آہستہ سے کمزور آواز میں بولا۔

میمیو۔

انور کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لوگ میمیو کیوں چلے گئے۔ شاید ان کا فوجی ٹھیکیدار صاحب زادہ انہیں وہاں لے گیا ہو۔ کیونکہ میمیو دوسرا بھاری فوجی ٹھکانہ ہے انور، بوڑھے کی سنگین خاموشی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ذرا جھک کر پوچھا:۔

'بابا تمہیں پتہ ہے شہر پر بم باری ہوئی ہے؟

بوڑھا سر جھکائے ہوئے بولا۔

'ہاں بیٹا جانتا ہوں ـــــ میرے دونوں لڑکے ابھی تک کام سے واپس نہیں آئے۔ میں ان کے لیے پریشان ہوں۔ اس سے پہلے وہ جب کبھی رات کی شفٹ پر جاتے تڑکے ہی واپس آ جایا کرتے تھے

وہ کہاں کام کرتے ہیں بابا؟

'جیٹی پر ـــــ'

انور کے پاؤں تلے گویا زمین کانپ گئی۔ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں بوڑھے کو سلام کیا۔ اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔

دوسرے روز تیسرے پہر کے قریب پھر خطرے کا سائرن بجا۔ اور سائیس جاپانی طیارے تین ٹولیوں میں بٹے رنگون کے آسمان پر چکر لگانے لگے۔ شہر کے عین اوپر پہنچ کر تینوں ٹولیاں ادھر ادھر بکھر گئیں اور انہوں نے بندرگاہ ریلوے ورکشاپ ریلوے سٹیشن، کمانڈ آرڈیننس فیکٹری اور شہر کے دیگر مقامات پر اندھا دھند بم باری شروع کر دی۔ بندرگاہ پر ابھی گذشتہ روز کی آگ مدھم نہ ہوئی تھی۔ کہ نئے سرے سے تازہ شعلے بھڑک اٹھے۔ آٹھویں پنجاب رجمنٹ کے جوانوں سے بھری ہوئی فوجی گاڑی کسی نہ معلوم مقام کو کوچ کرنے کے لیئے سٹیشن پر تیار کھڑی تھی۔

ایک جاپانی طیارے نے جھک کر غوطہ لگایا اور سٹیشن کی چھت پر بیک وقت نصف درجن کے قریب بم گرا دیئے۔ ایک مہیب دھماکہ ہوا۔ اور فوجی گاڑی کے پرزے اڑ گئے۔ سٹیشن کی عظیم الشان عمارت کا مغربی حصہ دھوئیں اور شعلوں میں تبدیل ہو گیا۔ ریڈیو سٹیشن اس مرتبہ بھی محفوظ رہا۔ اگرچہ یہ بم باری پہلی بم باری سے زیادہ شدید اور تباہ کن تھی۔ لیکن رنگون ریڈیو کی عمارت پر کوئی بم نہ گر سکا۔ دوسری بم باری پر یہ بات ثابت ہو گئی کہ ملک میں ففتھ کالمسٹ نہایت تیزی سے سرگرم عمل ہیں۔ ریڈیو گھر کے علاوہ تقریباً ہر جگہ دشمن کے بم ٹھیک نشانے پر لگے تھے۔ پہلی بم باری کے بعد سیلز بیریکس سے پٹرول کے ذخیرے نکلوا کر رنگون کالج کے احاطے میں درختوں تلے رکھوا دیئے گئے تھے دوسری مرتبہ بم باری ہوئی تو سیلز بیریکس پر کوئی بم نہ گرا مگر رنگون کالج کی عمارت بھک سے اڑ گئی۔ اور قریب قریب وہ سارا علاقہ تباہ و برباد ہو گیا۔ جاپانی طیارے اس قدر چمکیلے اور سفید تھے کہ دھوپ میں ان پر نگاہ بالکل نہ ٹھہرتی تھی۔ اور ایک بار دیکھنے پر دوسری بار آنکھوں کے آگے تارے سے ناچنے لگتے تھے۔ ایک طیارے کی دم پر گولہ لگا اور وہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ ہوا باز چھاتے کے ذریعے نیچے اتر پڑا۔ ہندوستانی اور امریکی سپاہی اس کی طرف لپکے۔ ہوا باز اتفاق سے سولی پیگوڈا کے چوک میں اتر پڑا۔ سڑک پر قلابازی کھلنے کے بعد وہ چھاتے کے جال سے باہر نکلا اور دونوں ہاتھوں میں پستولیں تان کر کھڑا ہو گیا امریکی سارجنٹ نے آگے بڑھ کر اس سے ہتھیار چھیننے چاہے۔ جاپانی ہوا باز نے گولی چلا کر اسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ اب دوسرے فوجیوں نے بھی گولی چلا دی۔ ہوا باز زمین پر لیٹ کر فائرنگ کرتا رہا۔ جب اس کے داہنے ہاتھ والے پستول میں صرف ایک گولی رہ گئی۔ تو اس نے نالی کا سرا اپنی کنپٹی سے لگایا اور لبلبی لگا کر دبیں پر جان دے دی۔

جاپانی طیارے شہر میں آگ اور خون کا کھیل کھیل رہے تھے وہ عقاب ایسی

تیزی اور بے باکی کے ساتھ فضا کی بلندیوں سے سر بفلک عمارتوں پر جھپٹتے اور آن کی آن میں انہیں ملبے کا ڈھیر بنا کر پھر اوپر چلے جاتے۔ گنز رسٹرک کے عین بیچ میں غوطہ مارتے اور بھاگتے ہوئے نہتے شہریوں پر گولیوں کا مینہ برساتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ امریکی۔ برطانوی اور ڈچ لڑاکا طیارے ان سے بڑی بری طرح لڑ رہے تھے۔ یہ لڑائی شہر کے اوپر ہو رہی تھی۔ چنانچہ ایک ہوائی جہاز کی ٹینکی میں کسی نہ کسی طرح سوراخ ہو گیا اور پٹرول کی گرتی دھار نے ایک محلے کی آگ کو کئی محلوں میں پھیلا دیا۔ یہ قیامت خیز منظر سات منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد دشمن ستائیس طیاروں میں سے صرف اکیس زخمی طیارے واپس لے جا سکا۔ اسی روز رات کو پچھلے پہر مانڈلے، میمیو اور اکیاب پر بھی بم باری ہوئی۔ مانڈلے کا بجلی گھر اڑ گیا۔ میمیو میں تین مکمل فوجی بیرکوں کا صفایا ہو گیا اور اکیاب میں تیل کے ذخیرے کو آگ لگ گئی تمام رات رنگون جلتا رہا اور اندھیرے میں آگ کے شعلے اور چنگاریاں رقص کرتی رہیں۔ الصباح جب مشرقی آسمان کے زعفرانی کناروں سے سورج نے سر نکالا تو رنگون نصف کے قریب جل چکا تھا۔ سڑکوں پر جا بجا انسانی لاشوں کے خون آلود ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ کسی کا سر غائب تھا۔ کسی کا دھڑ ندارد ——— کہیں صرف ٹانگیں جل رہی تھیں۔ اور کہیں محض انتڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک برمی عورت کا چھاتیوں تک کٹا ہوا جسم فٹ پاتھ کے کنارے پڑا تھا۔ اور باقی حصہ سامنے والی عمارت کی دیوار سے چمٹا ہوا تھا۔

اب کی دفعہ لیوس سٹریٹ بھی نہ بچ سکی تھی۔ گرینڈ ہوٹل سے لے کر مائزی بھنڈار تک اس گلی کا پورا ایک بلاک اڑ گیا تھا۔ انور ملبے کے اونچے ڈھیروں اور جلے بجھے تختوں میں سے گزر رہا تھا۔ اور اسے ابھی تک اپنے مکان کا نشان نہ مل سکا تھا۔ اچانک اسے ایک جگہ سالویشن آرمی کا چھوٹا سا بورڈ لوہے کے مڑے ہوئے گاڈروں کے درمیان دکھائی دیا۔ اس کا مکان اسی عمارت کے سامنے تھا لیکن اب اس عمارت کے سامنے تو پتھروں، اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر لگا تھا۔ چند

ایک لڑکھڑائی ہوئی دیواروں کی دہلیزیں اور دروازوں کے پٹ ابھی تک جل رہے تھے عنیزہ کے مکان کا بھی کوئی نشان نہ باقی تھا اور انور اس کے ماں باپ کی زندگی یا موت سے بھی بے خبر تھا۔ وہ ملبے کے اونچے نیچے ٹیلوں میں سے ہوتا ہوا ماتری بھنڈار کی طرف چل پڑا۔ دل ہی دل میں وہ خدا کا شکر بجالا رہا تھا کہ کل شام وہ گھر سے باہر تھا اور رات دفتر میں ہی گزار دی۔ ایکا ایکی وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ماتری بھنڈار کے باہر بوٹ ہے باتونی موچی کی لاش پڑی تھی اور وہ اسی طرح مرمت طلب جوتا ہاتھ میں لیئے گدی پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر آگے کو جھکا ہوا تھا اور پشت پر قمیض میں ایک جگہ گہرا سرخ شگاف پڑا تھا۔ اس کے سامنے اسی طرح پرانی جوتیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ اور جوتا مرمت کرنے والے اوزار پڑے تھے لوگ سروں پر کندھوں پر، پیٹھوں پر اسباب لادے، دہشت زدہ عورتوں اور سہمے ہوئے بچوں کو ساتھ لیے اپنی اپنی دھن میں تیز تیز چلے جا رہے تھے اور کوئی کسی کا واقف نہ بن رہا تھا۔ وہ بوڑھے موچی کے اوزاروں اور جوتوں کے ڈھیروں کو لتاڑتے ہوئے گزر رہے تھے اور کسی کو اس بوڑھے کی زندگی یا موت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ انور نے قریب جا کر پاس ہی پڑا ہوا بوریا بوڑھے کی لاش پر ڈالا اور آگے روانہ ہو گیا۔ لاش پر بوریا ڈالتے ہوئے انور کو دفعتہً یوں محسوس ہوا جیسے بوڑھا مرا نہیں بلکہ زندہ ہے اور تلے میں ٹانکہ بھرنے کے لیے وہ بوٹ پر جھکا ہوا ہے جیسے وہ اس جوتے سے کہہ رہا ہے۔

دیکھا میرے بھائی کس صفائی سے ٹانکہ بھر رہا ہوں۔ کیا مجال ہے جو تمہیں ذرا بھی درد کا احساس ہو۔

قاضی صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے تھے اور ہیڈ کاتب اور میکائیل سے اپنے کنبے کو وہاں سے نکال لے جانے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے۔ وہ کافی پریشان تھے۔ اور بار بار آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ انور کو دفتر میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ خوش ہو کر بولے:۔

آخر بم باری کروا کر ہی چھوڑی ناں!۔

لیکن جاپانیوں کو گالیاں تو آپ کے اخبارات دیا کرتے تھے

قاضی صاحب نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ میکائیل نے کہا:۔

بھئی۔ جب لیوس سٹریٹ کا بلاک اڑا تو ہمیں از حد پریشانی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ہم تو تمہاری زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ پھر قاضی صاحب نے رات دفتر فون کیا تو پتہ چلا تم وہاں سو رہے ہو۔

ہاں رات اتفاق سے زیادہ کام تھا۔ اور میں کھانا کھانے بھی گھر نہ آ سکا۔

ہیڈ کاتب نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا:۔

اللہ کا شکر ہے برخوردار جان تو بچی۔ اس گیارہویں کو پانچ آنے کے بیٹھے چنے بچوں میں بانٹ دینا۔

قاضی صاحب نے سر کھجلاتے ہوئے کہا:۔

اگر اس گیارہویں کو یہاں ہوئے تو ——

میکائیل اور انور زیر لب ہنسنے لگے۔ واقعی رنگون جس جائے ناگہانی کی زد میں تھا اسے دیکھتے ہوئے زندگی پر ایک گھڑی، ایک پل کا اعتبار کرنا بھی حماقت میں شامل تھا۔ قاضی صاحب بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے

جاپانیوں نے شہری آبادی پر بم باری کر کے کینگی اور درندگی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے پہلے ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ یہ قوم اس قدر بہیمیت پسند ہو گی۔ اس وقت تک رنگون میں ایک لاکھ کے قریب شہری مر چکے ہیں اور جو بے گھر ہو گئے ہیں۔ ان کا کوئی شمار ہی نہیں۔

لیکن یہ بم باری تو اب روز ہو گی۔

اگر یہی رفتار رہی تو جاپانی بہت جلد رنگون پر قبضہ کر لیں گے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ رنگون میں ہماری فوج بہت ہی تھوڑی مقدار میں ہے۔ خارکوف فتح ہونے کے بعد یوروپ میں جرمنوں کی پوزیشن کافی

مضبوط ہو گئی ہے۔ اور اتحادیوں کو اس قدر شدید جاپانی حملوں کا بالکل گمان نہ تھا۔ برما گورنمنٹ رنگون چھوڑ کر میمیو جا چکی ہے اور رنگون میں صرف امریکی اور ہندوستانی چند ایک دستے ہیں جو صبح سے منیلا لائنز اور سول سپلائی میں لوٹ مار مچا رہے ہیں۔ وہاں بھاگتے ہوئے کنبوں کی عورتیں اغوا کی جا رہی ہیں اور سامان لوٹا جا رہا ہے۔ میں نے اخبار میں زبردست نوٹ لکھے ہیں لیکن میں جانتا ہوں ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ شاید پرسوں ہمیں بھی یہاں سے کوچ کرنا پڑے۔

پھر اب کیا کرنا چاہیئے؟

کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیئے۔ میں تو آج شام اپنی فیملی کو کمانٹ لے جا رہا ہوں اگر اتحادی فورس یہاں پہنچ گئی تو بہتر۔ ورنہ پھر یہاں سے چٹاگانگ کی طرف پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ لوگوں کے قافلے چل پڑے ہیں۔

میکائیل احمد نے فکرمند لہجے میں عینک صاف کرتے ہوئے کہا۔

اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں۔

قاضی صاحب حقے کا کش لگا کر بولے۔

اگر ہمیں چٹاگانگ تک پیدل سفر کرنا پڑا اور ہم صحیح وسالم وہاں پہنچ گئے تو یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا۔ ہمیں رنگون سے پردم جانا ہوگا۔ وہاں سے ہم ایراوتی عبور کریں گے۔ وہاں سے من بالہ ینگ ڈاؤن من گن اور کنگ شو تک کا سفر گھنے جنگلات اور دشوار گزار پہاڑیوں کا سفر ہے کنگ شو سے چٹاگانگ اسی نوے میل باقی رہ جاتا ہے یہ طویل مسافت بھی انہی دو تین مہینوں میں طے کر لینی چاہیئے۔ اگر برسات شروع ہو گئی تو ہم رنگون سے دو میل باہر نہ جا سکیں گے۔

'قاضی صاحب' ہیڈ کاتب نے کلاہ اناستے ہوئے پوچھا۔ یہ کل فاصلہ کتنا ہے؟

زیادہ سے زیادہ پان سو میل ہے۔ اور ہم اسے ہنستے کھیلتے تیس پینتیس دنوں میں عبور کر سکتے ہیں۔

انور کو بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے قاضی صاحب سے اجازت لی اور ریڈیو سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ واپسی پر پھر وہ لیوس سٹریٹ میں سے گزرا بوڑھے موچی کی بھکی ہوئی لاش پر بدستور بوریا پڑا تھا۔ اور اس کی پرانی جوتیاں فٹ پاتھ پر دور دور تک بکھر گئی تھیں۔ سالویشن آرمی کی عمارت ابھی تک جل رہی تھی اس کے بالمقابل اکیلی کھڑی بعض دیواروں میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ انور کو اچانک اپنے بوڑھے ملازم محسن کا خیال آگیا۔ اس کا دل اس محبت کرنے والے نیک انسان کی محبت سے لبریز ہو گیا۔ جانے وہ کہاں ہوگا۔ کیا معلوم وہ ملبے کے ڈھیر تلے وہیں کہیں دبا پڑا ہو اور اس کا منہ کھلا ہو اور آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ انور کا سر اپنے مہربان بوڑھے ملازم کی عزت میں خود بخود جھک گیا۔

ریڈیو سٹیشن کے باہر امریکی پہرہ بدستور موجود تھا۔ لیکن اندر سوائے مسٹر میکائے کے اور چند ایک ٹیکنیکل آدمیوں کے اور کوئی نہ تھا۔ نی ردم جو کبھی زندہ دل ہنس مکھ لڑکیوں کے قہقہوں سے گونجا کرتا تھا بالکل ویران پڑا تھا۔ انور نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر چائے بنائی۔ باسی ڈبل روٹی کے دو ٹکڑے کاٹے اور وہیں کھڑے ہو کر کھانے لگا۔ مانڈلے کا بڑا بجلی گھر اڑا جانے سے بجلی کی طاقت میں کافی کمی واقع ہو گئی تھی۔ تاہم جنریٹر چلا کر شام کا ریڈیو پروگرام شروع کر دیا گیا۔ سٹاف کی کمی نے مسٹر میکائے کو کافی پریشان کر دیا چنانچہ اس رات سوائے خبروں اور فوجی اعلانات کے اور کچھ براڈکاسٹ نہ ہو سکا اور وہ رنگون ریڈیو کی آخری رات تھی۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ دفتر میں صرف انور اور مسٹر میکائے رہ گئے۔ میکائے کا گھر وہیں تھا اور انور کا کوئی گھر ہی نہ تھا۔ رات کا کھانا انور نے مسٹر میکائے کے ساتھ کھایا۔ مسٹر میکائے نے بھی اپنی بیوی اور بچے میمیو بھیج دیئے تھے اور خود وہاں اکیلا رہ گیا تھا

اس نے انور کو وہیں کمرے میں پڑ رہنے کو کہا۔ لیکن انور ٹی روم میں رات گزارنا چاہتا تھا۔

دروازہ بند کر کے اس نے سگریٹ سلگایا اور صوفے پر لیٹ کر اس کمرے کی زندگی پر غور کرنے لگا۔ اسے اپنی اور اس کمرے کی زندگی میں کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ دونوں کی زندگیوں پر جیتے دنوں کی گرد پڑی تھی۔ اور دونوں وقت کے ریگستان میں اس تنہا درخت کی طرح کھڑے تھے۔ جس کی چھاؤں میں خوبصورت چہروں اور مہربان آوازوں والے پیارے لوگ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر آگے نکل گئے ہوں اور اب دور دور تک ان کا کوئی نشان نہ مل رہا ہو۔

'مسٹر انور آج میں جی بھر کر گانا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی آپ کوئی فلک وغیرہ نہ دیں۔

یہ کملا ماتھر کی آواز تھی۔ وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی اس نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی ساور اس کے بالوں میں شبو کلی کی کلیاں مسکرا رہی تھیں اس کا چہرہ بھی شبو کلی کی طرح تھا۔ نورس، چمکیلا، پر مسرت ——

انور نے پلٹ کر صوفے پر دیکھا۔

کمرہ خموش اور ویران تھا اور صوفہ قیدی پرندے کی مانند اسے بے زبان نگاہوں سے تک رہا تھا۔ انور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جیب سے چمڑے کا بٹوہ نکال کر بجلی کی مدھم روشنی میں اپنی بوڑھی ماں کی تصویر دیکھی۔ وہ گاؤں والے گھر کے آنگن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ تھی اور سر سفید دوپٹے میں ڈھکا ہوا تھا۔ انور کی آنکھوں میں اپنے آپ آنسو امڈ آئے۔ اسے عظیم بے بہا گیر اور غیر فانی محبت کا احساس ہوا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا

'ماں! پیاری ماں!

اس نے تصویر سینے سے لگا کر منہ پرلی طرف کر لیا اور گرم گرم آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک آئے۔ پھر اسے نیند آ گئی۔

۱۳

ایک زیردست دھماکہ ہوا اور انور کی آنکھ کھل گئی۔

بتی بجھ چکی تھی اور ٹی روم میں گھپ اندھیرا تھا۔ کڑوا اور تلخ دھواں اس کے نتھنوں میں گھس رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ برآمدے میں آتے ہی کہیں قریب ہی ایک اور دھماکہ ہوا اور وہ فوراً دیوار کے ساتھ لگ گیا آسمان پر جاپانی جہازوں کی ہیبت ناک گونج سنائی دے رہی تھی۔ ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا۔ اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ سٹوڈیوز کے درمیان سے ہو کر جو راستہ ریڈیو سٹیشن کی پرلی طرف جاتا تھا ادھر سے دھواں اور ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ انور کو ایکا ایکی میکائے کا خیال آیا اور وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بھاگ اٹھا۔ دشمن اس دفعہ رنگون ریڈیو کو نشانہ بنانے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ دھماکے سے پھٹنے والا بم مسٹر میکائے کے کمرے سے کئی گز ہٹ کر جنریٹر روم پر گرا تھا اور ساتھ ہی کنٹرول روم کا بھی صفایا کر گیا تھا۔ بم کے کچھ ٹکڑے مسٹر میکائے کے مکان کی کھڑکیوں اور دیواروں پر لگے تھے اور وہاں شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ انور جب وہاں پہنچا تو میکائے کا ڈرائنگ روم

جل رہا تھا۔ اور مسٹر میکائے ایک کھڑکی کی راہ سے چمڑے کے صندوق باہر نکال رہے تھے جنریٹر روم اور کنٹرول روم ملبے کے ڈھیر بن چکے تھے۔ اور وہاں سے گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا۔ آگ سٹوڈیو کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اسی دم ایک بم سیٹی بجاتا ہوا کہیں قریب ہی گرا۔ اور در و دیوار ہل گئے انور اور میکائے فرش پر لیٹ گئے تھے۔ وہاں دھواں اور گرمی تیز ہو رہی تھی دونوں کے چہرے پسینے میں تر تھے۔ اور ان میں آگ کے شعلوں کا عکس جھلک رہا تھا۔ دونوں وہاں سے اٹھے اور سٹوڈیوز کے بیچ سے بھاگتے ہوئے باہر کمپاؤنڈ میں آکر خندق میں گھس گئے۔ دشمن روشنی کے بم بھی استعمال کر رہا تھا اس کے طیارے جگہ جگہ بم پھینک رہے تھے۔

خندق میں مکمل تاریکی تھی۔ مسٹر میکائے پسینہ پونچھتے ہوئے بولے:۔

یہ حملہ بڑا کامیاب رہا۔ تم نے دیکھا۔ کنٹرول روم تباہ ہو چکا ہے۔ میں نے اچھا کیا جو بال بچوں کو بھیج دیا۔ آگ میری خواب گاہ میں پہنچ گئی ہو گی۔ میری بیوی کو ریشمی چادروں کا بڑا افسوس ہو گا۔

مسٹر میکائے میرے خیال میں حکومت کو برما سے بھاگنا پڑے گا۔

اگر یہی کیفیت رہی تو جاپانی کل شام تک یہاں فوجیں اتار دیں گے۔

ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ اس قدر قریب تھا کہ انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا پڑیں۔ اس کے ساتھ ہی خندق میں مٹی اور لکڑی کے جلتے ہوئے کئی ایک ٹکڑے آن گرے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو تشویش ناک نظروں سے دیکھا۔ ان کے قدموں میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ جس میں شعلوں کا عکس کانپ رہا تھا انور نے آہستہ سے کہا:۔

دشمن کا یہ حملہ واقعی کامیاب رہا۔

دشمن حسب معمول ایک آدھ ہوائی جہاز پیچھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ سب ٹھیک ہے۔ کا سائرن بجتے ہی انور اور میکائے خندق سے باہر آ گئے سامنے

رنگون ریڈیو کے ساتھ والی عمارت جل رہی تھی۔ شہر کی سڑکوں پر آگ بجھانے والے انجن شور مچاتے دندنا رہے تھے۔ انور نے میکائے کا کچا کچا سامان باہر نکلوانے میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ اس وقت تک فائر بریگیڈ کے انجن وہاں آ گئے تھے اور بڑی تیزی اور مستعدی سے آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ اب آسمان پر تاریکی ڈھل رہی تھی۔ اور صبح کی پھیکی۔ پژمردہ اور بیمار روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ جب دن کافی نکل آیا تو مسٹر میکائے اور انور میکسم بار میں گھس گئے۔ وہاں سوائے مینجر کے اور کوئی نہ تھا۔

"ہیلو مسٹر ہمپٹی!"

"ہیلو سر ـــــ یہ حملہ بڑا خوفناک تھا!"

دونوں ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ انہوں نے باسی ڈبل روٹی اور پیاز منگوائے انہیں خود اچھی طرح سے کاٹا۔ ان پر چٹنی چھڑکی اور کھانے لگے۔ بار کے مینجر مسٹر ہمپٹی نے ایک بڑا سا جگ بیئر سے لبالب بھر دیا۔

"میرے مالک بھاگ گئے ہیں وہ چابیاں مجھے دے گئے ہیں اور اب میں بھی جا رہا ہوں۔ کیا کریں جناب! اب یہاں زندہ رہنا مشکل ہے۔

انور نے کہا۔

مگر تم چابیاں کس کے حوالے کرو گے؟

مسٹر ہمپٹی ہنس پڑا اور فضا میں دونوں مٹھیاں کھول کر بولا:۔

مجھ سے چابیاں لینے والا کوئی نہیں۔

پھر سینے پر صلیب کا نشان بنا کر آہ بھرتے ہوئے بولا:۔

آہ! مجھے یہاں سے کلکتے پیدل جانا ہو گا۔

بار کی کھلی کھڑکیوں میں سے لوگ کمر پر سامان لادے جلوس کی صورت میں ایک طرف رواں دکھائی دے رہے تھے۔ مسٹر ہمپٹی انہیں سہمی ہوئی نظروں سے تک رہا تھا۔ اور بار بار صلیب کا نشان بنا رہا تھا پیٹ بھر کر ناشتہ کرنے

کے بعد دونوں تمباکو کا دھواں اڑاتے ہوئے میکسم کے عقبی دروازے سے باہر آ گئے۔ آگ مدھم پڑ چکی تھی اور آگ بجھانے والے برمی نوجوان ابھی تک سیڑھیوں پر چڑھے کھڑکیوں اور روشندانوں کی راہ سے عمارت کے اندر پانی کی آبشاریں پھینک رہے تھے۔ گلی میں پانی ہی پانی کھڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی جیپ میں سپاہیوں نے مسٹر میکائے کا سامان رکھ دیا تھا۔

مسٹر میکائے نے انور سے کہا۔

مجھے مسٹر ملک پر کوئی افسوس نہیں۔ کچھ بھی ہو اس کی بیوی اور بچے بھی تھے خدا کرے کہ وہ زندہ ہو اور صحیح و سالم اپنے وطن پہنچ جائے۔

انور خموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ مسٹر میکائے پھر بولا۔

اور میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ میرے ساتھ میمیو چلے چلو۔ اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم برما گورنمنٹ کے ساتھ ہی وہاں سے کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں گے

انور نے باہر سڑک پر بے خانماں لوگوں کے جلوس کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا:۔

مسٹر میکائے میرا گھر برما گورنمنٹ کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے درمیان ہے۔ آپ میمیو جائیے اور میری فکر نہ کریں۔ میں ان لوگوں میں محفوظ اور خوش ہوں گا۔

مسٹر میکائے نے سر جھکا لیا اور پھر اس نے جیپ کا دروازہ کھولا انور کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:۔

"الوداع میرے دوست! تم نے مصیبت کے آخری دنوں تک ہمارا ساتھ دیا اور اپنے فرائض کو بڑی ذمہ داری سے نبھایا۔ دنیا کی کوئی بھی حکومت تمہیں اس گراں بہا خدمت کا معاوضہ نہیں دے سکتی۔ ہاں ـــــ خدا تمہیں اس فرض شناسی کا اجر ضرور دے گا۔ میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور میری بیوی بھی ـــــ تم بھی

ہمیں مت بھلانا۔ ہم اجنبی کی حیثیت سے ملے تھے اور گہرے دوستوں کی طرح جدا ہو رہے ہیں

شکریہ مسٹر میکائے ـــــ میں تم لوگوں کو یاد رکھوں گا:۔

مسٹر میکائے جیپ میں سوار ہو گیا۔ ڈرائیور نے انجن چلایا اور جیپ گلی میں سے نکل کر بازار میں گھوم گئی۔ انور کو ایک دم شدید تنہائی اور اکیلے پن کا احساس ہوا۔ وہ آگ بجھانے والے انجنوں کے درمیان تنہا کھڑا تھا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے امن کا آخری دوست بھی ساتھ چھوڑ کر اپنی راہ لگا ہو اس نے رنگون ریڈیو کی دھوئیں سے کالی عمارت پر آخری نگاہ ڈالی۔

الوداع میرے پیارے گھر ـــــ تیرے آنگن میں، میں نے بہار کے شگوفے کھلتے دیکھے۔ اور خزاں کی پتیاں مرجھاتے دیکھیں۔ میں اتنا اچھا نہیں کہ تم مجھے سدا یاد رکھ سکو۔ تم اتنے برے نہیں کہ میں تمہیں یاد نہ کر سکوں۔ اب ہم ایک دوسرے سے پھر کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بھلا نہ سکیں گے ہم نے زندگی کی حسین گھڑیاں ہنس کھیل کر پھولوں اور گیتوں کی سنگت میں گزاری ہیں۔ الوداع! میرے پیارے گھر ـــــ میری درخشاں، میری سانتیں میری عنیزہ اور میرے نائرا اور کملا ـــــ !!

اس کے بعد انور سست قدم اٹھاتا گلی سے باہر نکلا اور بازار میں سے گذرتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو گیا۔ یہ ہجوم ہر قماش کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بڑی بڑی دکانوں، سینما گھروں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کے مالکوں سے لے کر پھاڑی فروش اور رکشا چلانے والوں تک ہر طبقے کے لوگ شامل تھے بوڑھی عورتیں سر جھکائے چل رہی تھیں۔ نوجوان عورتوں نے کم عمر بچے اٹھائے ہوئے تھے۔ کچھ بچے ساتھ ساتھ روانہ تھے۔ مردوں نے سروں پر بڑے بڑے گٹھڑ اٹھا رکھے تھے مارواڑی سیٹھ سورتی میمن تاجر ایرانی ہوٹل والے، رکشا بان۔ بنگالی ...س گلے فروش، ہندوستانی کلرک۔ پنجابی چھوٹے موٹے تاجر اور دکان دار ہیں

اسی سکریٹ اور پان فروش ایک ساتھ ایک ہی ناؤ میں سوار چلے جا رہے تھے ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ اور ان کی پھٹی پھٹی نگاہیں ہر بار یہی ایک سوال دہرا رہی تھیں کہ:۔

ہم اپنے وطن کب پہنچیں گے؟ کب؟ کب؟

سپارکس سٹریٹ میں سے گذرتے ہوئے انور نے روزنامہ 'مجاہد اور ہیر پھیر' کے دفتر پر بڑا سا تالا پڑا دیکھا۔ اس نے من ہی من میں ہاتھ اوپر اٹھا کر دفتر کو الوداعی سلام کیا۔

خدا حافظ قاضی صاحب ـــــ 'مجاہد اور ہیر پھیر'!

اور میکائیل احمد ـــــ یتیم ایڈیٹر ـــــ

ہجوم وہاں سے بھی گزر گیا۔

سڑک کی دونوں جانب ایک بھی آدمی اس جلوس کا تماشا دیکھنے والا نہ تھا البتہ ہر دوسرے فرلانگ پر کوئی نہ کوئی کنبہ اس جلوس میں آن شامل ہوتا تھا بعض عمارتیں ابھی تک جل رہی تھیں اور بعض راکھ کا ڈھیر بنی دھواں دے رہی تھیں۔ فوجی کہیں کہیں بنکروں یا سرکاری دفتروں کے باہر پہرہ دے رہے تھے اور ہجوم کو دلچسپی سے تک رہے تھے۔ بم زدہ علاقوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اور منہدم مکانوں پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر پانی ہی پانی تھا۔ ایک جگہ بڑے سے ٹرک کا آدھا حصہ غائب تھا اور اس کا ایک ٹائر سامنے بجلی کے کھمبے پر لٹک رہا تھا۔ قریب ہی ایک لمبی ٹرام پٹڑی پر الٹی پڑی تھی نیچے ایک آدمی کی کچلی ہوئی نعش صاف نظر آ رہی تھی۔ لوگ خوب صورت کاریں عین سڑک کے بیچ میں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا اور دھوپ کا رنگ پھیکا اور مٹیلا تھا۔ گویا سورج کو گرہن لگ گیا ہو

منکی پوائنٹ روڈ عبور کرتے ہوئے انور نے برساتی ندی کے اس چھوٹے

سے پل کو دیکھا جہاں بیٹھ کر اس نے سائیں ـــــ پھول بیچنے والی اس معصوم برمی لڑکی کا انتظار کیا تھا۔ پل کے پاس سے ہو کر جھیلوں والے باغ کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی، ناریل اور تاڑ کے درختوں کے درمیان ویران اور چپ چاپ تھی۔ انور کا جی چاہا کہ وہ اس پگ ڈنڈی پر سے گزر کر جھیلوں والے باغ میں کچھ دیر گھومے۔ اسے جھیل کنارے اگنے والی نرم گھاس کی خوشبو یاد آ گئی۔ اور وہ اس گھاس پر لیٹنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ لیکن اگر وہ اس قافلے سے جدا ہو گیا تو اکیلا و تنہا برما کے گھنے جنگل کیوں کو عبور کرے گا؟ ایک بوڑھے برمی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پھلی منڈی جا کر یہ ہجوم رات بھر ٹھہرے گا۔ اور پھر وہاں نئے سرے سے قافلوں کی شکل میں روانہ ہو گا۔ انور اس کے بعد ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر اس جلوس سے نکل کر باغ میں جانے والی پگ ڈنڈی پر چل پڑا۔ برساتی ندی کے قریب پہنچ کر وہ پتھریلے پل پر بیٹھ گیا۔ اور سائیں کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب وہاں کوئی نہ آیا تو وہ پل پر سے اٹھا اور سر جھکائے ناریل اور تاڑ کے درختوں میں سے گزرنے لگا

باغ کے خطوں میں گھاس بڑھ آئی تھی اور وہاں بے خانماں لوگوں نے کنبوں سمیت پناہ لے رکھی تھی۔ جا بجا میلے کچیلے بوریئے کے بادبان سے پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے سایوں میں غریب برمی اور مدراسی کھانا وغیرہ پکا رہے تھے چھوٹے ٹیلے کی چڑھائی چڑھتے ہوئے انور اس بنچ پر جا کر لیٹ گیا۔ جہاں اسے کملا اور اس کی بہن شیلا ملی تھیں، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خیال ہی خیال میں ان ہنس مکھ لوگوں کی منڈلی میں شامل ہو کر جھیل کنارے کھیلنے لگا۔ جن کے متعلق اب اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ وہ زندہ ہیں یا مر کھپ گئے ہیں۔ دفعتہً اسے کسی لڑکی کی تیکھی آواز سنائی دی

'ارے یہ تو انور بابو سو رہے ہیں'۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور دوسری طرف دیکھا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اپنے ذہن کی اس شعبدہ بازی پر اسے ترس آنے لگا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ صرف تین سگریٹ باقی تھے۔ اس نے بٹوہ کھول کر رقم گنی ـــــ ایک سو اڑتالیس روپے، کچھ آنے اور کچھ ٹکے وہ سگریٹ سلگا کر وہاں سے اٹھا اور دوسری جانب جھیلوں کی طرف اتر گیا۔

جھیل کنارے بھی پناہ گزینوں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں، درختوں کے نیچے اینٹوں کے عارضی چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی اور چند ایک سیاہ فام مدراسی عورتیں گندے کپڑے جھیل میں دھو رہی تھیں۔ چوڑے چوڑے سبز پتوں کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہی وہ خوبصورت جگہ تھی۔ جہاں اس روز کملا اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکنک پر آئی ہوئی تھی۔ اور جہاں بچھے ہوئے سرخ قالین پر بیٹھا وہ معصوم شیلا کے جوڑے میں کنول کے پھول سجا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی نیم برہنہ برمی عورت نے سگار پیتے ہوئے انور کو گھور کر دیکھا اور دیکھتی ہی چلی گئی۔ انور وہاں سے راستہ کاٹ کر آگے نکل گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے جھیل کی ہلکی نیلی سطح کے اور کمان کی مانند پھیلے ہوئے چوبی پل کو عبور کیا اور اس بڑے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ جہاں گوتم بدھ کا مجسمہ تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے جب وہ اس بڑے پتھر کے پاس پہنچا۔ جس کا سہارا پا کر اس نے گرتی ہوئی کملا کو اپنے بازوؤں میں تھام لیا تھا۔ تو وہ پل بھر کے لیے رک گیا اور سیاہ فام پتھر کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ پھر اس نے بھیڑ کے معصوم بچے کی طرح بڑی محبت سے پتھر کو تھپتھپایا اور اوپر چڑھ گیا۔

گوتم بدھ کا مجسمہ بالکل ویسا تھا اور اس پر کوئی بم نہ گرا تھا۔ بارہ دری کے اکھڑے ہوئے فرش پر کہیں کہیں اگی ہوئی گھاس زیادہ لمبی اور گھنی ہو رہی تھی۔ دیوار پر وہ کچھ تلاش کرنے لگا۔ ایک جگہ اس کی نگاہیں خود بخود رک گئیں اور اس کے ہونٹوں پر تبسم کی مدھم کرنیں نمودار ہو کر ڈوب گئیں۔ وہاں پنسل سے لکھا تھا۔

"آج ہم پہلی مرتبہ یہاں آئے اور نیچے پھسل پڑے

دمسٹر انور، مس کملا ماتھر"

اس نے جیب سے پنسل نکال کر اس پرانی تحریر کے نیچے لکھ دیا۔

"رنگون جل رہا ہے۔ میں آخری مرتبہ یہاں سے گزر رہا ہوں اور بالکل تنہا ہوں۔"

'انور'

"بڑے ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ اس نے منکی پوائنٹ روڈ کی بجائے جھیلوں کے ساتھ ساتھ جانے والا راستہ اختیار کیا۔ یہ پتلی سی پہاڑی پگڈنڈی اگرچہ دشوار گزار تھی۔ اور سرکنڈوں اور دلدلوں کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی لیکن مچھلی منڈی پہنچنے کے لیے وہی راستہ مختصر ترین تھا۔

مچھلی منڈی میں گویا بیساکھی کا میلہ لگ رہا تھا۔ مارکیٹ کے سامنے والا میدان رنگون اور دیگر قصبات سے آتے ہوئے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی۔ کہیں کوئی آدمی کسی کو پکار رہا تھا۔ کہیں کوئی بچہ اونچے سُر میں رو رہا تھا۔ ہر طرف اسباب کے ڈھیر لگے تھے۔ پیگو جانے والی بڑی سڑک پر بیل گاڑیوں کی بھیڑ ہو رہی تھی۔ سفید پوش خاندان بری گاڑیبانوں سے پردم تک برما کے تاریک جنگل عبور کرنے کا سودا کر رہے تھے۔ اور گاڑی بان بات بات پر اکڑ رہے تھے۔ اور سگار کا کڑوا دھواں اڑاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بری زبان میں ہنسی مذاق کر رہے تھے کوئی بھی گاڑی بان اس طویل سفر کے لیے ہزار بارہ سو روپے سے کم پر راضی نہ ہوتا تھا۔ جو لوگ سودا طے کر چکے تھے۔ وہ بیل گاڑیوں میں پہلے اسباب اور بعد میں اپنی عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو سوار کروا رہے تھے۔ اس سے قبل کئی ایک قافلے اس بدنصیب سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ اس روز ایک کافی لمبا قافلہ انور کے وہاں آنے سے ایک گھنٹہ پہلے کوچ کر چکا تھا۔ اگلا قافلہ صبح سویرے روانہ ہو رہا تھا۔ انور نے اسی قافلے میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور خود بستی کے تنگ و پرشور بازاروں میں چکر لگانے لگا۔ جب شام کا وقت آن پہنچا

! در بستی کی چھوٹی چھوٹی دکانوں اور چائے خانوں کے باہر مدھم روشنیاں ٹمٹمانے لگیں تو انور کو سونے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی فکر ہوئی۔ اس کی جیب میں جو چند ایک روپے تھے وہی اس کا زادِ راہ تھا۔ چنانچہ وہ کسی ایسی محفوظ جگہ کی ٹوہ میں تھا جہاں سوتے میں کوئی اپنے ہاتھ کی صفائی نہ دکھا سکے۔ میدان میں جا بجا لیمپ روشن ہو گئے تھے اور آگ جل رہی تھی۔ بھیڑ بکریوں نے ممیانا شروع کر دیا تھا۔ پچھلی ماکیٹ کی طرف سے چلنے والی ہوا میں باسی مچھلیوں کی تیز بدبو اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں شامل تھیں کافی دیر ادھر ادھر گھومنے اور بے سود چکر لگانے کے بعد جب انور مرطوب زمین پر مچھروں اور بدبوؤں کے درمیان سونے کے لیے کوئی جگہ حاصل نہ کر سکا۔ تو اس نے بڑی سڑک پر بیل گاڑیوں کے اڈے سے ذرا ہٹ کر سال کے ایک گنجان درخت کو تاڑا جس کی پھیلی ہوئی شاخیں سڑک کے اوپر پل بنا رہی تھیں شاخیں ایک دوسرے میں گتھی ہوئی تھیں اور ان کے سرے سڑک پار والے درختوں کو چھو رہے تھے۔ ایک ہی پل میں انور نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اس درخت پر سوئے گا۔ اور ان شاخوں سے بڑھ کر پوری مچھلی منڈی میں کوئی آرام دہ بستر نہیں ہے۔ اس نے درخت کے نیچے پہنچ کر اچک کر شاخوں پر ہاتھ جمائے اور کرتب دکھانے والوں کی طرح دونوں پاؤں اوپر اٹھا کر ٹہنیوں پر دھر لیے۔ درخت کا ایک حصہ کانپنے لگا اور اوپر کہیں گنجان شاخوں میں کسی جانور نے غضب ناک ہو کر اپنے پر پھڑ پھڑائے۔ جہاں انور چڑھا تھا وہاں دو موٹی موٹی ٹہنیاں جڑواں بہنوں کی طرح ساتھ ساتھ چلی گئی تھیں آگے بڑھی ہوئیں۔ اوپر اٹھی ہوئیں ٹہنیوں کی کانٹ چھانٹ کے بعد انور پتلون اور قمیض کی جیبوں سے لڑھک جانے والی چیزیں نکال کر رومال میں لپیٹیں۔ رومال گلے میں باندھا اور موٹی شاخوں پر ٹانگیں پھیلا دونوں ہاتھ سر کے نیچے دے کر لیٹ گیا۔ درخت کی شاخوں میں سے گیلی ٹھنڈی کی بو آ رہی تھی۔ اور مچھر اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مچھر مارنے کے بعد جب انور کے بازو تھک گئے تو اس کی آنکھوں میں غنودگی طاری ہونے لگی۔ بستی کی طرف اب شور مدھم پڑ گیا تھا۔ گاڑیوں کے اڈے پر کسی

بر ہی گاڑیبان نے ہچکولے کھاتی ہوئی پتلی دبلی آواز میں کوئی گیت شروع کر دیا۔

اُس سے پہلے بھی ہم یہاں آئے تھے۔

اس کے بعد بھی ہم یہاں آئیں گے۔

ماں! تمہارا سر ناریل کے گودے کی طرح سفید ہے۔

اور تمہاری باتیں اس کے دودھ سے بھی زیادہ میٹھی ہیں۔

گاڑی بان کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی گئی۔ دور ہوتی گئی اور پھر انور سو گیا

علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں جب رنگون سے چٹاگانگ جانے والا پیدل قافلہ روانہ ہوا تو لوگوں کے شور اور سانٹے کھا کر بیلوں کے ڈکرانے کی آوازوں نے انور کو جگا دیا۔ اس نے وہیں لیٹے لیٹے سر جھکا کر سلگتی ہوئی آنکھیں جھپکاتے ہوئے نیچے دیکھا۔ قافلے کی آخری بیل گاڑی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور چھلانگ لگا کر درخت سے نیچے کود پڑا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے گلے میں بندھا ہوا رومال کھولا اور قافلے میں شامل ہو گیا۔

مشرقی درختوں اور اونچے ٹیلوں کے پیچھے سے سورج طلوع ہوا۔ تو انور نے سڑک پر حدِ نگاہ تک لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم دیکھا۔ یہ قافلہ چار پانچ ہزار آدمیوں، عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا۔ اس میں بیل گاڑیوں کی تعداد کوئی تین چار سو کے قریب تھی۔ ہر بیل گاڑی سامان، عورتوں، بوڑھے مردوں اور بچے بچیوں سے لدی ہوئی تھی۔ اور سڑک پر ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔ سب عورتوں کے چہروں پر ایک ہی رنگ تھا۔ مایوسی اور شدید کرب کا رنگ —— پردہ بڑی دور کی بات ہے۔ وہاں بہت کم ایسی عورتیں تھیں۔ جن کے سروں پر دوپٹہ سلامت تھا لوگوں کے چہرے غم آلود تھے۔ اور وہ غیر دلچسپی سے باتیں کرتے ہوئے قدم بقدم چلے جا رہے تھے۔ راہ میں جو بھی کوئی چھوٹا سا بر می گاؤں پڑتا۔ عورتیں بچے اور بوڑھے سڑک کنارے کھڑے ہو کر جلوس کا تماشا کرنا شروع کر دیتے گاؤں کے کتے بھونکتے ہوئے تھوڑی دور تک قافلے کا ساتھ دیتے۔ اور

پھر زبان ہلاتے ہوئے واپس چلے جاتے۔ ین ڈون کے قریب قافلہ پیگو روڈ چھوڑ کر پردم روڈ پر ہو گیا۔ پردم روڈ نہایت گھٹیا قسم کی چھوٹی سی کچی سڑک تھی۔ جو پہاڑیوں کے درمیان بل کھاتی چلی گئی تھی۔ یہاں بیک وقت ایک ہی بیل گاڑی چل سکتی تھی دن بھر قافلے نے بمشکل اٹھارہ انیس میل کا سفر کیا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ عورتیں اور بچے گاڑیوں سے اتر آئے اور گاڑی بانوں نے بیلوں کو کھول کر ادھر ادھر دھان کے کھیتوں میں چرنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ لوگوں نے چادریں وغیرہ تان کر وہاں چھوٹے چھوٹے گھر بنا لیے۔ جگہ جگہ لیمپ روشن ہو گئے اور آگ جلنے لگی۔ عورتیں ساتھ لایا ہوا آٹا گوندھنے لگیں۔ اور مرد بالٹیاں لے کر پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ جس کی سطح کائی سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور جس کی دلدل تہہ میں کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ جو آدمی سب سے پہلے اس تالاب پر پہنچا اس نے اپنی بالٹی بھر کر مسرت کا ایک فلک شگاف نعرہ مارا۔ اور لوگوں کا ہجوم اس طرف پل پڑا۔ ایک ہی وقت میں سینکڑوں بالٹیوں، ڈونگوں اور کنستروں نے پانی میں ڈبکیاں لگائیں اور دیہاتی تالاب کی پرسکون زندگی میں ہیجان خیز طوفان اٹھ آیا۔ دیکھتے دیکھتے سڑک سے تالاب تک جنگلی گھاس پر کئی پگڈنڈیاں بن گئیں جیسا کہ اس قسم کے پُرآز مصائب طویل سفر میں عام طور پر ہوتا ہے۔ انور کا ساتھ بٹالہ کے ایک پنجابی کنبے سے ہو گیا جو کمائٹ میں لوہے کا دھندا کرتا تھا۔ یہ کنبہ تین نوجوان لڑکوں۔ ایک ادھیڑ عمر کے باپ۔ ایک ماں و دو کمسن بچیوں اور ایک بوڑھے ملازم پر مشتمل تھا۔ نوجوان پُرحوصلہ تھے اور بات بات پر چٹکی بجا کر کہتے:۔

'یہ سفر تو یوں کٹ جائے گا۔'

ان کی پتلی دبلی ماں کو ان ہانڈیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔ جنہیں اس کے بیٹوں نے سامان کے ساتھ باندھنے سے انکار کر دیا تھا۔ خواہ کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی

ہو وہ بیچ میں ان ہانڈیوں کا ذکر ضرور لے آتی ہے۔

'ہائے میری کاغذی ہانڈیاں!'

اس کا بڑا لڑکا بھی ہر بار چمک کر اسے کچھ نہ کچھ سنا دیتا۔

اماں گھر پہنچ لینے دو تمہیں ہانڈیوں میں دبا دیں گے۔

ان لڑکوں کا باپ لوہے کے اس تازہ سٹاک کے غم میں گھلا جا رہا تھا۔ جس کی بلٹی چھڑالی گئی تھی۔ لیکن جو ابھی ریلوے گودام میں ہی پڑا تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کی حوصلہ مند گفتگو پر اپنا سر ہلا دیتا۔

اب وہ سورج کبھی نہ چڑھے گا۔ ہم پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے۔ بٹالہ پہنچ کر بقیہ زندگی کسی مسجد کے حجرے میں ہی بسر ہو گی۔

انور کو اتنے بڑے قافلے میں، جہاں ہر آدمی کو اپنی فکر تھی، تنہا دیکھ کر ان لوگوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ انور کو اس اجنبی لیکن دردمند کنبے میں شامل ہو کر پہلا فائدہ یہ ہوا۔ کہ اسے کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا اس کے پاس اگرچہ پیسے تھے۔ لیکن وہاں بڑی سے بڑی رقم لے کر بھی کوئی اپنا راشن گھٹانے پر تیار نہ تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ رات کو اوپر لینے کے لیے اسے چادر دستیاب ہو جاتی۔ اور یوں وہ برما کے تتلیوں جتنے مچھروں سے بچ رہتا۔

رات آرام کرنے کے بعد دوسرے روز الصباح قافلہ پھر سفر پر روانہ ہوا اب گھنے جنگلات، بلند چوٹیوں والی سرسبز پہاڑیوں، مہیب کھڈوں اور نوکیلی بنجر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ پتھریلی سڑک کبھی تو بالکل سیدھی ہو جاتی اور کبھی ہر گیارویں قدم پر کسی نہ کسی ٹیلے کے پہلو میں گھوم جاتی۔ برمی گاڑی بانوں نے بتایا کہ اب جنگلی درندوں کی مملکت شروع ہو رہی ہے

لیکن آدمیوں کا ہجوم انہیں ہم سے دور رکھے گا۔

بیل گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بٹالوی کنبے کی بوڑھی ماں نے انور سے پوچھا کہ گاڑی بان کیا کہہ رہا تھا۔ انور نے جب اسے بتایا کہ یہاں شیر ہاتھی اور جنگلی بلے

نام پائے جاتے ہیں تو وہ ڈر کر سمٹ گئی۔ اور اپنی پچیوں کو اس نے اپنے اور قریب کر لیا۔

رنگون سے بھاگے ہوئے بے خانماں لوگوں کا یہ قافلہ جس طرف سے گزر رہا تھا۔ راہ میں گندگی و تباہی پھیلاتا جا رہا تھا۔ سڑک کے آس پاس جنگلی کیلوں کا ایک بھی درخت سلامت نہ رہ سکا تھا۔ ایک ایک درخت پر سو سو آدمیوں کا جرگہ حملہ کر دیتا۔ اور دیکھتے دیکھتے درخت زمین پر لیٹ جاتا ناریل کے درختوں کو جھنجھوڑ کر پکے پکے تمام ناریل ہڑپ کر لیے جاتے بدقسمتی سے راہ میں سنبل کے چند درخت پڑ گئے۔ لوگوں کو جب یہ پتہ چلا کہ درخت سنبل کے ہیں تو وہ بندروں کی طرح ان کی ٹہنیوں پر چڑھ دوڑے اور آن کی آن میں ان کی ٹہنیوں کو ننگا پوچا کر دیا۔ جنہوں نے سنبل کا صرف نام ہی سنا تھا۔ انہوں نے بھی اس کے ابریشمی پھولوں سے اپنے میلے کچیلے تکیے بھر لیے۔ پانوں کے رسیا حضرات ڈھیمیں اٹھا اٹھا کر سپاری کے درختوں کی طرف اچھالنے لگے ان کی طرح دار بیگمات راہ میں کسی تالاب کی سطح پر کنول کے پھول دیکھتیں تو وہیں مچل جاتیں۔ اس قیامت خیز سفر میں بھی ان کی حسِ آرائش کمزور نہ پڑی تھی۔

سورج دن بھر چمکتا لیکن سڑک پر بانس، املی سالی اور ناریل و تاڑ کے جھنڈوں کا سایہ رہتا۔ تیسرے روز قافلے نے ٹکڑیوں میں بٹنا شروع کر دیا اس کی وجہ محض پانی کی قلت تھی۔ تالابوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب صرف کہیں کہیں کسی پہاڑ کی ترپٹ میں ایک آدھ چشمہ مل جاتا۔ لوگ خالی برتن اٹھا کر چشمے پر دھاوا بول دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کنڈ میں جمع شدہ پانی بہت جلد

ختم ہو جاتا۔ اور باقی لوگوں کو پتھروں کے نیچے سے قطرہ قطرہ رسنے والے پانی کا انتظار کرنا پڑتا۔ چنانچہ قدرتاً پہلے لوگ آگے نکل جاتے۔ اس کے علاوہ بعض لوگ اپنی اپنی بیل گاڑیاں اور خاندان ساتھ لے کر بہت آگے نکل گئے۔ اس خیال سے کہ راہ میں ملنے والے چشموں سے وہ بآسانی پانی حاصل کر سکیں۔ انور اور وہ بٹالوی گھرانہ جس ٹولی میں بٹے۔ اس میں کل آدمیوں کی تعداد اڑھائی سو سے زیادہ نہ تھی۔ اس قافلے کے پیچھے بھی اور قافلے چلے آ رہے تھے۔ اور آگے تو بہت قافلے نکل چکے تھے۔ راہ میں انہیں بری و بہاتی لوگوں سے پتہ چلا کہ قافلہ اس سڑک پر سے بیس روز ہوئے گزرا تھا۔ اس حساب سے انور نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ چٹاگانگ کے قرب و جوار میں چل رہے ہوں گے۔ راہ میں تقریباً ہر روز انہیں جاپانی طیاروں کی گونج سنائی دیتی جو رنگون پر بم باری کے لیے جا رہے ہوتے تھے۔ پہلے روز تو جاپانی طیاروں کی مخصوص آواز سن کر لوگوں میں افراتفری سی مچ گئی اور کئی لوگ سڑک سے اتر کر جنگل میں بھاگ گئے جو باقی رہے وہ سڑک پر ہی لیٹ گئے۔ مگر جاپانی بم بار پُرامن طریقے سے گزر گئے۔ اور انہوں نے وہاں کوئی بم نہ گرایا۔ شام کے وقت قافلہ جس جگہ رکتا۔ وہاں اردگرد کے دیہاتوں سے لوگ کیلے۔ اناناس، سوکھی مچھلی کا اچار، بھنے ہوئے چنے، گھریلو سگار اور پکے ہوئے مینڈک بیچنے آن جمع ہوتے۔ ان میں پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرنے والے درزی اور حجام بھی شامل ہوتے تھے۔ دو تین حجام رات بھر ضرورت مند لوگوں کی داڑھیاں مونڈنے میں مصروف رہتے اور صبح کے وقت بھاری جیبیں بھرتے کر دوسرے قافلے کے انتظار میں اپنے گھروں کی راہ لیتے۔

لیکن کیوشو قصبے کے گزرنے کے بعد بٹالوی کنبے والا چھوٹا سا قافلہ صحیح معنوں میں برما کے تاریک جنگلوں میں اتر گیا اور دیہاتی آبادی ختم ہو گئی۔ جن لوگوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ انہوں نے انہیں چمڑے کے غلافوں سے باہر نکال کر

بھر لیا۔ بری گاڑی بانوں نے ڈاہ تیز کر لیئے۔ دوسرے لوگوں نے لمبے لمبے بانس توڑ کر ان کے ڈنڈے بنا لیے۔ اب سڑک گنجان درختوں کے بیچوں بیچ لمبی سرنگ کی طرح چلی جا رہی تھی۔ سائے گہرے سبز ہو گئے تھے۔ اور دھوپ کہیں کہیں سفید دھبوں کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ درختوں پر عجیب عجیب قسم کے پرندے آدمیوں کی آوازیں سنتے ہی شور مچانے لگے۔ فرگوش بھاگ کر جھاڑیوں کے عقب میں جا چھپتے۔ گلہریاں جو چند لمحے پیشتر آزادی سے سڑک پر پھدک رہی ہوتی تھیں لپک کر درختوں پر چڑھ دوڑتیں۔ رات کو جنگلی درندوں سے بچنے کے لیے جگہ جگہ بڑے الاؤ روشن کر دیے جاتے۔ پھر بھی کبھی دو تین جنگل کے وسط میں کہیں نہ کہیں شیر کی ہیبت ناک دھاڑ گونج اٹھتی اور بچوں عورتوں اور بوڑھوں کے دل دہل جاتے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی بندوقچی پے در پے تین چار فائر کر دیتا اور پھر گہری خاموشی طاری ہو جاتی ـــــ جنگل کی پراسرار خطرناک خموشی!

چھٹے روز قافلہ ایک بلند پہاڑی کا چکر کاٹ کر نیچے اترا تو اچانک سامنے سے ایک عظیم الجثہ ہاتھی نکل آیا۔ وہ بانس کے جھنڈوں میں سونڈ ہلاتا نمودار ہوا اور سڑک کے عین بیچ میں آ کر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ اناڑی بندوقچیوں نے نشانہ باندھ لیا۔ لیکن برمی گاڑی بانوں نے انہیں روک دیا۔

"وہ اپنے آپ اٹھ کر چلا جائے گا۔ اتنے بڑے جانور کو مارنا ظلم ہے۔ اور پھر وہ ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔"

قافلہ وہیں رک گیا۔ گاڑیوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں اور بچے سہم کر سمٹ گئے۔ ہاتھی بڑے آرام سے بیٹھا تھا اور چوڑے چوڑے کان ہلا رہا تھا۔ کسی وقت وہ لمبی سونڈ اوپر اٹھا کر زور سے پھنکار مارتا اور پھر اسے نیچے گرا دیتا۔ اس کے جسم کی کھال سکڑی ہوئی تھی۔ اور لمبے لمبے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد ہاتھی صاحب اٹھے پہلے

انہوں نے اگلے پاؤں پر اپنا نصف جسم اوپر اٹھایا۔ پھر پچھلے پاؤں پر ایک دم کھڑے ہو کر دم ہلانے لگے اور اسی طرح دم ہلاتے ہوئے سڑک کے دوسری جانب نیچے اتر گئے۔ اہل قافلہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور برمی گاڑی بان بیلوں کو ہانکنے لگے۔ آٹھویں روز ایک دردناک ناٹک کا آغاز ہوا۔ لوگوں نے صبح صبح رختِ سفر اٹھانے کے کچھ تھوڑی ہی دیر بعد سڑک کی دونوں جانب چند ایک لاشیں دیکھیں۔ ان میں کچھ عورتیں اور چند ایک مرد تھے۔ ان کے سوکھے سوکھے مریل جسم مرنے کے بعد اکڑ کر لمبے ہو گئے تھے اور چہرے اس قدر ڈراؤنے ہو رہے تھے۔ کسان کی طرف دیکھنے سے خوف آ رہا تھا۔ ہر آدمی کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی اور وہ سہمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں وہ اپنا اپنا انجام دیکھ رہے ہوں۔ انہوں نے جلدی جلدی ان لاشوں پر مٹی اور پتھر ڈالے اور آگے چل پڑے۔ دوسرے پہر ایک سوکھے ہوئے جوہڑ کی دلدل میں انہیں پھر کچھ آدمیوں کے مردہ جسم ملے جو کیچڑ اور دلدل میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ہر آدمی اس نئے منظر کی ابتداء پر خوفزدہ آواز میں اظہارِ خیال کرنے لگا۔ بعض آدمیوں کا خیال تھا۔ وہ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر مر گئے ہیں اور کچھ لوگ ان کی موت کو کسی بیماری کا اچانک حملہ تصور کر رہے تھے ان لوگوں کی پراسرار موت میں اختلاف رائے ہو سکتا تھا لیکن اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہ تھا کہ اب ان کے پاس بھی پانی کا ذخیرہ ختم ہو رہا تھا اور دو روز سے کوئی چشمہ راہ میں نہ پڑا تھا۔ خوراک بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ صرف گنتی کے چند لوگوں کے پاس باسی ڈبل روٹیوں کے ٹکڑے محفوظ تھے۔ جنہیں وہ نہایت دور اندیشی سے استعمال کر رہے تھے۔ ہر آدمی کی آنکھوں میں جنگل کی دردناک موت کا نقشہ گھوم رہا تھا۔ اور ہر آدمی

ایک دوسرے سے بیزار ہو گیا تھا۔ اور صرف اپنے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ برمی گاڑی بانوں نے جب قافلے کا راشن ختم ہوتے دیکھا تو انہوں نے چھکڑوں کو اسباب اور عورتوں سے خالی کیا اور واپس چلے گئے ان کا خیال تھا۔ کہ وہ پیچھے آنے والے کسی ایسے قافلے میں چاندی بنائیں گے جن کے پاس کھانے پینے کو کافی ہو گا۔ لیکن انہیں سخت ناامیدی ہوئی۔ اس لیے کہ پیچھے آنے والے قافلے بھی نیم بھوکے اور نیم پیاسے تھے اور ان کے گاڑی بان بھی مصیبت میں ان کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

مجبوراً عورتوں اور بچوں کو پیدل چلنا پڑا۔ مردوں نے صندوق اور بستر اپنے کاندھوں پر اٹھا لیے۔ شام کے سمے جب جنگل میں ایک چٹان کے پہلو میں پڑاؤ ڈال کر الاؤ روشن کیے گئے تو مردوں کے کاندھے اور گردنیں شل ہو گئی تھیں اور عورتوں اور بچوں کے پاؤں سوج گئے تھے۔ اس رات صندوقوں اور بستروں میں سے تمام غیر ضروری سامان مثلاً چینی کے برتن، شیشے کے جگ ریشمی لحاف، گدیلے، کانسی کے تھال، کٹورے، لوٹے، پیتل کے گلاس وغیرہ نکال کر باہر پھینک دیئے گئے۔ اور بہا مان کافی ہلکا کر لیا گیا۔ عورتیں رات بھر اپنے اور اپنے بچوں کے پاؤں پر تیل مالش کرتی رہیں اور مرد بے سدھ ہو کر لکڑی کے تختوں کی طرح پڑے رہے۔ دوسرے دن منہ اندھیرے قافلہ پھر روانہ ہو گیا۔ انور کی داڑھی بڑھ آئی تھی اور چہرے اور ہاتھوں پر مچھروں کے کاٹے کے لاتعداد نشان پڑ گئے تھے۔ سر کے بال خشک ہو کر سوکھی گھاس کی یاد دلا رہے تھے۔ اور خاکی پتلون اور نسواری قمیض کئی جگہوں سے پھٹ رہی تھی بٹالے والے کنبے کا بھی برا حال تھا۔ بوڑھا دو قدم چل کر ستانے کے لیے بیٹھ جاتا تھا۔ اور لڑکوں کی ماں کو پیچش کی بیماری نے آلیا تھا۔ یہ بیماری بری خبر کی طرح سارے قافلے میں پھیل گئی تھی اور ہر آدمی کا رنگ پیلا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ مردہ لوگوں کی لاشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا بلکہ اب ہر دوسرے

فرلانگ پر سڑک کنارے کوئی نہ کوئی بوڑھا یا بوڑھی عورت مری ہوئی مل جاتی تھی تقریباً ہر لاش کا جسم ادھڑا ہوا ہوتا اور پاس سے گزرتے ہوئے سخت بدبو محسوس ہوتی۔ کسی کا پیٹ پھٹا ہوا ہوتا تو کسی کی ٹانگ آدھی چبائی ہوئی ہوتی اور کیڑے چل رہے ہوتے۔ یہ قافلہ ہر لاش پر مٹی کا تیل ڈال کر اسے جلا رہا تھا۔ مگر جب یہ سلسلہ زیادہ بڑھ گیا تو مٹی کے تیل کی بچت کے خیال سے سارا پھونک کی پالیسی ترک کر دی گئی۔ یہ جنگل انتہائی گھنے اور خوفناک تھے۔ اور رات کو بلا ناغہ جنگلی درندوں کی مہیب آوازیں آتی تھیں اور ایک روز بٹالے والا بوڑھا سستانے کے لئے سڑک کنارے پتھر پر بیٹھا اور پھر وہاں سے نہ اٹھ سکا۔ اس کے بیٹے اسے سنبھالتے آگے بڑھے تو وہ لڑھک کر نیچے گہری کھڈ میں غائب ہو گیا سارا کنبہ وہاں رک کر رونے پیٹنے لگا۔ عورتوں نے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بین کرنے شروع کر دیئے۔ بچے کچھ اس دردناک انداز میں روئے۔ کہ لوگوں کے کلیجے ہل گئے۔ قافلہ وہاں ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔ اسی روز تیسرے پہر کسی اور گھرانے کی دو نوجوان لڑکیاں سات روز پیچش میں مبتلا رہ کر مر گئیں۔ اور قافلے کے اگلے حصے کی طرف سے چیخنے چلانے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لوگوں نے ان لڑکیوں کی لاشوں کو گڑھے کھود کر زمین میں دفن کر دیا۔ اس روز قافلہ صرف دس میل کی مسافت طے کر سکا۔

رنگون سے چٹاگانگ کی طرف سفر کرتے ہوئے جب اس چھوٹے سے قافلے کو آٹھ روز گزر گئے۔ تو ان کے پاس پانی کا ذخیرہ بالکل ختم ہو گیا بچے بار بار پانی مانگنے لگے۔ اور مائیں سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے انہیں دلاسا دینے لگیں۔ راستے میں دو ایک چشمے ملے بھی لیکن ان کا پانی خشک ہو چکا تھا۔ اور پتھر کی سلوں کے درمیان کیچڑ اور دلدل میں جونکیں رینگ رہی تھیں۔ ناریل کے درخت کہیں غائب ہو گئے تھے اور ان کی جگہ سپاری کے درختوں نے لے لی تھی۔ اس کے باوجود قافلے میں کئی ایسے لوگ تھے۔ جن کے پاس صندوقوں میں

پانی سے بھری ہوئی بوتلیں بند تھیں۔ دن بھر وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ہر قدم پر پیاس کی شدت کا اظہار کرتے اور ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرتے لیکن رات کے وقت آہستہ سے صندوق کھول کر اس میں منہ ڈالتے اور اندر ہی اندر بوتل کا کاگ کھول کر اس کے ساتھ منہ لگا دیتے۔ جب پیاس ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئی اور بچوں کی آنکھیں اندر کو دھنسنے لگیں تو لوگوں نے ایک جگہ زمین کھودنا شروع کر دی۔ تین گھنٹے کی لگاتار محنت کے بعد زمین نے سوائے مٹی اور پتھروں کے پیاسے انسانوں کو اور کچھ نہ پیش کیا۔ انتہائی مایوسی اور پژمردگی کے عالم میں قافلہ وہیں رک گیا۔ لوگوں میں مزید آگے چلنے کی سکت نہ تھی شام کے سائے گہرے ہو گئے۔ تو آگ روشن کر دی گئی اور تھکے ہارے پیاسے لوگ چادریں تان کر لیٹ گئے۔ بچے ماؤں کی گود میں سسکنے لگے۔ انور بھی ایک طرف زمین پر چپ چاپ لیٹا تھا۔ اور درختوں کی شاخوں میں نظر آنے والے ستاروں کو تک رہا تھا۔ جن پر ان بے یار و مددگار، مصیبت زدہ لوگوں کی بدحالی و درماندگی کا کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح چمک رہے تھے۔ جب سٹی ہال کے عقبی باغ میں کملا اس کی آغوش میں تھی۔ اس نے نفرت سے ستاروں پر ایک طنزیہ نگاہ ڈالی۔

'بے حس، بے روح ستارے،'

اور وہ منہ دوسری طرف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دفعتہً اس کے قریب ہی کہیں سے بوتل میں پانی کے غٹ غٹ کرنے کی آواز آئی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر دیکھا تو اپنے ایک ساتھی کو اس آواز کی موسیقی پر کان کھڑے کیے پایا۔ دونوں کی آنکھیں اندھیرے میں چمکنے لگیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ اٹھ کر اس چشمۂ حیوان کا کھوج لگائیں قریب ہی دو آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کی خوفناک آوازوں نے تقریباً سب لوگوں کو بیدار کر دیا۔ ہر آدمی اس جگہ پہنچ گیا۔ انور نے بڑی مشکل سے انہیں چھڑا کر ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کو قہر آلود

نگاہوں سے تک رہے تھے۔

'آخر بات کیا ہوئی ہے!'

جس آدمی کے ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے آستین سے ناک رگڑتے ہوئے چیخ کر کہا:۔

یہ غدار ہے اس کے صندوق میں پانی کی بوتل ہے۔ ہمارے بچے پیاسے ہیں اور یہ پانی پی رہا ہے۔ اس کا قیمہ کر دینا چاہیئے۔

پانی کی بوتل کا نام سن کر لوگ صندوق پر جھپٹ پڑے۔ پہلے ایک آدمی نے بوتل نکالی۔ اس کے ہاتھ سے جھپٹا مار کر دوسرے نے چھین لی۔ وہاں سے تیسرے اور چوتھے نے حملہ کر دیا۔ اور جب وہ بوتل ایک مدبّر اور لم تڑنگ آدمی کے ہاتھ میں آئی۔ تو اس نے اسے ہوا میں لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

'ہر آدمی کو اس کا حصہ ملے گا۔ میرے بھائیو! ہم سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اگر ہم میں بھائی چارا قائم رہا تو ہم یہ خوفناک سفر طے کر جائیں گے اور اگر ہم نے نفاق سے کام لیا اور ہم میں پھوٹ پڑ گئی تو ہماری لاشیں درندوں کی خوراک بنیں گی۔

ایک طرف سے بڑی ہی ترش آواز آئی۔

ہر آدمی کے صندوق کی تلاشی لی جائے۔ کیا پتہ ابھی کتنی بوتلیں چھپی ہوئی ہیں۔

اس مطالبے کی تائید میں ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ مجبوراً قافلے کے اس وقتی لیڈر کو اعلان کرنا پڑا۔

بہت بہتر اگر سب لوگوں کی یہی رائے ہے تو میں اس کی اجازت دیتا ہوں

لوگوں نے پہلے شرماتے ہوئے مذاق مذاق میں اور پھر بڑی سنجیدگی سے اپنے اپنے ساتھیوں کے صندوقوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ہر تلاشی لینے والا پہلے اپنا صندوق آگے بڑھاتا اور پھر دوسرے کے صندوق کی چابی طلب کرتا کسی کو چابی دینے سے انکار کی جرأت نہ تھی۔ کیونکہ اس کا یقینی طور پر مطلب یہ تھا کہ

اس کے پاس پانی کی بوتلیں موجود ہیں۔ صندوقوں کی تلاشی شروع ہی ہوئی تھی۔ کہ ہر تین منٹ کے بعد کسی نہ کسی طرف سے مسرت کی ایک بلند چیخ کے ساتھ کوئی دیوانہ وار پکار اٹھا :۔

"بوتل — پانی کی بوتل"

آدھ گھنٹہ میں وہاں پچاس کے قریب پانی کے ڈبے۔ چھاگلیں اور بوتلیں جمع ہوگئیں۔ قافلے کے لیڈر نے سب سے پہلے بچوں اور عورتوں میں پانی کے تین تین گھونٹ تقسیم کئے۔ اس کے بعد بوڑھوں کی باری آئی۔ اور پھر نوجوانوں کو دو دو گھونٹ پانی حصے آیا۔ باقی پانی ان ڈبوں۔ بوتلوں اور چھاگلوں میں محفوظ کر دیا گیا اور لم ترنگ لیڈر صاحب نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اگلے روز پہاڑی کے دامن میں ناریل کے چند درخت جھنڈ کی شکل میں دکھائی دیئے ایک منچلا نوجوان دونوں ہاتھ تنے کے گرد لپیٹ کر اچکتا ہوا درخت پر چڑھنے لگا جب وہ عین ناریل کی چھتریوں کے سائے میں پہنچا تو وہاں ایک سیاہ فام ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔ نوجوان کا جسم ایک دم ٹھنڈا ہوگیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ نیچے چھلانگ لگائے سانپ نے پھنکار ماری اور اس کی گردن پر ڈس گیا وہ آدمی پکے ہوئے ناریل کی طرح دھپ سے زمین پر آن گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ اور اس کی ناک اور کانوں سے خون بہہ نکلا۔ لوگ ہراساں ہو کر پیچھے پیچھے ہٹ گئے

"ناگ نے کاٹا ہے — اوپر ناگ ہے۔ اوپر ناگ ہے"

ایک شور سا مچ گیا۔ چند ایک بندوقچیوں نے فائر بھی کیے۔ لیکن اس کے سوا اور کچھ ہوا کہ چند ایک ناریل نیچے گر پڑے۔ وہ مردہ نوجوان انور کی مانند قافلے میں تنہا ہی تھا۔ اور اس کی لاش پر آنسو بہانے والا کوئی نہ تھا۔ انہی ناریل کے درختوں کے سائے میں اس کی لاش کو جو دم بدم نیلی پڑ رہی تھی گڑھا کھود کر دفنا دیا گیا اور قافلہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

۱۴

جوں جوں پردم نزدیک آ رہا تھا لوگوں کے پاس خوراک کا رہا سہا ذخیرہ بھی ختم ہو رہا تھا۔

نہایت احتیاط اور دور اندیشی سے استعمال ہونے والے چاول اور باسی روٹیوں کے ٹکڑے بھی ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ ڈبوں، چھاگلوں اور بوتلوں میں پانی پیندوں تک پہنچ چکا تھا۔ بندوق باز عجیب عجیب قسم کے مکروہ صورت پرندوں کا شکار کرنے لگے تھے۔ رات کے وقت پہرہ دیتے ہوئے کوئی لومڑی یا گیدڑ ان کے قریب سے بچ کر نہ نکل سکتا تھا۔ بٹالے والے خاندان کی عورتیں بچے اور نوجوان لڑکیاں بیمار پڑ گئی تھیں اور ان کے چہروں پر موت ایسی ویرانی چھا رہی تھی یہ دونوں لڑکیاں جوان اور قبول صورت تھیں۔ اور اگر انور انہیں رنگون میں کہیں دیکھتا۔ تو وہ یقیناً ان کی توانائی اور صحت مندی کی تعریف کرتا۔ لیکن وہ دشوار گزار تاریک جنگلوں میں موت کے سفر پر رواں تھا۔ اور کئی روز سے اس نے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا تھا اور پانی نہ پیا تھا۔ یہی حال ان لڑکیوں کا بھی تھا۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ہونٹ سوکھ کر مرجھا رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد نیلے نیلے حلقے نمودار ہو رہے تھے۔

بادلوں میں میل اور مٹی جم رہی تھی۔ کپڑے گندے ہو گئے تھے اور چہروں کے باریک نقوش مچھروں کا ڈنگ کھا کر بھدے ہو رہے تھے۔ وہ الوَر کی طرف یوں رحم طلب نگاہوں سے دیکھتیں گویا کہہ رہی ہوں۔

تمہاری جیب میں جو ڈبل روٹی کا ٹکڑا ہے وہ ہمیں دے دو پردیسی اور الوَر جب کبھی انہیں دیکھتا تو غیر ارادی طور پر اس کی نظریں ان سے پوچھتیں۔

تمہارے سوٹ کیس میں پانی کی بوتل تو نہیں؟

حسن و عشق کی ساری روئداد ڈبل روٹی کے ٹکڑے اور پانی کی بوتل میں سمٹ آئی تھی۔ کیٹس، بائرن، شیلے اور مور کے تمام رومانی نظریات بھیڑ خانے میں بوریئے پر بیٹھے گرسنہ نگاہوں سے پکی ہوئی لال لال روٹیوں کو تک رہے تھے۔ کیٹس۔ نغمہ، بلبل کی تخلیق کر رہا تھا اور نینی اسے مردہ آواز میں پوچھ رہی تھی۔

تمہارے پاس ڈبل روٹی کا ٹکڑا ہوگا؟

تمہارے پاس پانی کے دو گھونٹ ہوں گے؟

کیا حسن بھی ڈبل روٹی کھاتا ہے؟ کیا اسے بھی اگر دو دن روٹی نہ ملے اور گندے جوہڑوں کا پانی پینا پڑے تو پیچش ہو جاتی ہے؟ حسن اور پیچش! او مائی گاڈ!!

الوَر کو ہزاروں، لاکھوں، دیوتاؤں کے بت اپنے اپنے چبوتروں پر لڑکھڑاتے معلوم ہوئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملیں اور جیب سے سگریٹ کا آخری ٹکڑا نکال کر سلگا لیا۔ قافلہ آہستہ آہستہ گھنے جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ لوگوں نے پیچھے کچھ سامان میں سے بھی 'غیر ضروری' اشیا، نکال باہر کی تھیں اور اب کافی حد تک سبکدوش ہو رہے تھے۔ ہر آدمی کا خیال تھا کہ قصبہ شی وے ڈونگ بالکل قریب رہ گیا ہے۔ اور وہاں سے وہ پانی اور خوراک حاصل کر سکیں گے۔ یہی وہ قصبہ تھا۔ جہاں سے قافلے کو دریائے ایراوتی عبور کر کے اراکان کے پہاڑی سلسلوں میں داخل ہونا تھا۔

دسویں روز ایک اور خوفناک منظر دیکھنے میں آیا۔ قافلہ جنگل میں ایک جگہ

پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اور لوگ الاؤ کی روشنی میں ٹولیوں میں بیٹھے، آنے والی آبادی کے خوش نما تصورات پر گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک لم ترنگ لیڈر نے نتھنے سکیڑ کر کچھ سونگھا اور پھر پیشانی سکیڑ کر بولا:۔

کیا تم لوگوں کو بدبو محسوس نہیں ہو رہی؟

اب ہر آدمی خرگوش کی طرح نتھنے پھڑکانے لگا۔ اور انہیں بہت جلد محسوس ہوا کہ وہاں فضا میں نہایت مکروہ قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہر آدمی اس بدبو کی نہایت اصلی پر اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرنے لگا۔ کسی کا خیال تھا۔ قریب ہی کہیں گندگی کا ڈھیر پڑا ہے کوئی کہتا کہیں کوئی گیدڑ یا لومڑ مر گیا ہے۔ ایک لمبی ناک والا مریل سا آدمی بولا:۔

بھائیو!۔۔۔ یہ بدبو ہمارے ہی دماغوں سے اٹھ رہی ہے۔

مگر میر کارِرواں نے کسی کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ جلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا ہاتھ میں لے کر جس طرف سے بدبو آ رہی تھی۔ اس طرف روانہ ہو گیا۔ دیکھا دیکھی کچھ اور بھی آدمی مشعلیں اٹھا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ جنگل کے اندر ایک جگہ پہنچ کر بدبو اس قدر تیز ہو گئی کہ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ ہر آدمی نے منہ ڈھانپ لیا۔ جلتی ہوئی لکڑی کی روشنی میں میر کارِرواں نرکل کی ایک خاردار جھاڑی کی طرف بڑھا جب وہ سنبھل سنبھل کر قدم دھرتا جھاڑی کے عقب میں پہنچا تو ایکا ایکی ٹھٹھک کر کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

اس کے سامنے چند ہی قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ جس کی پچھلی نشستوں پر دو برقعہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں اور اگلی سیٹ پر ایک نوجوان سٹیرنگ پر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ اس کی پیشانی پہیئے گھمانے والے چکر کو چھو رہی تھی۔ عورتوں کے سر پیچھے سیٹ کی پشت سے لگے تھے۔ ان کے چہروں پر نقاب پڑے ہوئے تھے۔ اور معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہیں جیپ کی چھت غائب تھی۔ اور بونٹ کا اگلا حصہ جھاڑیوں میں الجھا ہوا تھا۔ دوسرے

لوگ بھی مشعلیں پکڑے وہاں پہنچ گئے تھے اور حیرت و استعجاب کے عالم میں اس منظر کو تک رہے تھے۔ اب وہاں کافی روشنی ہوگئی تھی اور نوجوان ڈرائیور کی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کا سنہری فیتہ چمک رہا تھا۔ میر کارروان نے آگے بڑھ کر ڈرائیور کے کندھے کو آہستگی سے ہلایا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جلتی ہوئی لکڑی آگے کی اور ڈر کر پیچھے ہٹ آیا۔ ڈرائیور مر چکا تھا۔ اور اس کا مردہ جسم جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔ پھر وہ عورتوں کے قریب گیا اور ان کے چہروں پر سے نقاب ہٹا دیئے۔ میرے خدا! ان کے چہروں پر چھوٹے چھوٹے جونک نما لاتعداد کیڑے کلبلا رہے تھے۔ وہ سہم کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جیپ کو الٹا کر اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ آگ کے زرد زرد، سُرخ سُرخ شعلے بگولوں کی مانند اوپر کو اٹھے۔ سارا جنگل روشن ہوگیا درختوں میں سوئے ہوئے جانور پھڑپھڑا کر شور مچاتے اڑ گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں جیپ راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ رات بھر قافلے میں کوئی نہ سو سکا۔ اور اس اذیت بخش حادثے پر خیال آرائیاں ہوتی رہیں۔

بارہویں روز یہ سوجے ہوئے گرد آلود پاؤں، بگڑے ہوئے ویران چہروں پھٹے ہوئے بوسیدہ کپڑوں اور مرجھائی ہوئی بھوکی پیاسی آنکھوں والا قافلہ سال اور جھالسری کے تاریک جھنڈوں سے باہر نکلا تو اسے سامنے ایک سرسبز شادات وادی دکھائی دی جہاں دور تک دھان کے ہرے بھرے کھیت لہرا رہے تھے۔ کھیت آبادی کے نشان ہوتے ہیں وادی پر نگاہ پڑتے ہی ہر آدمی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور منہ سے ہلکی سی خوشی کی چیخ نکل گئی ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں کھل تھیں اور کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ کھیتوں میں جھومنے والے دھان کے خوشوں کو اس ملزم کی طرح تک رہے تھے جو پھانسی کی سزا سے بری ہونے کے بعد پہلی بار اپنے بچوں سے مل رہا ہو۔ قافلے میں ہر طرف زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ آدمی بھی کھیتوں کی طرف دوڑنے لگے۔ نہ معلوم یہ طاقت

ان ٹانگوں میں کیوں سرایت کر گئی تھی۔ فضا میں دریا کے اگنے والی جھاڑیوں کی مرطوب خوشبو رچی ہوئی تھی۔ دھوپ خوشگوار تھی اور دور آبی پرندوں کی اڑتی ہوئی قطاریں اس بات کا یقین دلا رہی تھیں کہ دریائے ایراوتی قریب ہی بہہ رہا ہے۔ سڑک بتدریج چوڑی اور پختہ ہوگئی۔ اور کہیں کہیں دیہاتی لوگ کھیتوں میں کام کرتے دکھائی دینے لگے۔ کئی لوگ بچوں کی طرح کھیتوں میں اتر گئے۔ اور وہاں اچھلنے کودنے لگے۔

قصبہ تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ اور سڑک کنارے ناریل کی کھپریلوں کی جھونپڑیاں شروع ہوگئی تھیں۔ جن کے دروازوں پر بڑی عورتیں بچے اور مرد کھڑے گزرتے ہوئے قافلے کو دل چسپی سے تک رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی وہاں سے کئی قافلے گزرے تھے۔ اور انہوں نے ہر قافلے کو اسی طرح درماندہ و بدحال اور بے یار و مددگار پایا تھا۔

پردم سے سو میل ادھر، قصبہ شئی دے ڈونگ دریائے ایراوتی کے کنارے آباد تھا۔ اور دو تین ہزار گھرانوں پر مشتمل تھا۔ بانس و ناریل کے پتوں سے بنی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان گزرنے والی گلیاں اور بازار ٹیڑھے میڑھے ننھے چھوٹی چھوٹی کئی ایک دوکانیں تھیں۔ جہاں زیادہ تو سوکھی اور تازہ مچھلیوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ دریا کے کنارے کئی ایک قافلے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے انور بھی قافلے کے ہمراہ رک گیا۔ یہ قافلہ دو روز تک وہاں ٹھہرا رہا۔ اس دوران میں لوگوں نے جی بھر کر نہایا۔ کپڑے دھوئے دن میں کئی کئی بار پانی پیا۔ اور اُبلے ہوئے چاولوں کے ساتھ مچھلی کھائی۔ اور ہیضے کا شکار ہوئے۔ انور نے ایک بوڑھے برمی درزی کی دکان میں جا کر اپنی قمیض اور پتلون کی مرمت کروائی۔ موچی کے ہاں جوتوں پر نیا لکہ اور ایڑیاں لگوائیں۔ بال کٹوائے اور داڑھی منڈائی۔ سگار خریدے اور قصبے کے بازاروں میں نئے بھرتی شدہ جوان کی طرح چکر لگانے لگا۔ ایک جگہ بازار کا موڑ مڑتے ہوئے اسے کسی دوکان میں ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

اجی گور کھوا ایسے سفر میں فراب ایسے ہی ہے۔ جیسے انجمن میں بھاپ کیا آپ نے میری جد وجہد نہیں پڑی۔

وہ کیا ہے؟

ہٹلر کی سوانح عمری ہے۔

انور نے رک کے دوکان کے اندر نگاہ ڈالی۔ وہی بھاری بھرکم سردار صاحب جو اسے رنگون آتے ہوئے شنگھائی جاتے جہاز میں ملے تھے۔ دوکاندار سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ انور کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اس نے سگار منہ میں دبایا۔ اور ٹہلتا ہوا سڑک کا موڑ گھوم گیا۔

تیسرے روز انور کے قافلے میں ہر آدمی تازہ دم تھا۔ جسے مرنا تھا وہ مر چکا تھا۔ اور باقی لوگوں نے چاول۔ مچھلی۔ تمباکو۔ پانی بھنے ہوئے چنوں اور نمک مرچ کا بھاری ذخیرہ ساتھ لے لیا تھا۔

نیل دریا پار بیل گاڑی چل چلنے کی گہری توقع تھی۔ ایراوتی کا پاٹ یہاں میدانی علاقہ ہونے کے باعث کافی وسیع تھا اور دوسرے کنارے کے درخت جھاڑیوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ برمی کشتی بان اور ماہی گیروں کی چاندی تھی۔ وہ بڑے بڑے ڈونگوں میں ڈنڈا لئے کھڑے تھے۔ اور ان کے دلال لوگوں سے سودا کر رہے تھے۔ لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ کشتیاں پلک جھپکنے میں مسافروں سے بھر جاتی تھیں۔ مانجھی پار اتارنے کے فی سواری دس روپے وصول کر رہے تھے۔ اور امیر لوگ بیس بیس روپے دیکر سب سے پہلے سوار ہو رہے تھے۔ کئی لوگوں نے ڈونگے ریزرو کرا لئے تھے اور غریب آدمی بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ وہ مانجھیوں سے کرایہ کم کرنے کی التجا کرتے لیکن وہ دوسری طرف گھما لیتے۔ دراصل انہیں اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ ان احمقانہ التجاؤں پر اپنا وقت ضائع کرتے۔ انور جس کشتی میں سوار ہوا وہ پہلے ہی مسافروں سے لدی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی ٹھنگنے قد کے گندمی چہرے والے برمی مانجھی نے کشتی کے سر پر کھڑے ہو کر ڈنڈا پانی میں ڈالا اور اوپر جھک گیا

کشتی دھیرے دھیرے کھسکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا مانجھی بھی ڈنڈا اٹھا کر کشتی کے سرے پر پہنچ گیا۔ اور کشتی میں رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ ایراوتی کی مٹیالی لہریں کشتی سے ٹکرا رہی تھیں اور سر پر سورج چمک رہا تھا۔ دریا کے وسط میں پہنچ کر ہوا گرم ہو گئی اور پسینے آنے لگے دریا کا پاٹ عبور کرتے وقت قریباً پون گھنٹہ لگا۔ دوسرا کنارا ابھی قریباً پہلے کنارے کی طرف تھا۔ یہاں بھی لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اور ہر آدمی اپنا اپنا سامان دیکھ رہا تھا۔ کنارے کنارے تاڑ اور ناریل کے درختوں کی میڑھی قطار دور تک چلی گئی تھی جن کے درمیان پتلی سی راہگذر پر بے شمار بیل گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اور لوگ اس میں سامان رکھوا رہے تھے۔ اور بچوں کو سوار کروا رہے تھے۔ تین میل کے آگے جا کر یہ راہگذر دریا چھوڑ کر جنگل میں گھوم گئی تھی۔ دور اراکان کی پہاڑیوں کے منحنی سلسلے پھیلے دکھائی دے رہے تھے۔ کنارے پر اتر کر انور لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکل آیا۔ اور یونہی ذرا ٹانگیں کھولنے کے لئے ایک طرف ٹہلنے لگا۔

وہ دریا کے بہاؤ کی طرف کافی آگے نکل گیا۔ سرسبز جنگلات کا سلسلہ یہاں دریا کی طرف سمٹ آیا تھا۔ اور جگہ جگہ ناریل کے درختوں کے بیچ سایہ دار پیڑ دریا پر اُگے کو جھکے ہوئے تھے۔ جن کی جھولتی ہوئی ٹہنیاں ایراوتی ہو کی لہروں کا منہ چوم رہی تھیں۔ لوگوں کا شور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آسمان گہرا نیلا تھا۔ دھوپ چمکیلی اور خوشگوار تھی۔ اور دریا کی طرف سے آنیوالی مرطوب ہوا کے جھونکے کبھی گرم تھے تو کبھی خشک ـــــ یہاں سے بھی گزرے ہوئے انور اور آگے نکل آیا۔ اب اسے دور کنارے پر دو تین آدمی دکھائی دے رہے تھے۔ قریب ہی ایک سمپان چھوٹی کشتی پانی میں کھڑی تھی۔ لمبی بلیوں پر جال تنے ہوئے تھے۔ اور وہ آدمی جن کے گندمی جسم دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان پر جھکے ہوئے تھے۔ ذرا پرے درختوں کے میدان سے دھواں اڑ رہا تھا۔ ایک عورت ہاتھ میں غالباً رسیوں کا گچھا لئے درختوں سے باہر نکلی۔ اور ان آدمیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے رسیوں کا گچھا کپال میں ڈالا اور دائیں چلتی ہوئی انہی درختوں میں گم ہو گئی انور دریا کنارے

سے ہٹ کر جنگل میں سے گزرتی ہوئی ایک پتلی سی پگ ڈنڈی پر ہو لیا۔ یہاں درختوں کے سایوں میں گہری ٹھنڈک اور سکون تھا۔ لمبی گھاس میں تتلیاں گھوم رہی تھیں۔ اور درختوں میں پرندے آرام کر رہے تھے۔ چلتے چلتے انور کو بائیں جانب اونچے سے ہموار ٹیلے پر کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں جن کے دروازوں پر کیلے کے چوڑے پتے اپنا سایہ ڈالے ہوئے تھے۔ ایک طرف چھوٹے سے باڑے میں لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ذرا پرے درختوں کے نیچے رسیاں باٹنے کی چرخی لگی ہوئی تھی۔ جھونپڑیوں کے پاس چند ایک ننگ دھڑنگ لڑکے کھیل رہے تھے اور چھوٹے سے برامدے میں سفید بالوں والی بوڑھی عورت لکڑی کے ستون سے ٹیک لگائے لمبا سفید سگار پی رہی تھی۔ انور جونہی وہاں کھڑا اس جگہ کے پُرسکون اور پُرمحبت ماحول کا لطف اٹھا رہا تھا کہ بالکل سامنے والی جھونپڑی کا چوبی دروازہ کھلا اور ایک لڑکی بالٹی لئے باہر نکلی۔ اس نے برامدے میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورت سے ہنس کر کوئی بات کہی۔ جسے انور بالکل نہ سن سکا۔ وہ ہنستی ہوئی ٹیلے سے نیچے اتر آئی انور کا خیال تھا کہ وہ دریا پر پانی لینے جا رہی ہے۔ اور وہی سے پرلی طرف گھوم جائے گی۔ جب وہ اس پگ ڈنڈی پر ہو لی۔ جس پر انور کھڑا تھا تو وہ درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے خواہ مخواہ دوسروں کے گھر میں جھانکتا ہوا دیکھے۔ برمی لڑکی نے سرخ لہنگا باندھ رکھا تھا۔ اور مکڑی کی چھوٹی بالٹی ہاتھ میں لئے چھوٹے چھوٹے متوازن قدم اٹھاتی پگ ڈنڈی پر اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بار بار جھاڑیوں اور درختوں کی لٹکی ہوئی شاخوں کی آڑ میں چھپ جاتا تھا۔ نہ جانے انور کو کیوں اس کی چال مانوس سی معلوم ہوئی۔ اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ کون چلی آ رہی تھی جنگلی پگ ڈنڈی پر یہ کس کے قدم اس قدر آہنگ کے ساتھ اٹھ رہے تھے انور درخت کی اوٹ میں غور سے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی اب قریب آ چکی تھی۔ اور جب وہ بالکل ہی قریب آ گئی تھی۔ انور کے پاس سے ہو کر گزرنے لگی تو اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

ساتیں.....؟

ساتیں گرتے گرتے سنبھلی۔ گویا کسی نے چلتی گاڑی کی زنجیر کھینچ دی ہو۔ اسے کس نے پکارا تھا؟ اس کی آواز میں بھولی بسری محبت کی ملول سرگوشی تھی۔ یہاں اسے اس لہجے میں کبھی کسی نے آواز نہ دی تھی۔ وہ ایک دم رک گئی۔ اور اس کا ننھا سا دل جلدی جلدی دھڑکنے لگا۔ اور پھر اس کی شبنمی نگاہوں نے درخت کے پاس انور کو کھڑے دیکھا۔ اس کے اداس چہرے پر ایک طویل سفر کی مصیبتوں کے نشان تھے۔ اور وہ محبت کی کبھی نہ بھولنے والی خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ساتیں بالٹی وہیں پھینک پھانک کر انور کی طرف لپکی اور وفا شعار بیوی کی طرح اس سے لپٹ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو ابل پڑے جیسے وہ ایک مدت سے اس کی جدائی کے صدمے سہہ رہی تھی۔ اور انہیں بڑی دیر سے ایک دوسرے کا انتظار تھا۔ وہ بڑی دیر تک ایک دوسرے کی آغوش میں اپنی اپنی محبت کا منہ چومتے رہے اور انہوں نے کوئی بات نہ کی۔ وہ کچھ نہ بولے۔ ان کے لب بند تھے۔ زبانیں گنگ تھیں۔ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ اور وہ سورج مکھی کے پھولوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف منہ اٹھائے محبت کی سنہری کرنوں سے لو حاصل کر رہے تھے۔ وہ خاموش تھے۔ لیکن ایک دوسرے کی خاموشی سن رہے تھے۔ سمجھ رہے تھے ساتیں نے کہا۔

آپ رنگون سے پیدل آ رہے ہیں؟ آپ نے یہ سفر کیسے طے کر لیا؟ میں نے جب سنا کہ آپ کے مکان پر بم گرے ہیں تو میں اسی دن مر گئی تھی۔ آج آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے نئی زندگی ملی ہے؟ لیکن آپ یہاں کیسے آ گئے۔ قافلے تو اس راہ سے گزر رہے ہیں۔

تمہاری محبت مجھے یہاں کھینچ لائی۔

اونہیں جناب ـــــ ایسا نہ کہیں۔ میری محبت اس قابل نہیں۔ وہ تو مچھیروں کے جال کی مانند ہے جسکے اندر پانی کبھی نہیں ٹھہرتا۔

لیکن ساتیں تم یہاں کہاں؟ تمہاری ماں اور باپ .....

ساتیں کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ اس نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا۔ وہ لوگ کلا بستی میں تھے۔ میں موسی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ جب واپس آئی تو ہمارا سارا محلہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ میرا بھائی بھی ورکشاپ میں بم گرنے سے مارا گیا ـــــ جناب! میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ ماسی یہاں مجھے اپنے رشتہ داروں کے ہاں لے آئی ہے۔ خدا میرے گناہ معاف کرے ـــــ

انور ساتیں کو پیار بھرا دلاسا دینے لگا۔ اسے اس کے خاندان کی تباہی کا حال سن کر واقعی دکھ ہوا تھا۔ جب ساتیں کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو اس نے دھلی دھلائی شفاف آنکھوں سے انور کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہونٹوں سے کہا میں کنویں سے پانی لے آؤں۔

دونوں پانی لینے کنوئیں پر پہنچے۔ ساتیں نے رسی کے ساتھ بالٹی باندھ کر کنوئیں میں لٹکا دی۔ اور انور کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ انور نے رسی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور بالٹی اوپر کھینچنے لگا۔ ساتیں نے منہ بنا کر کہا۔

آپ اس روز جھیلوں والے باغ میں کیوں نہیں آئے تھے؟

انور نے بالٹی کنوئیں کی منڈیر پر رکھ کر ساتیں کا چھوٹا سا زرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میں آیا تھا ساتیں اور میں نے تمہارا ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کیا۔ لیکن تم نہ آئیں میں بھی آئی تھی۔ لیکن آپ جھیل کنارے کسی لڑکی کے بالوں میں پھول لگا رہے تھے۔

انور کو سارا منظر یاد آگیا۔ اس نے ساتیں کو اپنے قریب لاتے ہوئے حیرت سے کہا۔

لیکن ـــــ لیکن ساتیں تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں۔

ساتیں زمین کو تکنے لگی۔

میں نے سوچا آپ ناراض ہوں گے۔

پگلی میں اس وقت بھی تمہارے بالوں میں پھول سجا رہا تھا۔

ساتیں نے چہرہ اٹھا کر انور کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کنول کے لاتعداد پھول کھِل رہے تھے۔ جب وہ بالٹی لئے واپس آرہے تھے تو ساتیں نے کہا۔

آپ کچھ روز ہمارے ہاں رک جائیں قافلے تو جاتے ہی رہیں گے

ٹھیک ہے ساتیں مگر میری بوڑھی ماں غم سے پاگل ہو جائے گی۔

ساتیں چپ ہو گئی۔ اس نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

انور نے دل میں سوچا اگر وہ پانچ دس روز یہاں ٹھہر بھی جائے تو اس میں کیا ہرج ہو گا؟ وہ کسی بھی قافلے میں شریک ہو سکتا ہے۔

ساتیں! میں نے تمہیں بم باری سے تھوڑا عرصہ پہلے میٹرو سینما کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ تمہارے ساتھ غالباً ـــــ

جی ہاں میری ماں تھی۔ ہم اس روز بازار کپڑا خریدنے جا رہے تھے۔

تو پھر آپ نے مجھے بلایا کیوں نہیں؟

مجھے بدقسمتی سے سڑک کے اس پار ٹریفک سگنل کے لئے رکنا پڑا جب تک تم لوگ جا چکے تھے ـــــ ایک بات اور ہے ساتیں۔

جی ـــــ پوچھیئے

تمہاری والدہ کہاں کام کرتی تھیں؟

بیرسٹر ماتھر صاحب کے ہاں۔ وہی جن کی لڑکی کے بالوں میں آپ اس روز پھول لگا رہے تھے۔

خوب ـــــ انور نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

اب وہ جھونپڑیوں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ انور نیچے ہی رک گیا۔ ساتیں نے ٹیلے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے بھی اوپر آنے کو کہا۔ برآمدے میں

بیٹھی ہوئی عورت نے سگار پرسے ہٹا کر نیچے دیکھا اور ساتیں کے ساتھ اجنبی نوجوان کو دیکھ کر حیران سی رہ گئی۔ ساتیں نے پانی کی بالٹی فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔ موسی یہ ہمارے بیرسٹر مانھر صاحب کے لڑکے ہیں۔ رنگون سے قافلے کے ساتھ آئے ہیں۔

انور اس بھولی بھالی معصوم لڑکی کی اس چالاکی پر حیران رہ گیا۔ اور اسے خواہ مخواہ محسوس ہونے لگا۔ گویا ساتیں نہایت تجربہ کار عورت ہو۔ ساتیں کی موسی نے مسکرا کر انور کو دیکھا اور کہا۔

بیٹا تم برمی جانتے ہو؟

جی ہاں۔

خوب۔ خوب بڑھیا ہنسنے لگی اور سگار منہ میں دبا لیا۔

ساتیں انور کو اندر لے گئی۔ جھونپڑی اندر سے کافی کھلی تھی۔ اور ہر شے بڑی صفائی اور سلیقہ سے لگی تھیں۔ کنڈیوں کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے والے جال لٹک رہے تھے۔ مٹی کے چبوتروں پر ناریل کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ اور پرچھتیوں پر لکڑی کے برتن سج رہے تھے۔ کونے میں بانس کی ٹوکریاں رکھی تھیں۔ اور چھت کے ساتھ سوکھی مچھلیوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ ساتھ ہی چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ جہاں ناریل کے پتروں کا بہت بڑا جھال چاولوں سے بھرا ہوا تھا۔ پیاز اور لہسن کی گنٹھیاں دیواروں کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھیں۔ بڑے کمرے میں مہاتما بدھ کی چھوٹی سی مورتی رکھی تھی۔ جس کے گلے میں پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ لکڑی کے بہت بڑے صندوق پر بستروں کے گٹھڑ پڑے تھے۔ اور چولہے کے پاس ایک آدھ جلا سگار یونہی رکھا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی بوڑھی عورت کے پاس چٹائی پر دوزانوں بیٹھی سنہرے لہنگے پر غالباً پھول کاڑھ رہی تھی۔ ساتیں نے انور کا تعارف کرایا۔ بوڑھی عورت نے گھور کر انور کو دیکھا اور نوجوان لڑکی شرما کر مسکرانے لگی۔

شام ہونے تک ساتیں کے خالہ زاد بھائی اور کچھ بڑے اور بوڑھے بھی

وہاں آ گئے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے انور سے ہاتھ ملائے اور رنگون شہر کی بربادی کے قصے سننے لگے۔ تازہ مچھلی اور اُبلے ہوئے چاول کھا کر وہ لوگ جھونپڑیوں کے باہر چٹائیوں پر آن بیٹھے۔ اور لیمپوں کی مدھم روشنی میں کوئی ادھڑا ہوا جال مرمت کرنے لگے۔ کسی نے سگار سلگا کر پڑوس کے مانجھیوں کی بے پناہ آمدنی پر اپنے حاسدانہ خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اور کوئی قافلوں کی وجہ سے لنگی کے بازاروں میں چڑھی ہوئی قیمتوں کا رونا لے بیٹھا۔ عورتیں برتن صاف کر کے بستر بچھا رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں اپنی ماؤں کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ بچے ذرا پرے رسیاں بانٹنے والی چرخی سے کھیل رہے تھے۔ ساتیں اپنی موسی کے سر میں ناریل کے تیل کی مالش کر رہی تھی۔ اور انور نوجوان اور بوڑھے ماہی گیروں کی منڈلی میں بیٹھا انہیں رنگون سے بچ نکلنے کی داستان سنا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ سب کی آنکھیں بچا کر ساتیں کو بھی دیکھ لیتا جس کے گول گول زرد رخساروں پر لیمپ کی مدھم روشنی کانپ رہی تھی۔ کسی وقت دونوں کی نگاہیں بیک وقت مل جاتیں۔ اور وہ دل ہی دل میں مسکرانے لگتے۔ ساتیں جوشِ مسرت میں موسی کا سر زور زور سے ملنے لگتی اور بڑھیا بلبلا اٹھتی۔

اری لڑکی تجھے کیا ہو گیا ہے؟

ساتیں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور اس کی موسی پژمردہ پپوٹے اٹھا کر اسے حیرت سے تکنے لگی۔ اس سے پیشتر اس نے ساتیں کو کبھی اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔

۱۵

انور کا خیال تھا کہ وہ پانچ چھ روز وہاں رہے گا۔ اور پھر کسی قافلے میں شامل ہو کر چٹاگانگ چل دے گا۔ لیکن دریا کنارے کی اس چھوٹی سی بستی میں ساتیں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے دو ماہ گزر گئے۔ اور وہ ان لوگوں سے جدا نہ ہو سکا۔ اور وہ ان دور افتادہ امن پسند ماہی گیروں میں بالکل گھل مل گیا تھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنا اُسے سکھانے۔ جال مرمت کرنے بلیاں گاڑنے، رسیاں بانٹنے، لکڑیاں کاٹنے، ناریل کاٹنے۔ ان کی چھال اتار کر بوریوں میں بھرتے اور انہیں شی دے ڈونگ قصبے کی منڈی تک لے جاتے میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ بستی کا ہر آدمی اور عورت اسے محبت سے بلاتی تھی۔ ساتیں کے ساتھ اس کا میل ملاپ کسی کو ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اس لئے کہ وہاں کوئی بھی نوجوان ایسا نہ تھا جو کسی لڑکی کے ساتھ میل ملاپ نہ رکھے ہوئے ہو۔ اس نے انہیں لوگوں کی وضع قطع اختیار کر لی تھی۔ وہ سارا دن پتلون گھٹنوں پر چڑھائے کسی نہ کسی کام میں جٹا رہتا۔ اور جب شام کو دوسرے ماہی گیروں کے ساتھ جال کندھے پر رکھے بستی میں داخل ہوتا تو فرطِ مسرت سے ساتیں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اسے یوں معلوم ہوتا گویا وہ اسی ماحول کا جزو ہو۔ اور اس نے انہیں جھونپڑیوں

میں کسی گھاس پھوس کے بستر پر جنم لیا ہو۔ انور نے بھی اپنے تئیں اس ماحول میں جذب کر لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ بالکل ہی انہی میں سے ایک ہو کر رہ گیا تھا۔ آگے چل کر یہ زندگی کا کیا ڈھنگ اختیار کرے گی۔ اس پر اس نے کبھی غور نہ کیا تھا۔ جس ڈھنگ میں دن گزر رہے تھے۔ اس کے لئے وہی کافی تھا۔

اس دوران میں ساتیں اس کے بے حد قریب آگئی تھی۔ وہ اس کے میلے کچیلے کپڑے دھوتی۔ پھٹے ہوئے کپڑے مرمت کرتی۔ ہر رات اس کا بستر بچھاتی وہ جو بھی کام کر رہا ہو اس کا ہاتھ بٹاتی۔ اور کسی وقت اگر وہ تھک کر ستانے کے لئے گھاس پر بیٹھ جاتا تھا تو وہ سب کی نظریں بچا کر اس کے پاؤں تک دبانے لگتی۔ پھر انور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتا۔ اور اس کی طرف جھک کر کہتا۔

ساتیں یہ ہاتھ کنول کے پھول سے بھی زیادہ نازک ہیں۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا کہ ساتیں ان ہاتھوں سے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں دھونے سے لے کر جال کھینچنے تک کا کام لیتی ہے۔ اور وہ سمپان کے چپوترے سے بھی سخت اور محنتی ہاتھ تھے۔ پھر جن لڑکیوں سے محبت ہوا نہیں اسی طرح کہا جاتا ہے۔ ابھی وہ زمانہ نہیں آیا جب لڑکیاں سچی باتیں سننے کے باوجود لڑکوں سے محبت کیا کریں گی۔

ساتیں کی موسی کے رشتہ دار اس میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے تھے انہوں نے اسے بالکل نوکرانی سمجھ رکھا تھا۔ اور ہر عورت اس سے کوئی نہ کوئی کام لیتی تھی۔ اس کی موسی بہت بڑی ہو چلی تھی۔ اور اسے بہت بڑے ستون سے لگ کر سگار پینے اور رات کو کھانسنے رہنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا ساتیں اس ہر حکم بجا لانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ بوڑھیا اگر آدھی رات کو دریا کا پانی پینے کی خواہش ظاہر کرتی تو ساتیں جھٹ چٹائی سے اٹھ کر بالٹی ہاتھ میں لئے دریا کی سمت روانہ ہو جاتی۔ چاندنی راتوں میں جب اس کے بھائی بند مچھلیوں سے بھرا ہوا جال کنارے پر کھینچ لاتے۔ تو ساتیں ٹوکری لے کر سب سے پہلے وہاں پہنچ جاتی رسیاں بانٹتے ہوئے سن کی جٹاؤں کا جال پھیلائے دوپہروں چرخی گھماتی اور اس کے بازو نہ تھکتے۔ رات

کو نہ صرف انور بلکہ کنبے کے تمام افراد کی چٹائیاں باہر لیجاتی اور ان پر چادریں پھیلا دیتی۔ چائے اور کافی کے لئے پانی ہر دم چولہے پر گرم رہتا کیونکہ اس کی موسی اور دوسری رشتہ دار بوڑھیا ایک بڑی آفت کی پڑیا تھی۔ پہلے ہی روز جب اس نے انور کو گھور کر دیکھا تھا تو وہ ڈر گیا تھا۔ اس عورت کا کام دوسرے گھرانوں کی لڑکیوں کے کیڑے نکالنا تھا۔ وہ بلاناغہ ہر جھونپڑی کا چکر لگاتی۔ اور ہر دوسری عورت کے سامنے پہلی عورت کی برائی لے بیٹھتی۔ اس کا نام دومیا تھا۔ اور وہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی اپنی بیٹی بے حد نیک دل لڑکی تھی۔ اور اس کے خیالات پر اپنی ماں کا ذرا برابر بھی اثر نہ تھا۔ ساتیں اور وہ آپس میں بڑی گہری سہیلیاں تھی اور جب اسے پتہ چلا کہ ساتیں اور انور ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو وہ ان دونوں کا بڑا خیال رکھنے لگی تھی۔ لیکن اس کی ماں کو ساتیں اور انور کا میل ملاپ سخت ناگوار تھا۔ اور اس نے ساتیں کی موسی کو اپنے جذبات سے آگاہ بھی کر دیا تھا مگر وہ سگار پینے والی نشئی بڑھیا سر جھکا کر چپکی ہو رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے خاوند اور لڑکوں سے یہ بات نہ کرنا چاہتی تھی کیونکہ پھر لڑائی جھگڑے کا اندیشہ تھا۔ اور انور کی جیب میں ابھی کچھ روپے باقی تھے۔ انور وہاں کام کرنے کے باوجود سویں پندرھویں اس عیار بڑھیا کو کچھ نہ کچھ دے دیتا تھا۔ جسے وہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی تھی۔ روزمرہ تعلقات میں وہ انور سے ہنس کر بات کرتی لیکن انور اس ہنسی کے نقاب میں چھپی ہوئی نفرت سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس نے اس چھپی ہوئی خطرناک نفرت کا ذکر ساتیں سے بھی کر دیا تھا۔ ساتیں یہ سن کر کانپ سی گئی تھی لیکن پھر بڑے پُر عزم انداز میں اس نے انور کو یقین دلایا تھا کہ جب تک ان کی محبت مخلص ہے اور ناریل کے پھول کی طرح بے داغ ہے برائی کی کوئی طاقت ان کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی۔ اور انہیں کسی سے خوف نہیں کھانا چاہیئے۔ انور اس بھولی بھالی کمزور سی لڑکی کی زبان سے ایسے دلیر خیالات سن کر دل ہی دل میں کچھ نحیف سا ہو گیا تھا اس کی نگاہوں میں ساتیں کی عزت پہلے سے دوچند ہو گئی تھی

جب چاندنی راتوں میں ایراوتی کی لہریں چاند کے عکس کو اپنے دل میں چھپا لیتیں اور کنارے کنارے گیلی ریت کے حاشیئے چمکنے لگتے اور انور ساتیں اپنے بھائی بندوں کے ساتھ دریا میں جال ڈال رہے ہوتے۔ تو وہ دونوں سمپان کھیتے ہوئے دریا کے پاٹ میں بہت آگے نکل جاتے اور اس جگہ پہنچ جاتے جہاں نیلگوں چاندنی کے کنارے کے جنگلوں میں گہری خموشی چھائی ہوئی۔ اور چمکیلی لہریں اٹھا ٹھ کر محبت کرنے والے گداز دلوں سے کوئی سوال پوچھنا چاہتیں انور چپو چلا رہا ہو۔

چھلک ـــــ چھلک ـــــ چھلک

ساتیں لہروں میں پاؤں ڈالے دور کناروں پر چھائی ہوئی پراسرار دھند پر نظریں جمائے ہوتی ایراوتی کی میٹالی لہریں اس کے ننھے ننھے گورے ٹخنوں کو چومتی ہوئی آگے نکل جاتیں۔ دریا کے بہاؤ کی طرف دور ـــــ سرسبز اور اونچے اونچے پہاڑوں پر پھیلی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی واہمہ سا معلوم ہونے لگتی۔ اور انور کو محسوس ہوتا ساتیں بھی محض ایک واہمہ ہے۔ جو پہاڑوں پر پھیلی ہوئی نیلگوں دھند کی طرح ابھی فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔ اور وہ تنہا ـــــ بالکل تنہا رہ جائے گا ساتیں چمکیلی اور خاموش نگاہوں سے انور کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اس کے نیم وا باریک ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی لکیر جگمگاتی۔ اور وہ سرگوشی میں انور سے کہتی۔

"ایک گیت سناؤں؟"

انور اس سے بھی زیادہ مدھم آواز میں گویا اپنے آپ سے ہم کلام ہو کر کہتا ہاں ساتیں۔

اور ساتیں بڑے سیدھے سادھے سروں اور دھیمی آواز میں گویا ایراوتی کی لہروں کا صدیوں پرانا گیت سنانے لگتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ وہ گیت نہیں گا رہی بلکہ ایراوتی کی لہروں سے باتیں کر رہی ہے۔

ایراوتی، اری او ایراوتی!

میں تیری لہروں پر دن بھر ناؤ کھیتا ہوں۔
تیری لہروں میں میرے آنسو ہیں۔
تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ایرادتی کی لہر!
دریا کے اس موڑ پر یا پہاڑ پر
جہاں سے ایرادتی نکلتی ہے۔؟
تم ٹھہرو گے نہیں؟
ہماری باتیں سنو گے نہیں؟
ہم ہیں ایرادتی کی لہریں۔

انور کے ہاتھوں میں چپو تھم جاتے۔ اسے محسوس ہوتا گیت کے بول بادلوں کی مانند کشتی کے اوپر باہیں پھیلا کر تن گئے ہیں۔ اور سمپان اپنے آپ بہی جا رہی ہے۔ ساتیں چپ ہو جاتی۔ اور اس کی مدہم آواز دریا کی مسلسل سرگوشی میں گم ہو جاتی وہ آہستہ سے ساتیں کو اپنی آغوش میں لے لیتا۔ اور کنول کی نازک پتیاں شبنم کے بوجھ سے کانپنے لگتیں اور اپنی ریشمی پلکیں جھکا لیتیں اور ان پیگو یاما کی ان برف پوش چوٹیوں پر نکل جاتا۔ جہاں سورج طلوع ہوتا ہے۔ جہاں سے ایرادتی نکلتی ہے اور جہاں اس کی سندر لہریں ناچنا سیکھتی ہیں۔ اور ان لہروں پر جھک جاتا۔ ور چپکے سے کہتا۔

ایرادتی ـــــ میری مجبور ایرادتی۔
تیری لہروں میں میرے آنسو ہیں۔

جاپان کو جنگ کی آگ میں کودے تیسرا مہینہ جا رہا تھا۔ اور اس دوران میں اس کی فوجیں۔ سنگاپور ملایا اور ہند چینی میں داخل ہو چکی تھیں رنگون کی طرف دو تین اطراف سے بڑھ رہی تھیں، مولمین کی جانب ان کا دباؤ بیحد بڑھ گیا تھا اور پردم پر ہر روز بمباری ہونے لگی تھی۔ قصبہ شی وے ڈونگ کے لوگ ہراساں تھے لیکن وہ ہر طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ اور کہیں نہ جا سکتے تھے پردم کی

طرف جاپانی فوجیں برابر آگے بڑھ رہی تھیں اور رات کی گولہ باری کی خوفناک آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ ساتیں کی موسی اور دیگر ماہی گیر بھی پریشان تھے اور کسی نہ کسی طرف بھاگ نکلنے کی فکر میں تھے۔ انور کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے وہاں رک کر کتنی بڑی غلطی کی۔ کہ قافلوں کا سلسلہ بالکل منقطع ہو چکا تھا۔ اور کسی قافلے کے وہاں پہنچنے کی امید نہ تھی۔ پردم کے محاذ پر لڑنے والی ہندوستانی اور امریکی فوجیں پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ قصبے میں کاروبار بالکل تھم گیا تھا۔ ہر شخص آنے والی مصیبت کے خوف سے سہما ہوا تھا۔

مارچ کے پہلے ہفتے میں ایک رات بموں اور توپوں کے دھماکے بالکل قریب ہی سنائی دیئے۔ گھروں کے اندر لیٹے لیٹے ہر شخص کا دل لرزا اٹھا۔ لوگ دبے پاؤں باہر نکل آئے۔ اور ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں پکارنے لگے ساتیں اور انور کے ہاں بھی بچے اور نوجوان و بوڑھے مرد جاگ پڑے۔ اور جنگل سے باہر دریا کے کنارے کھڑے ہو کر پردم جانے والی سڑک کی جانب فکرمند نگاہوں سے تکنے لگے۔ دور آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیلا ہوا تھا اور اس میں شعلوں کی گہری سرخ زبانیں پیچ و تاب کھاتیں اوپر اٹھ رہی تھیں ساتیں انور کے ساتھ لگ گئی۔ انور نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ تمام رات گولے پھٹتے رہے اور ان کی ہیبت ناک گونج میں کوئی نہ سو سکا۔

صبحدم جب آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہوا۔ اور پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں کھسر پھسر کرنے لگے تو قصبے والوں نے سڑک پر بھاگتے ہوئے ملٹری ٹرکوں اور جیپ کاروں کو دیکھا۔ یہ امریکی اور ہندوستانی سپاہی تھے۔ دریا کنارے پہنچ کر بڑے بڑے ٹرک رک گئے۔ سپاہی ریت پر کود پڑے انہوں نے ٹرکوں پر لدے ہوئے تختے اتارے انہیں گھسیٹتے ہوئے دریا تک لے گئے اور بجلی ایسی تیزی کے ساتھ دریا پر کشتیوں کا پل بنانا شروع کر دیا۔ عقبی جنگوں میں توپیں رہ رہ کر دھاڑ رہی تھیں۔ اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے تھوڑی دیر میں

وہاں اور موٹریں آگئیں۔ اور اس میں زخمی سپاہی اتارے جانے لگے ہر سپاہی پسینے میں نہا رہا تھا۔ اور اسکے چہرے پر شکستگی کے آثار تھے۔ ان کی وردیاں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور آہنی ٹوپیوں پر درختوں کی ٹہنیاں ہل رہی تھیں انور کو یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ اتحادی فوجیں پردم خالی کر رہی ہیں۔ لیکن قصبہ شی دے ڈونگ چھوڑ کر وہ کہاں جائے؟ ساتیں کہاں جائے؟ اس کی موسی کس طرف بھاگے؟ اس بستی کے دوسرے لوگ کہاں پناہ لیں؟ انہوں نے جنگ کا اعلان کب کیا تھا۔ وہ ایراوتی کی لہروں پر سمپان کھیتے تھے اور مچھلیاں سکھاتے تھے۔ اور مونچھ کی رسیاں بٹتے تھے۔ اور ان کی عورتیں بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ اور انہیں اپنے سینے سے لگا کر زمین پر سو جاتی تھیں۔ انہیں توپوں بندوقوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

بہر حال جنگ کرنے والوں کو بھی ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان میں کوئی امریکہ سے آیا تھا کوئی جاپان سے اور کوئی ہندوستان و آسٹریلیا سے وہ نوان غریب ماہی گیروں کی بولی سے بھی ناواقف تھے۔ پھر وہ ان کے دکھ درد میں بھی کیونکہ شریک ہو سکتے تھے؟ کشتیوں کا عارضی پل دیکھتے دیکھتے تیار ہو گیا۔ اور بھاگتی ہوئی فوجیں ٹرکوں اور جیپ گاڑیوں میں بیٹھ کر اس پر سے گزرنے لگیں۔ کچھ اور ٹرک بھی وہاں آگئے۔ جن کے پیچھے دو پہیوں والی توپیں بھی تھیں۔ توپوں کی نالیاں کافی لمبی تھیں۔ اور اس کے دہانے ہانپتے معلوم ہو رہے تھے۔ دوپہر تک اتحادی فوجوں کی پسپائی جاری رہی۔ جب تمام سپاہی دریا پار کر گئے تو انہوں نے پل کو بارود سے اڑا دیا۔ اور دوسری طرف جنگلوں میں گم ہو گئے۔ دیہاتی اپنی اپنی دو کانوں جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے۔ اور برباد شدہ تختوں کے کنارے پر گری ہوئی گچھیاں اکٹھی کرنے لگے۔

تیسرے پہر جاپانی شی دے ڈونگ میں داخل ہو گئے۔ ان کے توپوں بندوقوں سے لدے ہوئے ٹرک دریا کی دوسری جانب پہنچ کر رک گئے۔ ہر ٹرک کے آگے ایک جیپ گاڑی۔ اور پیچھے وزنی توپیں بندھی ہوئی تھیں توپوں

کے دہانے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ ٹھگنے قد کے سپاہی تقریباً ہم شکل تھے اور بندوقوں کی سنگین ان کے سروں پر بلند تھیں۔ ہر سپاہی بندوق اور مشین گن سے مسلح تھا۔ انہوں نے بھی دیکھتے دیکھتے دریا پر ایک عارضی پل تعمیر کر لیا۔ اور اسے پار کر کے دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی توپوں بموں اور گولہ بارود سے بھرے ہوئے ٹرک لے کر دشمن کے تعاقب میں جنگل کی طرف چل پڑی۔ اور دوسری ٹولی جو تین چار سپاہیوں اور چند ایک افسروں پر مشتمل تھی۔ وہیں رک گئی۔ انہوں نے فوراً وہاں خیمے گاڑ کر خندقیں کھودیں اور اپنے رقبے کے اردگرد خاص خاص آہنی تار پھیلا دی۔ لکڑی کے ستون کھڑے کر کے دروازہ بنا لیا گیا۔ اور ایک سپاہی بندوق کندھے پر رکھے وہاں پہرہ دینے لگا۔ پل پر بھی دونوں جانب پہرہ تھا۔ اور کسی دیہاتی کو اس پر سے گزرنے کی اجازت نہ تھی۔

دوسرے روز جاپانی سپاہی قصبے کے گلی کوچوں میں گھس گئے۔ اور انہوں نے چاول، چینی، نمک، مرچ مچھلیاں اور نوجوان عورتیں ایک جگہ جمع کرنا شروع کر دیں پھر انہیں ٹرکوں میں لاد کر اپنے کیمپوں میں لے آئے۔ اور افسروں نے دو دو عورتیں بغلوں میں داب کر بوتلوں کے منہ اور اپنے جوتوں کے تسمے کھولدیئے

کچھ سپاہی اس بستی میں بھی آئے جہاں انور مقیم تھا۔

انور انہیں دیکھ کر ساتیں اور اس کی سہیلی کو ساتھ لئے باورچی خانے میں دوڑ آیا۔

تم دونوں یہاں چھپ جاؤ اور اگر وہ لوگ اس طرف بھی آگئے تو تم ایراوتی میں کود جانا ——— میں بھی وہیں آجاؤں گا۔

ان دونوں معصوم لڑکیوں کا رنگ فق تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ساتیں نے آگے بڑھ کر انور کا ہاتھ تھام لیا۔

جناب آپ نہ جائیں ——— آپ برمی نہیں ہیں۔ وہ آپ کو ضرور پکڑ لیں گے۔

انور نے ساتیں کا ہاتھ جھٹک کر جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس اثنا میں جاپانی سپاہی لوگوں کی جھونپڑیوں میں گھس کر چادریں، سرہانے، کمبل، چاول مچھلی اور لڑکیاں جمع کر رہے تھے۔ غریب ماہی گیر اپنی جھونپڑیوں کے باہر ایک قطار میں کھڑے کر دیئے گئے۔ اور تین سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ وہ رحم طلب نگاہوں سے اپنا گھر بار لٹتے دیکھ رہے تھے۔ اور جب ان کی بیٹیاں اور بیویاں چیختی چلاتی ان کے قریب سے گزریں تو ان کے دلوں میں برچھیاں اتر گئیں۔ ان کی آنکھیں آگ اور خون برسانے لگیں۔ مگر وہ خاموش رہے اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

جب ساتیں کے گھر کی باری آئی تو دو سپاہیوں نے انور کو دھکیل کر پیچھے کر دیا اور اس کے سینے پر سنگین کی نوک رکھ دی۔ انور ——— گہری اور عمیق نفرت بھری نگاہوں سے بدصورت جاپانی سپاہی کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد انور کے پاس ساتیں کی بوڑھی موسی اور عیار بڑھیا اور اس کے خاوند اور لڑکوں کو بھی لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ وہ بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سپاہی جھونپڑے میں گھس گئے۔ اچانک انور کانپ اٹھا۔ باورچی خانے میں ساتیں کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہ ہم ہما کر آگے بڑھا۔ لیکن سنگین کی نوک اور قریب آگئی۔ تھوڑی دیر بعد سپاہی چاولوں کے جھال، سوکھی مچھلیوں کے گٹھے بستر چادریں اور ساتیں اور اس کی سہیلی کو لئے باہر نکلے۔ ساتیں کے چہرے پر مُردنی چھا رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اس کی سہیلی نیم بے ہوشی کے عالم میں ایک سپاہی کے کندھے پر لٹک رہی تھی۔ انہوں نے ویران نظروں سے آخری بار اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں اور ہمدردوں کو دیکھا۔ اور سر جھکائے سپاہی انہیں ساتھ لے کر پرلی طرف چلے گئے۔ کچھ سپاہی ایک لمبے دانتوں والے افسر کے ساتھ محصور ماہی گیروں کی طرف لے آئے، افسر نے ایک نوجوان ماہی گیر کو قطار میں سے کھینچ کر باہر نکالا۔ اپنے قریب کھڑا کیا۔ اور قبل اس کے کہ وہ بدنصیب صورت حال پر غور کر سکے

گولی مار کر اس کا سر پاش کر دیا قطار میں ایک عورت دل دوز چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ لمبے دانتوں والے جاپانی افسر کے چہرے پر انتہائی مکروہ ہنسی نمودار ہوئی۔ اور اس نے برمی زبان میں بڑی کرخت آواز میں اعلان کیا۔

ہر اس آدمی کا یہی انجام ہوگا۔ جو ان عورتوں کی تلاش میں آئے گا۔

انور کا خون کھولنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں گویا کسی نے انگارے بھر دیئے وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔

کیا یہ فعل غیر انسانی نہیں؟ ان لوگوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟

جاپانی افسر نے ڈیلے گھما کر، گردن ٹیڑھی کر کے انور کو دیکھا اور پھر بڑی شان کے ساتھ قدم بقدم چلتے ہوئے اس کے پاس آکر رک گیا۔ ایک لمحہ کے لئے نہایت غور سے اس کی شکل کا مطالعہ کیا۔ اور پھر دانت نکال کر بولا۔

میں پوچھ سکتا ہوں جناب کہاں کے رہنے والے ہیں؟

میرا وطن پنجاب ہے۔

افسر نے چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا۔

اس نوجوان کو کیمپ لے چلو۔

سپاہیوں نے فوراً اٹین شین ہو کر انور کو بندوق کے دستوں سے آگے دھکیلا اور ساتھ لے کر کیمپ کی طرف چل پڑے۔

کیمپ میں چھوٹی چھوٹی مونچھوں والا جاپانی میجر دونوں ٹانگیں میز پر رکھے کرسی پر نیم دراز تھا۔ اور سگریٹ پی رہا تھا۔ سپاہی جب انور کو لئے اندر داخل ہوئے تو اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ لمبے دانتوں والے کیپٹن نے انور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جناب یہ نوجوان پنجاب کا رہنے والا ہے۔

میجر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے رک گیا۔ اس نے انور پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور انور کے بالکل قریب آ گیا۔ اس نے انور

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تم یہاں کیسے آ گئے؟

قافلے کے ساتھ اور پھر دریا پار نہ کر سکا۔

جاپانی میجر انور کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے دفعتہً واپس مڑا میز کے پاس جا کر دراز کھولی۔ ایک فائل میں لگی ہوئی مختلف تصویروں کی پڑتال کرنے کے بعد ایک تصویر باہر نکالی۔ اور وہیں کھڑے کھڑے انور کو گھور کر شیطانی لہجے میں بولا۔

"تو تم ہو مسٹر انور علی آف رنگون ریڈیو۔

انور کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ وہ حیرانی اور گھبراہٹ سے جاپانی میجر کو دیکھنے لگا۔ اسے میرا کیونکر پتہ چلا، اور جب اس نے انور کو اس کی تصویر دکھائی تو وہ خموش ہو گیا۔ فائل میں لگی ہوئی تصویر کبھی ریڈیو کے میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ اب وہاں جھوٹ بولنا یا لاعلمی کا اظہار کرنا بے سود تھا۔ اس کی تصویر بہرحال اس کی تصویر تھی۔ اور اسے کوئی بھی نہ جھٹلا سکتا تھا۔ میجر نے سپاہیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ سپاہی سیلوٹ کے بعد باہر نکل گئے۔ اب اس چھوٹے سے خیمے میں وہ تینوں تنہا تھے۔ لمبے دانتوں والے کی دلچسپی اس انکشاف کے بعد بڑھ گئی تھی۔ میجر راکھدان کے سامنے کرسی پاؤں پر لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑی صاف برمی زبان میں بولا۔

مسٹر انور ہم تمہیں گرفتار نہیں کرنا چاہتے اس لئے کہ ہماری دشمنی انگریز اور امریکیوں سے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ صرف روپے کی خاطر ہم سے برسرپیکار ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم رنگون میں انخادیوں کے ان پوشیدہ جنگی ٹھکانوں کا حال بتا دو۔ جو تمہارے علم میں ہیں۔ اور جہاں گاہے گاہے تم جاتے رہے ہو۔

انور عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے سوائے

سیلز بیریکس اور بندر روڈ والے جنگی دفتروں کے اور کسی بھی علم نہ تھا۔ اور بمباری میں دونوں تباہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس نے یہی کچھ جاپانی میجر سے کہہ دیا۔ لیکن اس کو تسلی نہ ہوئی۔ اور وہ انور پر دباؤ ڈالنے لگا۔

مسٹر انور ہمارے پاس تم سے سچ اگلوانے کے لئے۔ اور بھی طریقے ہیں۔ مگر بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی ہمیں ٹھیک ٹھیک بتا دو۔

اب انور کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ چنانچہ اسے خاموش پا کر میجر نے سپاہیوں کو اندر بلایا اور تیز تیز جاپانی زبان میں کچھ احکامات دیئے۔ سپاہیوں نے پاؤں جوڑ کر پھر سلیوٹ مارا اور اس کو ساتھ لے کر وہاں سے ایک اور خیمے میں چلے گئے۔ یہاں اسے ایک سٹول پر بٹھلا دیا گیا۔ وہ عینک پوش کمزور سے جاپانی میز پر لوہے کی چادر چھریاں سجا رہے تھے انور کے دونوں ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے چھت سے لٹکتی ہوئی آہنی سلاخوں کے ساتھ سٹول کو اچھی طرح کس دیا گیا۔ دونوں عینک پوش جاپانی لمبی تیز نوکوں والی سوئیاں لئے اس کی طرف بڑھے اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں میں ناخنوں کے اندر سوئیاں چبھونے لگے۔ انور درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سوئیوں کی نوکیں اس کے دل میں چبھ رہی ہوں۔ کرب ناک درد کی ایک ٹیس اس کے دل سے اٹھی اور سارے جسم میں پھیل گئی۔ اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ دردناک اذیت پندرہ منٹ تک جاری رہی۔ اور اس کے ناخنوں سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے بعد بھی جب اس نے کچھ نہ بتلایا تو اسے زمین پر لٹا دیا گیا۔ اور لیمپ کے ذریعے اس کے منہ میں زبردستی پانی داخل کیا جانے لگا۔ یہ تکلیف اس قسم کی تھی کہ سوائے بھینس کی طرح ڈکرانے کے انور اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ جب اس کا پیٹ پھول کر پھٹنے کے قریب پہنچ گیا تو اسے الٹا لٹکا کر سارا پانی باہر نکال دیا گیا۔ انور پر غشی طاری ہو گئی۔ اور وہ جیسے خواب کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

ایک ڈاکٹر اندر آیا اور اس نے ٹونٹی لگا کر انور کا دل دیکھا اسے کوئی دوائی پلائی آہستہ آہستہ اس کا پیٹ دبانے لگا۔ جب انور اپنے ہوش وحواس میں آگیا۔ تو اسے لوہے کے ستونوں کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔ کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنا سر نہ ہلا سکتا تھا۔ اس کے سر کے عین اوپر پانی کی بڑی سی بالٹی لٹکادی گئی۔ جس کے پیندے کے عین وسط میں ایک باریک سوراخ تھا جس میں سے قطرہ قطرہ پانی انور کے سر پر ایک ہی جگہ مسلسل گر رہا تھا پہلے تو اسے یہ اذیت نہایت آسان معلوم ہوئی لیکن پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اس کا دماغ سن ہو گیا۔ اور کانوں کے پردے بجنے لگے۔ قطرہ لوہے کی گری کی مانند اس کے سر پر لگتا۔ اور اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی ہتھوڑہ کر اپنا ڈنگ چلا رہی ہے۔ پون گھنٹہ گزرنے پر اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو گیا۔ اور اس نے جاپانیوں اور امریکیوں، انگریزوں اور ہندوستانیوں انتہائی فحش گالیاں دینا شروع کر دیں پھر کملا اور ساتیں سے بھری گفتگو ہونے لگی۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں اذان دی۔ اور نماز کی نیت باندھ لی۔ لیکن یہ نیت بہت جلد ٹوٹ گئی۔ اور پھر وہ واہی تباہی بکنے لگا۔ آخر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے سفید جھاگ بہنے لگا۔ شام کو جاپانی میجر کے حکم سے انور جیل میں ڈال دیا گیا۔

یہ جیل لکڑی کی چھوٹی سی چار دیواری تھی۔ بینگے ٹیڑھے شہتیر جوڑ کر کھڑی کی گئی تھی۔ شہتیروں کے درمیان بعض جگہوں پر کافی فاصلہ تھا۔ یہاں خار وار تار جڑ دیے تھے۔ یہ جگہ دوسرے خیموں سے کافی ہٹ کر تھی اس کے ایک طرف ایراوتی کا پاٹ پھیلا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف تاریک جنگلات کا سلسلہ تھا۔ دو روز تک انور مردہ لاش کی طرح زمین پر پڑا رہا۔ دوسرے روز شام کو کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ اور ایک سپاہی ایلے ہوئے چاولوں کا لفافہ پھینک کر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ انور نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا شہتیروں کی درزوں میں سے

شفیق کی ہلکی سنہری روشنی اندر آرہی تھی۔ اس نے اٹھ کر تھوڑے سے چاول کھائے اور خاردار تاروں کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے لگا۔ سامنے گھاس کا ڈھلوان میدان تھا۔ جو دریا تک چلا گیا تھا۔ اس میں ناریل اور تاڑ کے درخت جا بجا اگے ہوئے تھے۔ دریا کے وسیع پاٹ میں سنہری شفق کا عکس پڑ رہا تھا دور کشتیوں کے پل پر سوائے جاپانی پہرہ داروں کے اور کوئی دیہاتی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا۔ دریا کا پرلا کنارا ابھی بالکل سنسان اور ویران تھا۔ وہ دوسری دیوار کے قریب آگیا۔ یہاں درزوں سے جاپانی سپاہیوں کے خیمے نظر آرہے تھے۔ ایک خیمے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اور چند ایک سپاہی صرف پتلونیں اور بوٹ پہنے تھالیاں ہاتھوں میں لئے خیموں کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ سامنے ساگوان کے گھنے درختوں کے تلے رات کے اندھیرے پاؤں پھیلا رہے تھے۔ ایک سپاہی دور خاردار جنگلے کے قریب گھاس پر جھکا غالباً پاؤں سے کوئی کیڑا مار رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ رات کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ آسمان پر چمکیلے — رجعت پسند ستارے نکل آئے۔ اور جیل کے اندر مدھم روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ کھڑے کھڑے انور کی ٹانگیں شل ہو گئیں۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ساتیں کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہاں ہو گی؟ کس خیمے میں ہو گی! کون سے افسر کی آغوش میں ہو گی۔ کیا کر رہی ہو گی؟ اس کی سہیلی — اس نیک دل لڑکی پر کیا گزر رہی ہو گی؟ اف! یہ جنگ!! یہ وحشت و درندگی!!!

سوچتے سوچتے جب انور کا دماغ بالکل تھک گیا اور اس کی آنکھیں دور کرنے لگیں تو وہ زمین پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ اور اسے نیند آگئی۔

صبح جب وہ جاگا تو سورج کی ایک کرن دیوار کی درز میں ہوتی ہوئی اس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ ہزاروں وقتوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کر کے اس کی دل جوئی کو وہاں آئی ہو۔ گویا وہ درخشاں و عنبیزہ ہو۔ کملا ہو۔ اور ساتیں ہو۔ —— وہ نئے سرے سے پھر ساتیں کے متعلق

غور کرنے لگا۔ دروازہ کھلا اور ایک جاپانی سپاہی چاولوں کا لفافہ اور پانی سے بھرا ہوا مگ اندر رکھ کر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ رات بھر اسے پہرے داروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور دن کے وقت گہری خاموشی پا کر اسے خیال آیا شاید جیل کے باہر پہرہ نہیں اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھا واقعی وہاں کوئی پہرہ دار نہ تھا۔ پرے پرے سپاہی گھوم رہے تھے۔ یکایکی وہ وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد اسے پتہ چلا کہ فرار ہونے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کسی نہ کسی طرح خار دار تاروں کو توڑ دیا جائے۔ لیکن وہ تار اس قدر مضبوطی سے جڑی ہوئی تھی کہ محض انگلیوں سے کام نہ چل سکتا تھا۔ اس نے جلدی سے مگ کا پانی پیا اور اس کے کناروں سے لوہے کی موٹی کیلوں کو اکھیڑنے کی ناکام کوشش کرنے لگا اچانک باہر کسی کے پاؤں کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ جلدی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور مگ یوں ہونٹوں سے لگا لیا گویا پانی پی رہا ہو۔ دروازہ پھر کھلا۔ اور وہی بدصورت سپاہی بندوق لٹکائے اندر داخل ہوا۔ انور کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھ سے مگ چھینا اور الٹے پاؤں باہر نکل کر دروازے میں تالا ڈال کر چلا گیا۔ گویا اسے انور کی سازش کا پتہ چل گیا ہو۔

پھر سارا دن کسی نے اس کی خبر نہ لی اور وہ زخمی چیتے کی طرح بند کوٹھڑی میں بے قراری سے چکر لگاتا رہا۔ مگ چھن جانے سے اس کے اندر فرار ہونے کی خواہش کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اور اس پر جان کی بازی تک لگا دینے کو تیار تھا۔ جیل میں گھٹ گھٹ کر مر جانے سے کہیں بہتر تھا۔ کہ وہ شہتیر توڑ کر بھاگتے ہوئے کسی جاپانی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن جائے۔ اب پھر شام آ رہی تھی۔ اور دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ وہ خیموں کے اندر سپاہیوں کے مکروہ قہقہے گونج رہے تھے۔ انور خار دار تاروں کے ساتھ لگ کر باہر مرطوب گھاس اور شام کے اندھیرے میں گم ہوتے ہوئے دریا کو دیکھنے لگا۔

ساتیں خیموں کے پیچھے سے ہوتی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پہلے تو انور بالکل نہ سمجھ سکا۔ کہ وہ اس قدر احتیاط کیوں برت رہی ہے لیکن جب ناریل کے درختوں کی اوٹ میں اپنا جسم لٹائے جیل کوٹھڑی کی طرف بڑھنے لگی۔ تو انور ذرا سنبھل گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دیوار توڑ کر ساتیں سے جا ملے جیل کے بالکل قریب لمبی لمبی گھاس میں رک کر ساتیں نے دوڑی ہوئی ہرنی کی مانند دونوں طرف نظریں دوڑائیں۔ اور وہ دبے دبے پاؤں جھکے جھکے جیل کے دروازے کی طرف ہو لی۔ انور نے آہستہ سے پکارا۔

'ساتیں!'

ساتیں نے چونک کر انور کو دیکھا اور پھر خار دار تاروں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

'او جناب اب آپ کیسے ہیں؟ ماشیا نے مجھے بتایا کہ انہوں نے آپ کو بھی پکڑ لیا ہے اور آپ کو بڑی تکلیفیں دی ہیں۔ میں کل صبح سے بے چین تھی لیکن وہ لوگ مجھے باہر قدم رکھنے ہی نہیں دیتے۔ ہائے! ہم لوگ کہاں آ گئے ہیں؟'

ساتیں کا دم پھولا ہوا تھا اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی اور کالی کالی آنکھیں گھما کر اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہی تھی۔ انور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

'گھبرانے کی بات نہیں ساتیں ـــــ ہم یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔'

ساتیں کا منہ حیرت اور خوف سے کھل گیا۔

'لیکن یہ لوگ ہمیں مار ڈالیں گے۔ آپ نہیں جانتے وہ درندے ہیں جنگلی ہیں۔'

'کچھ بھی ہو ساتیں ـــــ ہمیں یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بولو کیا تم میرا ساتھ دو گی؟'

ساتیں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

'میرا اب آپ کے سوا اور کون ہے؟'

'ٹھیک ہے ـــ دیکھو ساتیں وقت کم ہے اور کام بہت زیادہ ہے تم کل

کسی وقت مجھے کوئی چاقو یا چھری دے جاؤ اور کل رات کے پچھلے پہر جب پہریدار بھی گہری نیند کا شکار ہو جاتے ہیں تم یہاں پہنچ جانا اور ہم بھاگ چلیں گے۔

لیکن جناب آپ کی جان خطرے میں نہ پڑ جائے۔

خطرہ مول لئے بغیر یہاں سے فرار کسی طرح ممکن نہیں۔

خیمے کی طرف سے چند ایک سپاہیوں کے بلند آواز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ساتیں نے سہم کر دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور جلدی سے کہا۔

میں جاتی ہوں۔ کل ٹھیک اسی وقت آؤں گی۔

ساتیں لمبی گھاس میں جھک کر چلنے لگی۔ کچھ دور جا کر وہ ناریل کے درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔ انور خاردار تاروں کو پکڑے اس وقت تک اندھیرے میں گھورتا رہا۔ جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے تاروں پر سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے گہرا سانس لیا وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا اور اگلی شام کا انتظار کرنے لگا۔

۱۶

دوسرے روز جب سورج کا آشین نقال ایراوتی کے دوسرے کنارے سال اتاڑ اور ساگوان کے جھنڈوں میں چھپ گیا اور دریا کی میٹالی سطح پر مدھم تاریکی پھیل گئی تو انور بے چینی سے ساتیں کی راہ دیکھنے لگا۔ جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا اس کے اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا کیونکہ اب پہریدار اپنی اپنی ڈیوٹی پر کھڑے ہونے والے تھے۔ جس وقت انور کو یقین ہو گیا کہ ساتیں اب نہیں آئے گی اور وہ نا امیدی کے عالم میں دیوار سے پیچھے ہٹنے لگا تو اسے مرطوب گھاس پر ایک انسانی سایہ آگے بڑھتا دکھائی دیا۔

ساتیں! انور بے صبری سے سائے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھنے لگا۔

وہ ساتیں تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ناریل کاٹنے والا چھوٹا سا پلاس تھا اور دوسرے ہاتھ سے لمبی دریائی گھاس کو ادھر ادھر ہٹاتی وہ سمٹی سمٹائی چلی آ رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے پلاس انور کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ انور نے ساتیں کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے ہاتھ لے لیا۔ ساتیں کے چہرے پر ایک پل کے لئے مسرت و اطمینان کی دھیمی سی روشنی اجاگر ہوئی اور فوراً ہی غائب ہو گئی۔ اس نے انور

کی مٹھی سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے مدھم آواز میں کہا:۔

میں اب جاتی ہوں۔ پچھلے پہر جب چاند غروب ہو جائے گا۔ میں کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ جاؤں گی۔

میں تمہاری راہ دیکھوں گا ساتیں۔ ایسا نہ ہو تم سوئی رہو اور یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے نکل جائے۔

ساتیں نے خاموش لیکن غمگین نگاہوں سے الور کو دیکھا۔

'جناب میں کئی راتوں سے نہیں سوئی۔ میں یہاں سے نکلنے کے لئے آپ سے زیادہ بے تاب ہوں۔ آپ آج رات تیار رہیں۔ میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گی ـــــ اچھا اب میں جاتی ہوں'

ساتیں چلی گئی اور الور زمین پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں تار کاٹنے والے پلاس کو محبت سے دیکھنے لگا۔ اس چھوٹے سے اوزار میں دو آدمیوں کی زندگی اور موت کا راز چھپا ہوا ہے۔ زندگی یا موت ؟ کیا معلوم انہیں کیا ملے؟

اس رات بھی الور نہ سو سکا اور زمین پر لیٹا خاردار تاروں میں سے نظر آنے والے چمکیلے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ جب اندھیرا زیادہ بڑھ گیا تو مشرقی آسمان پر گول اور سرخ چاند نمودار ہوا اور اس کی ہلکی سنہری دھیمی روشنی میں ہر شے افسردہ نظر آنے لگی۔ دریا پر نیم زرد روشنی کی پراسرار دھند سی پھیل گئی اور ہلکی ہلکی ہوا کے خنک جھونکے چل نکلے۔ جن میں دریائی سرکنڈوں کی مرطوب بو تھی۔ اوپر اٹھتے ہوئے چاند کا چہرہ سرخ رنگت چھوڑ کر زیادہ چمکیلا ہو رہا تھا۔ جب وہ کافی اوپر آگیا تو چاندنی کی نیلگوں چمک میں جنگل، دریا اور گھاس پہلے سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگے اور ستاروں کی شوخی ماند پڑ گئی۔ نصف شب گزرنے پر چاند مغربی درختوں کی طرف جھک گیا اور درختوں کے سائے گھاس پر ترچھے ہو گئے۔ جاپانی سپاہی خیموں کے باہر باڑ کے ساتھ ساتھ پہرہ دے رہے تھے۔ اور گاہے گاہے تیز آواز میں ایک دوسرے کو پکار اٹھتے تھے۔ جنگل کی طرف سے

جھینگروں کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں کسی وقت کوئی گیدڑ عجیب تکلیف دہ ڈراؤنی آواز میں رونے لگتا۔ الور کوٹھڑی کے اندر دیوار کے ساتھ کھڑا یہ سب کچھ سن رہا تھا اور بے قراری سے چاند کے غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس چاند سے اس نے بڑی محبت کی تھی اور اس کی دودھیا چاندنی میں اس نے زندگی کی ان گنت حسین راتوں کی داستانیں سنی تھیں لیکن اس وقت چاند پر اسے کسی ایسی مال گاڑی کا گمان ہو رہا تھا جو بے انداز لمبی ہو اور ریل کے پھاٹک کو جوں کی چال رینگتی عبور کر رہی ہو۔ کب ختم ہو گی یہ گاڑی ؟ کب کھلے گا پھاٹک ؟

چاند بھی ان لوگوں کے راز سے واقف تھا۔ جب ہی وہ الور کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے اس نے اپنا چہرہ گھنے درختوں کے عقب میں چھپایا اور دریا اور جنگل پر گویا تاریک بادل جھک آئے۔ ہر شے اندھیرے کا ماتمی لبادہ اوڑھ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ صرف مغربی درختوں کے اوپر ڈوبتے چاند کی ہلکی ہلکی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ ستاروں کی چمک بڑھ گئی۔ لیکن چاندنی کے ایک دم غائب ہو جانے سے ان کا بیمار اجالا بے وقت معلوم ہوتا تھا۔ اور دور دور تک سوائے درختوں کے مدھم خاکوں کے اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ الور پلاس لئے بے چینی سے ساتیں کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اب تک آجانا چاہیئے تھا۔ کیونکہ صبح کاذب کی جھلکیاں نمودار ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔ الور ساتیں کو دیکھے بغیر تار نہیں کاٹنا چاہتا تھا۔ بہر حال ساتیں کو اسے اپنے ساتھ لے جانا تھا اور اگر اس نے تار کاٹ دئے اور وہ نہ آئی تو صبح اس کا سر گولی سے اڑا دیا جانا یقینی تھا۔ ایک ایک سیکنڈ اسے ایک ایک سال کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی چمکیلی آنکھیں ہر شے کو گھور رہی تھیں اور معمولی سی آہٹ پر بھی اس کے کان بلی کی طرح کھڑے ہو جاتے تھے۔ پہرے داروں کی آوازیں بھی کہیں ڈوب گئی تھیں اور الور کے خیال میں فرار ہونے کے لئے اس سے بہترین موقعہ انہیں کبھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

معاً کسی نے پتلی سی کمزور آواز میں پکارا۔

انور کے کان کھڑے ہو گئے اور پوری کھلی ہوئی آنکھیں چمکنے لگیں یہ ساتیں کی آواز تھی۔ اس نے دیکھا ساتیں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور اس نے سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ کالی چادر میں اس کا سپید اور زرد چہرہ بے جان اور مردہ سا لگ رہا تھا۔

دیر نہ کریں وقت گزر رہا ہے۔

انور نے دونوں ہاتھوں سے پلاس تھام کر تار کاٹنا شروع کر دئے پہلا تار کٹنے پر 'کٹاک' کی آواز پیدا ہوئی اور دونوں کے جسم کانپ گئے۔ انور نے دوسرا تار کاٹتے ہوئے اوپر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آواز کو دبا دیا۔ تاریں اگرچہ موٹی تھیں لیکن اوزار کی دھار کافی تیز تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام تار کٹ گئے اور شہتیروں کے درمیان بڑا سا سوراخ پیدا ہو گیا۔ انور نے اچک کر پہلے سر باہر نکالا۔ اِدھر اُدھر عیار نگاہوں سے دیکھا پھر بازو اور نصف دھڑ باہر کھینچا اور اس کے بعد جلدی سے اپنے آپ کو گھاس پر گرا دیا۔ دو تین سیکنڈ تک وہ گھاس کے درمیان بالکل بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس کے بعد اس نے آہستہ سے اٹھ کر ساتیں کا ہاتھ تھاما اور جھکے جھکے تیزی سے دوسری طرف بھاگ گیا۔ لمبی دریائی گھاس میں پہنچ کر وہ دونوں اس میں اوندھے منہ لیٹ گئے اور کہنیوں کے بل یوں آگے کو رینگنے لگے جیسے ان کا آدھا جسم مردہ ہو چکا ہو۔ گھاس میں تقریباً نصف گھنٹہ اپنا آپ گھسیٹنے کے بعد وہ اس فوجی رقبے کی آخری حد یعنی کانٹے دار باڑھ کے پاس پہنچ گئے۔ اس دوران میں وہ دونوں خاموش رہے تھے اور انہوں نے سوائے کسی وقت ایک دوسرے کو دیکھنے کے اور کوئی بات نہ کی تھی۔ انور نے کہنیوں کے بل پر اپنے جسم کو کچھ اور آگے گھسیٹا اور نہایت احتیاط کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھا کر دائروں کی شکل میں بچھے ہوئے تار کاٹنے لگا۔ وہ دونوں طرف سے کاٹ کر تاروں کے ٹکڑے ایک طرف پھینک رہا تھا ان الجھے ہوئے تاروں کے

درمیان صرف اس قدر راستہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے وہاں سے لیٹ کر گزر سکیں۔ اس مشکل اور خطرناک کام میں پون گھنٹہ صرف ہو گیا اور جب تاروں کے بیچ میں چھوٹی سی سرنگ بن آئی تو مشرقی آسمان پر سحر کا نور جھلملانے لگا۔ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے۔ سب سے پہلے انور اور پھر ساتیں اس سرنگ میں سے لیٹ کر گزر گئی۔ باڑھ کے باہر انہوں نے فتح مندی کی مسکراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھا اور دریا کی طرف چل پڑے۔ وہ ابھی تک رینگتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ سپیدۂ سحر کی ہلکی نیلگوں روشنی میں ان کے دیکھے جانے کا احتمال تھا۔ اب راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی۔ گھاس کا ٹکڑا ختم ہونے کے بعد ناریل اور تاڑ کے درختوں کا ذخیرہ تھا اور اس کے بعد ایراوتی کا پاٹ، جس کے کناروں کی گیلی خوشبو ان کے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ انور کا ارادہ ساتیں کو ساتھ لئے دریا کو پار کرنے کا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔

ناریل اور تاڑ کے ذخیروں میں پہنچ کر وہ زمین پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور درختوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے دریا کی سمت چلنے لگے۔ ناریل کے ستونوں میں سے دریا کا چوڑا پاٹ دکھائی دینے لگا تھا۔ انور نے ساتیں کو اپنے ساتھ لگا لیا ساتیں کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ انور نے جھک کر ہولے سے کہا:

اب ہم آزاد ہیں ساتیں۔ ہم بہت جلد دریا عبور کر کے سامنے والے جنگلوں میں پہنچ جائیں گے۔

ساتیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے مُردہ چہرے پر بے معلوم سا تبسّم نمودار ہوا اور وہ انور کے اور قریب آ گئی۔ دونوں غم نصیب چاہنے والے لمبے لمبے اونچے درختوں کے گہرے سایوں میں سے گزرتے ہوئے دریا کنارے آ گئے ایراوتی کی لہریں گیلی ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ اور دریا مدھم اور مسلسل سرگوشی کے ساتھ بہا چلا جا رہا تھا۔ انور نے ساتیں کی کمر کے گرد سیاہ چادر کس کر باندھتے

ہوئے کہا:۔

پانی میں تم ہاتھ پاؤں بالکل نہ ہلانا۔ بس مجھے مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور ریت پر دریا کی طرف چل پڑے۔ ایکا ایکی جنگل میں پہرے دار کی تیز آواز گونجی۔ انور اور ساتیں ایک دم بھاگ اٹھے۔ ابھی وہ چند قدم ہی بھاگے ہوں گے کہ ایک ـــــ دو ـــــ تین پستول کے مسلسل تین فائر ہوئے اور وہ دونوں ایک ساتھ گویا کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑائے اور اوندھے منہ گیلی ریت پر گر پڑے۔

تاڑ کے ذخیرے میں سے ٹھنگنے قد کے دو جاپانی سپاہی ہاتھوں میں پستول اور گلوں میں مشین گنیں لٹکائے باہر نکلے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے انور اور ساتیں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ پاؤں سے انہوں نے لاشوں کو دو تین بار ہلایا۔ لیکن ان میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے پستول جیبوں میں ڈال کر وہ لاشوں پر جھک گئے اور ان کی جیبیں ٹٹولنے لگے ایک سپاہی افسوسناک انداز میں بولا:۔

کاش مجھے پہلے پتہ ہوتا کہ ان میں ایک عورت ہے۔

دوسرے نے انور کی جیب سے بٹوہ اور پلاس نکالتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا ہوتا؟"

پہلے نے آہ بھر کر کہا:۔

تم نہیں جانتے مجھے اپنی بیوی سے کیا لگاؤ ہے کیا معلوم وہ اپنے چچازاد بھائی سے عشق لڑا رہی ہو۔ جس طرح اسے کسی مرد کی ضرورت ہے مجھے بھی ایک عورت چاہیئے۔

پھر وہ ساتیں کے برف آلود رخساروں پر اپنا کھردرا ہاتھ پھیرنے لگا۔ دوسرے سپاہی نے پلاس کو ریت پر پھینکتے ہوئے کہا۔

بیچارہ کوئی مستری تھا۔ لیکن یہاں اس وقت کیا کرنے آیا؟ دیکھتا ہوں۔ بٹوے میں کتنا مال ہے۔

بٹوے کا منہ کھول کر اس نے ٹارچ کی روشنی میں اندر دیکھا۔ سامنے والے پردے پر انور کی بوڑھی ماں کی تصویر لگی تھی۔ بٹوے میں کل گیارہ روپے نو آنے تھے۔ پیسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے تصویر نکال کر اسے غور سے دیکھا پہلے سپاہی نے سر اٹھا کر پوچھا۔

خوبصورت عورت ہے؟

دوسرے سپاہی نے ناک سکوڑ کر تصویر کو پھاڑ کر ایک طرف پھینک دیا کوئی کھوسٹ بوڑھیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے گیارہ روپے نو آنے آپس میں تقسیم کئے، پستول نکال کر ہاتھوں میں تھام لئے اور باتیں کرتے ہوئے تاڑ کے درختوں میں غائب ہو گئے۔

گیلی زمین پر انور نے آنکھیں کھول کر دور ناریل کے درختوں کی طرف دیکھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ سپاہی ذخیرے سے باہر جا چکے ہیں تو اس نے لیٹے لیٹے ساتیں کو بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

ساتیں! ساتیں!!

لیکن ساتیں وہاں نہ تھی۔ ساتیں کہیں بھی نہ تھی۔ وہ زندگی کی خاردار باڑھ کو عبور کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرار حاصل کر چکی تھی۔ انور کا چہرہ ایک دم تاریک پڑ گیا۔ اس کا بایاں بازو بے حد درد کر رہا تھا اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ گولی اس کے بازو سے رگڑ کھا کر اسے چھیلتی ہوئی آگے نکل گئی تھی اس نے گردن اٹھا کر ساتیں کو پچھلے پہر کے اندھیرے میں غور سے دیکھا ساتیں کا منہ ذرا سا کھلا تھا۔ کالی کالی نیم وا آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ایک طرف ہونٹوں کے کنارے سے خون کی پتلی سی لکیر نکل کر رخسار پر جم گئی تھی انور نے جلدی سے اس کے دل

پر ہاتھ رکھ دیا لیکن وہاں اب کیا تھا؟ اب کہیں بھی کچھ نہ تھا۔ زندگی کا لپکتا ہوا گرم و آتشین شعلہ موت کی کفن پوش برفوں کے نیچے دب کر ہمیشہ کے لئے سرد پڑ گیا تھا۔ ساتیں کا جسم ٹھنڈ ہو چکا تھا اور اس کے سیاہ بال گیلی ریت پر پھیلے ہوئے تھے۔ انور نے آہستہ سے اٹھ کر اس کی لاش کو دونوں بازوؤں پر اٹھایا۔ ناریل کے درختوں تلے نرکل کی جھاڑیوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گڑھے میں رکھا اور پتھر جمع کر کے اس کے اوپر جوڑنے لگا جب پتھروں نے ساتیں کا سارا جسم ڈھانپ لیا اور صرف چہرہ باقی رہ گیا تو انور نے جھک کر اپنی اولین اور آخری محبوبہ کی مردہ پیشانی پر اپنے کانپتے ہوئے لب رکھ دیئے۔

اسی دم مشرقی آسمان کے کناروں پر سحر کا نورانی اور چمکیلا شعلہ بھڑکنے لگا اور ستاروں کی ابریشمی پلکوں پر شبنمی آنسو لرز اٹھے اور جنگلوں میں معصوم پرندوں نے اپنے گھونسلوں میں آنکھیں کھول لیں اور آسمان پر رات کی کفنائی ہوئی لاش پر کافور چھڑکا جانے لگا۔

انور نے اپنے لب ہٹا کر آخری بار ساتیں کو دیکھا۔

الوداع برما کی بیٹی! میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

آنسوؤں کا ایک قطرہ ساتیں کے سرد رخسار پر گر پڑا۔ انور نے آنکھیں پونچھیں۔ لاش پر آخری پتھر رکھا ان پتھروں پر گیلی ریت ڈالی اور اپنے بازو پر ساتیں کی سیاہ چادر سے پھاڑی ہوئی پٹی کو اچھی طرح باندھ کر دریا کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا چل پڑا۔ راستے میں اس نے ریت پر سے پلاس اور اپنی پیاری ماں کی تصویر کے ٹکڑے اٹھا کر جیب میں ڈال لیے اور کنارے پر پہنچتے ہی دریا میں چھلانگ لگا دی۔

جب وہ دریا عبور کر چکا تو سورج پیگو باما کی بلند چوٹیوں پر طلوع ہو چکا تھا۔ اور سنہری دھوپ میں درختوں کی چوٹیاں جھلملا رہی تھیں۔ دوسرے کنارے پر انور نے دریا سے باہر نکل کر پتلون کے پائنچے نچوڑے اور لپک کر سامنے

والے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ گرفتار نہ کر لیا جائے کیونکہ جیل کے تار ٹوٹے ہوئے دیکھ کر اور اسے وہاں نہ پا کر سپاہی فوراً بندوقیں تانے اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے گڑھوں، پتھروں، گرے پڑے درختوں اور جھاڑیوں کو الانگتا پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ راستے کی درست سمت سے بھی واقف نہ تھا اسے صرف اسی قدر علم تھا کہ دو ماہ پیشتر چٹاگانگ کی طرف کوچ کرنے والے قافلے انہی جنگلوں میں داخل ہوتے تھے۔ جس ویران پگ ڈنڈی پر وہ چل رہا تھا اس کے آس پاس کچلی ہوئی جھاڑیاں، کٹے ہوئے بانس کے درخت اور بعض جگہوں سے کھدی ہوئی زمین اور کہیں کہیں سرکنڈوں میں الجھے ہوئے غلیظ چیتھڑے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ لوگ قافلہ در قافلہ وہاں سے گزرے ہیں۔ اس کے دل میں اس وقت اپنے طویل اور بھیانک سفر کے ناگزیر خطرات کی جگہ جاپانی سپاہیوں کی ہولناک درندگی کا بھرپور احساس کارفرما تھا اور جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ ان لوگوں کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

سورج پوری طرح نکل آیا تھا اور گھنے جنگلی درختوں کے سایوں میں دھوپ کی ترچھی کرنیں گھاس پر پڑ رہی تھیں۔ گھنیری شاخوں میں پرندے شور مچا رہے تھے اور ریشمی دموں والی گلہریاں سپاری کے درختوں کے چکر کاٹ رہی تھیں۔ فضا میں بانس کے درختوں کی گہری خنک اور نرمل مہک تھی۔ انور بغیر کسی جگہ رکے شام تک سفر کرتا رہا۔ سورج چھپنے سے بہت پہلے جنگل میں اندھیرا پھیلنے لگا اور شام ہو گئی۔ انور کی ٹانگیں تھکن سے چور ہو رہی تھیں اور زخمی بازو درد کرنے لگا تھا۔ بھوک اور شکستگی اعضا اسے نڈھال کر رہی تھی۔ ساگوان، سال اور املی کے پھیلے ہوئے درختوں کی چوٹیاں سنہری دھوپ میں نہا رہی تھیں۔ لیکن ان کے قدموں میں مرطوب سائے بڑھ آئے تھے اور جنگل میں رات کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ بانس کے سرکنڈوں نے بڑھتی پھیلتی خاموشی میں گویا اپنے کان کھڑے کر لئے تھے۔ اور

جھاڑیوں کے درمیان کیڑے مکوڑے عجیب قسم کی سیٹیاں بجانے لگے تھے۔ جنگلی درندوں کے حملے سے بچنے کے لئے اور جھانسری کے ایک بہت لمبے چوڑے درخت پر چڑھ گیا اور اس کی گنجان شاخوں میں لیٹ کر ٹہنیوں سے لال لال کھٹی پھلیاں توڑ توڑ کر کھانے لگا جب اس کا حلق جلنے لگا اور زبان جگہ جگہ سے پھٹ گئی تو اس نے منہ پونچھ کر دو تین مرتبہ تھوکا اور اپنا بازو دباتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ ان درختوں پر سانپ عام ہوتے ہیں۔ پھر اس کے ذہن میں اس نوجوان کی لاش ابھر آئی جسے رنگون سے شی وے ڈونگ جاتے ہوئے راہ میں کالے ناگ نے ڈس لیا تھا ـــــ وہ اس خیال سے قدرے ڈر گیا۔ لیکن زمین پر سونا اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ علاوہ ازیں دن بھر کے پیدل سفر کے بعد وہ اس قدر ادھ موا ہو رہا تھا کہ اسے فوراً نیند آگئی اور وہ سو گیا۔

جنگل کی رات شہر کی رات سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شہر میں تھکے ہارے لوگوں کے لئے رات پیام نیند لے کر آتی ہے اور وہ لمبی تان کر سو جاتے ہیں لیکن جنگل کی زندگی رات کے وقت شروع ہوتی ہے۔ جوں جوں اندھیرا گہرا ہوتا ہے۔ ہر شے بیدار ہونے لگتی ہے۔ دن بھر کے سوئے ہوئے شیر انگڑائیاں لے کر اپنی اپنی کچھاروں سے شکار کی تلاش میں نکل آتے ہیں۔ گیدڑ، لومڑ اور ڈاکھر اس ٹوہ میں راستہ سونگھنے لگتے ہیں کہ شیر نے اپنا مارا ہوا شکار کہاں چھپا رکھا ہے۔ بھوکا شیر جب زمین کے ساتھ منہ لگا کر ایک ہیبت ناک دہاڑ مارتا ہے تو درختوں کی ٹہنیاں کانپ جاتی ہیں۔ بندر نٹوں کی طرح شاخوں پر اپنے کرتب شروع کر دیتے ہیں۔ پرندوں کی نیند کھل جاتی ہے اور گھونسلوں میں وہ اپنے اپنے بچوں کو سینے سے چمٹا لیتے ہیں۔ گندے پوکھر کنارے کھڑے نازک بدن ہرن جنگل کے شہنشاہ کی للکار پر چوکڑیاں بھرتے جس طرف منہ اٹھتا ہے دوڑ پڑتے ہیں اور اکثر اوقات ایسے راستوں پر نکل آتے ہیں جہاں شیر پہلے ہی سے ان کا منتظر ہوتا ہے۔

شیر کا اگلے پنجوں پر زور ڈال کر یونہی دھاڑنے سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ جانوروں میں افراتفری مچ جائے اور کوئی نہ کوئی مصیبت کا مارا اس طرف بھی آنکلے پھر وہ اچھل کر جھپٹتا ہے اور اپنی پانچ من کی لاش شکار پر گرا دیتا ہے اور مستی میں آکر غراتے ہوئے اس کا خون پینا شروع کر دیتا ہے جنگلوں میں یہ خونی ناٹک عموماً رات کو کھیلے جاتے ہیں اور دن کے وقت وہاں شہر کی رات ایسی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ جنگل رات کو زندہ ہوتے ہیں اور یہ زندگی نہایت پر خطر پراسرار اور خوفناک ہوتی ہے کہ وہاں ہر کمزور کو طاقتور کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کمزور بھی چوکڑیاں بھرتے ہیں اور طاقتور بھی آزادی سے جھاڑیاں لتاڑتے پھرتے ہیں۔

سویرے ہی انور کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ ٹہنیوں اور پتوں کے جھرمٹ میں سے آسمان پر دن کی روشنی صاف نظر آرہی تھی لیکن نیچے ابھی اندھیرا تھا۔ انور کا بازو پہلے سے اچھا تھا اور درد کافی حد تک دور ہو چکا تھا۔ اس نے پٹی کو دوبارہ باندھا اور روشنی پھیل جانے کا انتظار کرنے لگا۔ درندے اور چوپائے سرگرم رات بسر کرنے کے بعد اپنے اپنے غاروں میں جا چھپے تھے اور پرندے درختوں پر طلوعِ سحر کی خوشی میں چہک رہے تھے اور اپنے ننھے منھے بچوں کو جگا رہے تھے۔ جب دن کافی نکل آیا اور جنگل میں ہر طرف سفید سفید دھوپ کا جال سا بچھ گیا اور کافی اجالا پھیل گیا تو انور جھالسری کے درخت سے نیچے اترا اور پگ ڈنڈی پر آگے روانہ ہو گیا۔

انور پانچ روز تک ان پر خطر تاریک جنگلوں میں اسی طرح سفر کرتا رہا رات ہوتی تو وہ کسی نہ کسی درخت پر چڑھ کر سو رہتا دن نکلتا تو پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا۔ بھوک لگتی اور کوئی پھلدار جنگلی درخت مل جاتا تو اس کا پھل بغیر سوچے سمجھے کھانا شروع کر دیتا۔ اگر چاروں طرف سے ناکامی ہوتی تو درخت کی ٹہنیوں پر پھدکنے والے کسی نہ کسی جانور کو ڈھیم مار کر نیچے گرا لیتا اور پھر تار کاٹنے والے پلاس سے اسے

ہلال کر کے کچا ہی چبانا شروع کر دینا۔ پیاس محسوس ہوتی تو اپنی جگہ سے میلوں اِدھر اُدھر ہٹ کر کسی چشمے جوہڑ یا جنگلی جانوروں کے گندے پرکھر کی ٹوہ لگاتا اور اپنی جان کی بازی لگا کر وہاں اپنی پیاس بجھاتا اس دوران میں اس کے بازو کا زخم بھر گیا تھا لیکن جوتوں کا برا حال ہو رہا تھا ایڑیاں اپنی اپنی جگہوں سے ہل گئی تھیں اور ایک پاؤں کا تلہ کچھ اس طرح پھٹ گیا تھا کہ چلتے وقت کنکر چھوٹے چھوٹے پتھر، سوکھی ٹہنیوں کے ٹکرے وغیرہ اندر گھس آتے تھے چنانچہ اس کے اندر انور نے گھاس کی تہہ جما رکھی تھی۔ تاہم اس کے تلوے جگہ جگہ سے زخمی ہو رہے تھے داڑھی بری طرح بڑھ آئی تھی سر کے بال وحشیوں کی مانند گردن سے بھی نیچے تک اتر آئے تھے۔ چہرے کی جلد کالی پڑنے لگی تھی اگر اس کے پاس پلاس نہ ہوتا تو شاید ناخون بھی جنگلیوں کی طرح بڑھ آتے۔ ہاتھ میں کوئی شے رکھنے کے لئے اس نے بانس کے چھوٹے سے ٹکرے کا ڈنڈا بنا لیا تھا۔ جو سفر کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں لہرایا کرتا۔ جب کبھی خاموشی سے اس کا جی گھبرا اٹھتا تو وہ گنگنانے لگتا اور یا پھر بانس کے درختوں، جھاڑیوں، سرکنڈوں اور پرندوں سے بے مقصد گفتگو شروع کر دیتا۔ تین روز سے وہ پہاڑیوں کے ایک نئے سلسلے میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں راستہ بے حد دشوار گزار تھا اور بعض جگہیں اس قدر ہولناک تھیں کہ ذرا سی بے احتیاطی میلوں نیچے گہرے اور تاریک کھڈوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا سکتی تھی ان پہاڑیوں پر زیادہ تر ساگوان، بانس اور سپاری کے درخت تھے۔ یہاں پہنچ کر انور کو پانی کی پریشانی سے چھٹکارا مل گیا۔ کیونکہ پتھروں کے درمیان کہیں نہ کہیں ہر دوسرے میل پر چشمہ پھوٹ رہا ہوتا تھا۔ اب وہ تقریباً دن میں دو بار کسی نہ کسی چشمے پر پہنچ کر کپڑے اتارتا اور پتھروں کے درمیان جمع شدہ شفاف اور ٹھنڈے پانی میں اتر جاتا اور مَل مَل کر نہاتا۔ نہانے سے اس کی تھکن کافی حد تک اتر جاتی اور وہ اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرنے لگتا۔ انور کا خیال تھا کہ رنگون سے بھاگے ہوئے قافلے اسی راستے سے ہو کر گزرے تھے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط خیال تھا۔ قافلوں نے پردم کے جنگلوں سے

گذر کر شمال مشرق کی جانب مانڈلے کا راستہ اختیار کیا تھا اور وہ مغرب کی طرف اکیاب اور من ہالہ کے اراکانی پہاڑی سلسلوں کو عبور کر رہا تھا۔ کچھ لوگ اس راستے سے بھی گزرے تھے جو ٹیگو سے رامری، آئی لینڈ اور وہاں سے بادبانی کشتیوں کے ذریعے پانچ دن میں بوتھی ڈاؤن پہنچے تھے لیکن یہ سفر اکیاب پر جاپانی قبضے کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ انور ٹیگو سے شمال مغرب کی طرف آگے نکل آیا تھا اور اکیاب کے بانیوں میں سفر کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دشوار گزار پہاڑی راستوں نے قدرتی طور پر اسے ان راہوں پر ڈال دیا جو آسام کے جنوب مشرق میں برما آسام کی سرحد پر کانئی اور کنشو کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھیں جاپانی فوجیں اغل کی طرف سے برما میں بڑھ رہی تھیں اور کنشو کے بیابان ان کی سرگرمیوں سے پاک تھے۔

ساتویں روز انور کو تیسرے پہر پہاڑ کے دامن میں لہلہاتی وادیوں اور میدانوں کا سلسلہ دکھائی دیا۔ اب پہاڑیاں ختم ہو رہی تھیں اور ایک بار پھر وادیوں اور میدانوں کا چکر شروع ہو رہا تھا۔ وادیوں میں دہان کے کھیت دیکھ کر اس کے پژمردہ چہرے پر سرخ خون دوڑنے لگا۔ آبادی آ رہی تھی۔ انسانوں کی بستیاں آنے والی تھیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے پہاڑ کی ترائی طے کرنے لگا دیئے بتی سمے وہ ایک ایسی بستی میں داخل ہوا۔ جہاں کے لوگ کمر کے گرد صرف کیلے کے پتر لپیٹے ہوئے تھے وہ بڑی ٹوٹی پھوٹی اراکانی برمی زبان بولتے تھے۔ انور ایک رات اس بستی میں ٹھہرا۔ یہاں اسے چاول اور کچے کیلوں کا انتہائی تیز اچار ملا۔ جسے اس نے دنیا کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر کھایا۔ گھاس پھونس کے بستر پر اسے اس قدر بھرپور اور گہری نیند آئی گویا وہ رنگون کے گرینڈ ہوٹل میں سو رہا ہو۔ جنگلی لوگ خلاف توقع بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے اور انہوں نے اگلی مرتبہ انور کو راستے کی درست اور آسان ترین سمت سے بھی آگاہ کیا اور بہت سا اچار بھی کیلے کے پتروں میں باندھ کر ساتھ کر دیا۔ انور کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ لوگ دوسری جنگ عظیم سے بالکل بے خبر تھے۔

اور جاپانی حملے کی بابت کچھ نہ جانتے تھے۔ ایک ہفتہ اور اسے اراکان کے جنگلوں میں بھٹکنا پڑا۔ لیکن ان جنگلوں نے اسے ایسے راستے کی خبر دی تھی جو سات ہی دنوں کے اندر اندر اسے کن شولی آبادی میں لے آیا۔ راہ میں بھی چھوٹی چھوٹی کئی جنگلی بستیاں پڑیں۔ جہاں سے انور کو تھوڑا بہت کھانے کو ملتا رہا۔ غرض یہ کہ یہ ہفتے بھر کا سفر پچھلے سفر سے کہیں زیادہ آرام دِہ رہا اور جب انور برما کی سرحد کن شو پر پہنچا تو اس کی جان میں جان آئی۔ کیونکہ یہاں سے چٹاگانگ محض تین چار روز کا سفر تھا۔

کن شو کافی بڑی بستی تھی اور امغل سے جاپانی فوجوں کے داؤ کے پیشِ نظر یہاں بھی شی وے ڈونگ ایسی بے چینی و بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ دو روز اس بستی میں آرام کرنے کے بعد انور نے آخری بار رختِ سفر اٹھایا اور چٹاگانگ کی طرف دشت نوردی شروع کر دی۔ جنگل حسب معمول تاریک اور گھنے تھے اور پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے والے راستے خطرناک اور دشوار گزار تھے کہیں کہیں دور کسی پہاڑی کی ڈھلان میں دکھائی دیئے جانے والے ڈاک بنگلے کے علاوہ دور دور تک آبادی کا کہیں بھی نشان نظر نہ آیا۔ دوسرے روز شام کے قریب ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے ایک لمحے کے لئے انور کو موت کے روبرو لا کھڑا کر دیا۔ وہ درختوں کے موٹے تنوں اور پتھروں کے بیچ سے پھنس کر گزرنے والی پگ ڈنڈی عبور کر کے ایک بڑی سی چٹان کا موڑ گھوما ہی تھا کہ ایک دم رک گیا اور اس کے پاؤں گویا زمین میں دھنس گئے۔ سامنے کوئی بیس تیس گز کے فاصلے پر راستے کے عین درمیان میں زرد کھال اور سیاہ دھاریوں والا نوی الجثہ شیر لیٹا ہوا تھا اس نے کوئی پانچ چھ گز سے بھی زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی اور فضا میں اس کے ہلکے ہلکے خوفناک خرّاٹوں کی آواز تحرک پیدا کر رہی تھی۔ انور کے گویا بالکل ہوش و حواس غائب ہو گئے اور بت سا بن کر رہ گیا۔ مگر جلد ہی وہ سنبھلا اور زمین پر یوں آہستگی سے قدم اٹھاتا ہوا الٹے پاؤں چلنے لگا دہاں کانٹے بچھے ہوں۔ چٹان کی اوٹ میں پہنچ کر وہ بجلی ایسی تیزی کے ساتھ دوسری طرف گھوما اور تین میل کا چکر

کاٹ کر پگڈنڈی کے بہت آگے نکل آیا۔ پھر بھی وہ معمول سے زیادہ چوکنا ہو گیا۔ اور معمولی سے معمولی آہٹ پر بھی اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔

اسی رات نصف شب کے قریب جنگلی ہاتھیوں کی مسلسل چیخ و پکار سے گونج اٹھا۔ درخت پر لیٹے لیٹے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور سر جھکا کر نیچے دیکھنے لگا۔ جس درخت پر وہ سو رہا تھا اس کے نیچے سے جنگلی ہاتھیوں کا قافلہ گزر رہا تھا۔ اندھیرے میں اسے ہاتھیوں کے بھدّے خاکستری جسم بہت بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی ٹولی بے شمار ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ اور وہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے زمین ان کے قدموں تلے کانپ رہی تھی اور درخت کی ٹہنیوں پر لرزہ طاری تھا۔ ہر تیسرا ہاتھی سونڈ اور پر اٹھائے پتلی لیکن بھیانک آواز میں چنگھاڑ رہا تھا۔ انور درخت کی شاخ سے لپٹا دم سادھے لیٹا تھا اور اس عجیب و غریب جلوس کو حیرت سے تک رہا تھا۔ اس خیال سے کہ اگر وہ زمین پر سویا ہوتا تو اس کے جسم کے کس بری طرح پرزے اڑ جاتے وہ کانپ گیا اس نے سن رکھا تھا کہ جنگلی ہاتھی عام طبعی حالت میں کسی انسان کو گزند نہیں پہنچاتا لیکن اگر وہ جنگل میں سے گزرتے ہوئے کسی آدمی کو درخت میں چھپا دیکھ لے تو اس درخت کے گرد سونڈ لپیٹ کر جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس آدمی کو بری طرح کچل دیتا ہے۔ مگر انور گنجان ٹہنیوں اور پتوں میں اس طرح چھپا بیٹھا تھا کہ ہاتھی کی باریک آنکھ اسکا کھوج نہ لگا سکتی تھی۔ تاہم وہ دل ہی دل میں سہما ہوا تھا۔ جب ہاتھیوں کا جلوس وہاں سے گزر چکا اور جنگل میں پھر وہی پُراسرار اور زندہ خاموشی طاری ہو گئی تو انور نے اطمینان کا گہرا سانس بھرا۔ اس کے باوجود پھر اسے نیند نہ آئی اور رات کا باقی حصہ اس نے جاگ کر آنکھوں میں کاٹا۔

صبحدم سورج کی پہلی کرنوں نے درختوں میں سے جھانک کر دیکھا تو شبنمی گھاس پر اور اوس کے موتی چمک اٹھے اور سحر کی تازہ اور خوشگوار جنگلی ہوا چلنے لگی۔ بانس کی نازک ٹہنیوں پر سے شبنم کی نرمل بوندیں ٹپکنے لگیں اور ساگوان کے

جھنڈ پرندوں کی چہکار سے گونجنے لگے انور درخت سے اتر آیا زمین پر گھاس اور جھاڑیاں یوں ہموار ہوگئی تھیں جیسے ان پر سے ٹرک کوٹنے والا انجن گزر گیا ہو اور جگہ جگہ ہاتھیوں کی تازہ لید بکھری ہوئی تھی ایک سرخ تھوتھنی والا بندر پتھر پر بیٹھا تھا۔ انور کو دیکھ کر اس نے دو تین بار خرخر کیا دونوں ہاتھوں سے تالی پیٹی اور دوسری طرف پھلانگ گیا۔ انور بندر کی اس حرکت پر ہنس پڑا۔

تیسری شام راہ میں پھر ایک ڈاک بنگلہ دیکھا اس کے برآمدے کا فرش ویران اور گرد آلود تھا اور ڈھلوانی چھت پر بانس اور سال کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ دروازے پر موٹا سا تالا پڑا تھا جس پر زنگ لگ رہا تھا تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے انور کو بھوک نے بے حد تنگ کیا ہوا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہاں ضرور کوئی نہ کوئی آبادی ہوگی چنانچہ اسکا خیال درست نکلا ڈاک بنگلے کے عقب میں چند ایک پھوس کی جھونپڑیوں میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ انور ان جھونپڑیوں کی طرف بڑھا۔ ایک نوجوان مرد جس کا جسم گندمی، قد ٹھگنا، نقوش چپٹے اور سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے جھونپڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور تعجب سے انور کو تکنے لگا پھر وہ اندر گیا اور کچھ عورتوں اور بوڑھے مردوں کو بھی ساتھ لے کر باہر نکل آئے اور انور کے گرد کھڑے ہو کر اسے دیکھ دیکھ کر اپنی بولی میں باتیں کرنے لگے انور اپنے آپ کو عجیب تماشہ محسوس کرنے لگا۔ عورتیں اور مرد صرف میلے کچیلے لنگوں میں ملبوس تھے جو ان کے گھٹنوں تک پہنچے تھے انور نے ان کی زبان سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کے پلّے کچھ نہ پڑ سکا۔ بالآخر ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا اور انور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر مسکرایا اور اشاروں اشاروں میں انور سے غالباً یہ پوچھنے لگا کہ کہاں سے آیا ہے۔ انور نے ہاتھ منہ کے قریب لے جا کر کہا:

'میں بھوکا ہوں'

نہ معلوم انور کے اس جملے پر عورتیں اور مرد کیوں کھلکھلا کر ہنس پڑے انور کو یوں

محسوس ہوا جیسے میں بھوکا ہوں کی بجائے اس نے 'میں اُلّو کا پٹھا ہوں' کہہ دیا ہو پھر ایک نوجوان اسے اپنے ساتھ جھونپڑی میں لے گیا اور اس کے سامنے اس قسم کا کھانا پیش کیا جس کے متعلق انور کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ کیا شے تھی۔ کھانے کے بعد عورتوں، بچوں اور بوڑھے مردوں نے اسے ایک بار پھر گھیر لیا اور اشاروں میں ان سے باتیں کر کے ہنسنے لگے۔ رات کو جھونپڑیوں کے سامنے الاؤ روشن کر دیا گیا اور عورتیں اور مرد اس کی روشنی میں بازو اور کولھے ہلا ہلا کر ایک دوسرے کی سنگت میں رقص کرنے لگے۔ ایک نوجوان لڑکی نے انور کو بھی میدان میں کھینچ لیا اور جسم کو لہراتے ہوئے اس کے گرد چکر لینے لگی پہلے تو انور بڑا گھبرایا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہر آدمی اس کی حالت پر قہقہہ لگا رہا ہے تو وہ ذرا سنبھل گیا پھر اس نے بھی اوروں کی دیکھا دیکھی ایک ہاتھ سے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا دوسرا ہاتھ ہوا کے دوش پر پھیلا دیا اور ساتھ مل کر رقص کرنے لگا۔ لڑکی کے نقش دوسری عورتوں کی طرح چپٹے آنکھیں چھوٹی اور قد چھوٹا تھا۔ جب تین چکر پورے کرنے کے بعد وہ اس کے جسم سے لگ کر دوسری طرف نکل جاتی تو انور کو ایکا ایکی ساتیں کا خیال آجاتا۔ اس لڑکی کا جسم ساتیں کے جسم کی مانند گداز اور گرم تھا اور وہاں سے ہلکی ہلکی شیریں مہک اٹھ رہی تھی۔ نصف گھنٹہ کے مسلسل رقص کے بعد جب وہ اور لڑکیوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا مہینوں کی درماندہ تھکن کینچلی بن کر اس کے جسم سے اتر گئی ہو وہ اپنے تئیں اسی طرح تازہ دم محسوس کرنے لگا جیسے وہ رنگون سے روانہ ہوتے وقت تھا۔

رات سونے سے پیشتر اس کی میزبان عورت لکڑی کے پیالے میں تھوڑا سا گرم دودھ لے کر اس کے پاس آئی جتنی دیر وہ دودھ پیتا رہا وہ اس قریب کھڑی مہربان نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ دودھ پی چکا تو اس عورت نے لکڑی کا خالی پیالہ تھام کر انور کے کھردرے خشک بالوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکراتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

دودھ کا ذائقہ نمکین تھا وہ پھیکا تھا اور اس میں سے تازہ گھاس کی بو آرہی تھی پہلے تو انور بڑا حیران ہوا کہ دودھ کہاں سے آگیا کیونکہ اسے وہاں کوئی گائے یا بھینس نظر نہ آئی تھی پھر یہ سوچ کر کہ شاید کسی قریبی بستی سے منگوایا گیا ہو وہ پہلو بدل کر سو گیا۔

صبح اسے ان زندہ دل اور مہمان نواز جنگلیوں سے رخصت ہونا تھا جب وہ نہا دھو کر سب سے ہاتھ ملا کر چلنے کے لئے روانہ ہونے لگا تو اسے پھر گرم دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا انور اسے بھی پی گیا۔ اور دل ہی دل میں ان لوگوں کی محبت و مہمان نوازی کی تعریف کرنے لگا دودھ کا پیالہ وہی رات والی موٹی سی جوان عورت لائی تھی لیکن پیش ایک بوڑھے آدمی نے کیا تھا۔ دودھ پی کر انور نے یونہی اشاروں میں پوچھا کہ جس بھینس کا دودھ دوہا گیا ہے وہ کہاں ہے؟ بوڑھے آدمی نے مسکراتے ہوئے پاس کھڑی اسی موٹی سی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ انور کے پاؤں تلے سے گویا زمین نکل گئی اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس عورت ـــــ اپنی دودھ ماں کی طرف دیکھا اور ان لوگوں سے مل کر جلدی سے جدا ہو گیا دور ـــــ ڈاک بنگلے کے قریب سے گزرتے ہوئے انور نے جیب سے اپنی ماں کی پھٹی ہوئی تصویر نکالی اور اسے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کے سامنے کھڑی ہے اور اس کی طرف محبت سے دیکھتی ہوئی کہہ رہی ہے۔

"تم مجھے ہر جگہ دیکھو گے میرے بیٹے"

۱۷

چٹاگانگ پہنچ کر انور ایک خیراتی ہسپتال میں چھ ماہ بیمار پڑا رہا۔

پہلے تین روز وہ بخار میں بالکل بے ہوش رہا اور واہی تباہی بکتا رہا۔ چوتھے روز بخار ہلکا ہوا تو انتڑیوں کے درد نے آلیا۔ خیراتی ہسپتال کے تمام کمرے، برآمدے اور چھتیں برما سے آئے ہوئے مریضوں سے بھری ہوئی تھیں یہ لوگ انور کی طرح سینکڑوں میل کا پرخطر سفر بھوکے پیاسے پیدل طے کر کے آئے تھے اور اب طرح طرح کی تکلیف دہ بیماریوں میں مبتلا رات بھر چیختے چلاتے رہا کرتے تھے۔ سوائے چند ایک بنگالی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ان کا وہاں کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ڈاکٹر اپنے وقت پر اصیل مرغوں کی مانند گردنیں اکڑاتے ہوئے کمروں اور برآمدوں کا چکر کاٹ کر چلے جاتے۔ نرسیں اگرچہ مریضوں سے ہنس ہنس کر محبت سے پیش آتیں تاہم ان کی جسمانی آسودگی اور نفاست پسندی انہیں بیماریوں سے قریب ہوتے ہوئے بھی ہزاروں میل دور رکھتی۔ بھنگی جھاڑو ہاتھ میں لئے، سول سرجنوں کی طرح چھاتی نکال کر چلتے اور کسی مریض کے بلانے پر بہرے بن جاتے جو لوگ انہیں بیڑیاں پینے کے لئے ایک آدھ روپیہ تھما دیتے ان کے آگے وہ

یوں مؤدب ہو جاتے گویا سول سرجن کے سامنے کھڑے ہوں۔ انور نے چٹاگانگ کے ایک پنجابی تاجر سے کچھ روپے قرض کے طور پر لئے تھے۔ چنانچہ وہ دوسرے تیسرے روز بھنگیوں کو خوش کر دیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کے لئے ہسپتال میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سارا دن وہ اپنے بستر پر کمبل گھٹنوں تک لئے لیٹا رہا اور خموشی سے نرسوں اور بھنگیوں کو اپنے اپنے کام میں مشغول دیکھتا رہا۔ اس کی دونوں جانب دو بوڑھے مریضوں کے پلنگ تھے جن میں سے ایک گجراتی اور دوسرا سندھی تھا۔ گجراتی بوڑھا اپنڈے سائٹس کے مرض میں مبتلا تھا۔ رات کے سمے جب درد پیدا ہوتا تو وہ بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتا اور نرس اسے تیز خواب آور گولیاں کھلانے لگتی۔ ایک ماہ سے اس کا اپریشن 'پرسوں' ہو رہا تھا اور وہ 'پرسوں' ابھی تک نہ آیا تھا۔ اور بوڑھے کی آنکھیں روز بروز اندر کو دھنستی جا رہی تھیں۔ وہ مانڈلے سے آیا تھا جہاں اس کا اپنا ہوٹل تھا۔

سندھی بوڑھے کو پائلز کا مرض تھا اور وہ دن بھر اوندھے منہ پلنگ پر لیٹا رہتا۔ ڈاکٹر ہر روز اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہہ جاتا۔

"گھبراؤ نہیں بوڑھے ـــــ تمہارا بھی اپریشن ہی ہوگا"

بوڑھا تکیئے پر منہ رکھے ڈاکٹر صاحب کو سلام کر کے ہنسنے لگتا۔ گویا کہہ رہا ہو۔

"ہوگا ضرور ہوگا ـــــ لیکن موت کے بعد ہوگا"

اگر کوئی مریض مر جاتا (اور ہر دوسرے روز ایک آدھ مریض ضرور مر جاتا تھا) تو اس کی اکڑی ہوئی لاش کو بھنگی سٹریچر پر ڈال کر باہر لے جاتے اور ہسپتال کے پچھواڑے الٹ کر جلا دیتے اور یا گڑھا کھود کر اس میں دفن کر دیتے۔ مریضوں کو جو دودھ ملتا اس میں سے کریم نکالی ہوئی ہوتی اور ناریل کا دودھ شامل ہوتا تھا۔ اس کے باوجود بھنگی اور دیگر خدمت گزار اپنا حصہ نکال کر الگ رکھ لیتے۔

چھ ماہ کا لمبا عرصہ گزارنے کے بعد انور کی صحت قدرے اچھی ہو گئی اور اسے ہسپتال سے خارج کر دیا گیا۔ باہر نکل کر اس نے ڈاڑھی بنوائی۔ حجامت کروائی نئی چپل

اور پتلون قمیض خریدی اور کلکتہ کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ ہوڑہ اسٹیشن پر اترتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی ماں کو تار کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع کر دی اس کے بعد وہ شہر کی سیر و تفریح کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ پنجاب میل کی روانگی میں ابھی تین گھنٹے پڑے تھے اور انور کا خیال تھا کہ اس دوران میں کلکتے کے بارونق بازاروں کا ایک چکر اس کی سنبھلی ہوئی صحت پر مزید خوشگوار اثر ڈالے گا۔ رنگون پر جاپانی فوجوں کے قبضہ کے باوجود کلکتہ شہر کی ہنگامہ پرور زندگی میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا منڈیوں میں اشیاء کی قیمتیں ضرور چڑھ گئی تھیں لیکن لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس کا کوئی نشان نہ تھا۔ سڑک کنارے ہوائی حملے سے محفوظ رکھنے والی خندقیں یہاں بھی کھدی ہوئی تھیں اور لیمپوں کے گرد لگے ہوئے سیاہ شیڈ اس بات کے شاہد تھے کہ شہر میں رات کو مکمل بلیک آؤٹ ہوتا ہے۔ ٹراموں اور بسوں میں حسب معمول رش تھا اور وسیع سڑکوں پر کاروں، موٹروں، جیپ گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کا تانتا لگ رہا تھا۔ غیر ملکی اور ملکی سپاہی پیدلوں پر آزادی سے چل پھر رہے تھے اور دکانوں میں خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ برسات کے موسم کا اخیر تھا اور آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھا رہا تھا۔ دکانوں کے بھیگے ہوئے سائبان، سڑک کنارے درختوں کے گیلے تنے رات کی بارش کا پتہ دے رہے تھے۔ جونا مارکیٹ سے انور نے سگریٹ خریدے اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر وکٹوریہ میموریل کی پرلی طرف کلکتے کے ان پُرسکون باغات میں نکل آیا۔ جہاں ناریل کی اونچی لمبی چھتریاں ہلکے نیلے پانیوں کی خاموش جھیلوں پر جھکی رہتی ہیں اس ماحول نے اس کے دل میں رنگون کی زندگی کی یاد تازہ کر دی اور اسے جھیلوں والے باغ اور ان کی پتلی دبلی بیچدار روشیں یاد آ گئیں۔

باغ میں کافی چہل پہل تھی۔ یہاں وہاں درختوں کے سایوں میں گھاس کے سرسبز تختوں کے درمیان خوش و خرم بچے کھیل رہے تھے اور عورتیں اور مرد پیدلوں پر ٹہل رہے تھے۔ جھیل کنارے بھی کچھ لوگ ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے ماحول اور موسم کا لطف اٹھا رہے تھے۔ انور بھی ایک طرف جا کر گھاس پر بیٹھ گیا اس نے سگریٹ

سلگا لیا اور کہنیاں گھاس پر ٹکا کر نیم دراز ہو گیا۔

سامنے جھیل کی نیلگوں سطح پر سکون تھی اور کنارے کنارے کہیں کہیں کنول کے پھول کھل رہے تھے۔ کچھ ادھ کھلے تھے اور ان کی نازک پلکیں نیم وا تھیں۔ کلیوں کے منہ بند تھے اور رنگ و خوشبو اپنے سینے میں چھپائے وقت کے انتظار میں چوڑے چوڑے پتوں کے درمیان چپ چاپ کھڑی تھیں گھنے درختوں کی لمبی ٹہنیاں جھیل کے آئینے میں جھک کر اپنا عکس دیکھ رہی تھیں۔

انور کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ان سہانے دنوں کے چمکیلے سائے کانپ رہے تھے جو برما کے سنہری افق پر پھر کبھی طلوع نہ ہونے کے لئے غروب ہو گئے تھے اور جنہیں اب پھر کبھی لوٹ کر نہ آنا تھا وہ اپنے آپ کو کسی ایسے پہاڑ کی چوٹی پر محسوس کر رہا تھا۔ جہاں سے نیچے جھک کر وہ اُن بل کھاتی پیچدار سڑک کو دیکھ رہا ہو۔ جس پر سے گزر کر وہ ان بلندیوں تک پہنچا ہو دور ـــــ بہت نیچے ایک تنہا مسافر منزلوں پر منزلیں طے کرتا اوپر چڑھا آ رہا تھا۔ پہلی منزل پر اس کا ساتھ ایک ایسی لڑکی سے ہو گیا جس کے سنہری بال لمبے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں میں پُراسرار چمک تھی۔ کچھ دور ساتھ چل کر وہ اس سے جدا ہو گئی اور راہ میں ہی رک گئی دوسری منزل پر مسافر کو ایک دبلی پتلی سوگوار چہرے والی معصوم لڑکی نے کنول کے پھول پیش کئے اور اس کی طرف دیکھ کر شرما گئی اور سڑک چھوڑ کر نیچے وادیوں میں کہیں غائب ہو گئی تیسرے پڑاؤ پر جو لڑکی اس کے سفر میں شریک ہوئی اس کا رنگ زرد اور بال سنہری تھے اور مسافر کے دل میں پہلی لڑکی کی یاد تازہ کرتے تھے۔ کچھ دور ساتھ نبھانے کے بعد معاً وہ لڑکی ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑائی اور پیشتر اس کے کہ مسافر اسے سنبھالے چکراتی ہوئی نیچے گہری کھڈ میں لڑھک گئی۔ اور ایک کرب انگیز مسلسل چیخ کے سوا پھر اور کچھ سنائی نہ دیا۔ غمزدہ مسافر کئی منزلوں تک تنہا ہی سفر کرتا رہا۔ آخری منزل کے نزدیک دو چمکیلی اور مہربان نگاہوں نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا اور شرما کر پلکیں جھکا لیں۔ پھر ان آنکھوں نے دریا میں ڈوبا ہوا کوئی گیت سنایا۔ مسافر کی

آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے سر جھکا لیا۔ اور جب دوبارہ آنکھیں اٹھائیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ اور سڑک دور تک ویران چلی گئی تھی۔ مسافر اکیلا ہی پہاڑیوں کے چکر کاٹتا رہا اور اس کے پاؤں سوج گئے اور جوتے پھٹ گئے اور تلوؤں سے خون جاری ہو گیا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اور بند بند دُکھ رہا تھا وہ ایک جگہ سانس لینے کے لئے رکا تو جھاڑیوں میں سے وہی سوگوار چہرے والی لڑکی نمودار ہوئی جس نے راہ میں ایک جگہ اسے کنول کے پھول پیش کئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پھر ایک دھماکہ سا ہوا اور وادیوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور دھند کے بادل چھا گئے۔ جب دھند صاف ہوئی تو مسافر نے دیکھا زمین پر اس لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ اس نے نمناک ہاتھوں اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لاش کو ایک گڑھے میں لٹایا اور اس پر پتھر چننے شروع کر دیئے آخری پتھر رکھنے سے پہلے اس نے اپنی مہربان ساتھی کی مردہ پیشانی پر بوسہ دیا اور غم سے لبریز دل لیئے پہاڑ کی چڑھائی طے کرنے لگا۔

اس کے بعد پہاڑیوں کے دامن بادلوں سے ڈھک گئے اور منظر دھندلا گیا۔ اور انور نے پھر اس مسافر کو نہ دیکھا اس نے گہرا سانس بھر کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور دھواں اڑاتے ہوئے ایک بار پھر اپنے خیالات کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اچانک ربڑ کا چھوٹا سا گیند کہیں سے اچھل کر اس کی جھولی میں آن گرا۔ اس نے گیند اٹھانے کے لئے ابھی ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک آیا چھوٹی سی پیاری بچی کو گود میں اٹھائے قریب آئی اور بولی۔

یہ لڑکی بڑی شریر ہے بابو صاحب، یہ گیند اسی کا ہے۔

انور نے گھنگھریالے سیاہ بالوں والی بچی کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ بچی کے بالوں میں سرخ فیتہ بندھا تھا۔ اور اس کی کالی کالی معصوم آنکھوں میں زندگی کی چمکیلی صبح مسکرا رہی تھی۔ انور نے گیند اس کی طرف بڑھایا بچی خاموش نگاہوں سے آیا کی طرف دیکھنے لگی۔

'لے لو بے بی'

لیکن بے بی ایک اجنبی سے گیند پکڑتے ہوئے شرما رہی تھی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے ننھا منا ہاتھ آگے بڑھایا اور انور نے گیند پکڑا دیا۔

'بڑی پیاری بچی ہے کیا نام ہے اس کا؟'

مگر قبل اس کے کہ آیا اس بچی کا نام بتلائے انور کے عقب سے کسی عورت نے اسے پکارا۔ آیا نے جلدی سے جواب دیا۔

آئی بی بی جی اور وہاں سے چلی گئی۔

انور کو وہ آواز کچھ مانوس معلوم ہوئی اس نے یونہی گردن گھما کر اپنے پیچھے دیکھا اور اس کی نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں۔ ناریل اور پوکلپٹس کے درختوں میں سے گزرنے والی قریبی روش پر کملا اور مسٹر جے چندر ماتھر چلے جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے آیا بچی کو چھوٹی سی گاڑی میں ڈالے چلی آ رہی تھی کملا ہلکے قرمزی رنگ کی بلین ساڑھی میں ملبوس تھی۔ اور اس کا جسم پہلے سے قدرے بھاری ہو گیا تھا۔ مسٹر جے چندر حسبِ عادت تنگ سوٹ میں پھنسے ہوئے تھے اور سر پر فلیٹ رکھے، چاندی کی موٹھ والی چھڑی لئے کملا کے پہلو میں قدم قدم چل رہے تھے۔ انور نے منہ دوسری طرف کر لیا اور گردن جھکا لی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ مسٹر جے چندر اور مسز جے چندر کافی دور نکل گئے ہیں تو وہ اٹھا اور اسی روش پر دوسری جانب ہو لیا وہ اپنا آپ کملا کو نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ اب اسے اپنا آپ دکھائے بھی کیا؟ اس کے پاس کچھ دکھانے کو بچا ہی کیا تھا؟ پتلون میں ہاتھ ڈالنے سے اس کا بایاں ہاتھ جیب کے اندر ساتبیں کی سیاہ چادر سے پھاڑے ہوئے ٹکڑے سے چھو گیا۔ انور نے اسے اپنی پر محبت گرم مٹھی میں یوں دبا لیا جیسے وہ ساتبیں کا نازک ہاتھ ہو۔

لیکن ساتبیں خود کہاں تھی؟

انور نے دیکھا کہ ساتبیں ایراوتی کنارے پتھروں کے نیچے سو رہی ہے۔ پتھروں میں جنگلی گھاس اُگ آئی ہے اور اوپر ناریل کے جھنڈ اپنی چھتریوں کا سایہ

کئے ہوئے ہیں۔ ہوا سرھانے والے بانس کے درختوں میں سرگوشیاں کر رہی ہے اور ایراوتی کی چھپلکی لہریں دور سے آتی ہیں اور قبر کے پتھروں کا منہ چوم کر واپس چلی جاتی ہیں گویا وہ اس بدنصیب پھول بیچنے والی سے محبت کی پژمردہ سرگوشیوں میں کہہ رہی ہوں۔

تم چپ کیوں ہو؟ اداس کیوں ہو؟

تم اٹھو گی نہیں؟

ہماری باتیں سنو گی نہیں؟

ہم ہیں ایراوتی کی لہریں!